

خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ

۱۰۶

ایڈیٹر
حبیب الرحمن چغتائی

خدا بخش اوٹریٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

۳۳۳۳۳/۷۷	قیمت :	۳۳۳۳۳/۷۷
۳۳۳۳۳/۷۷	مکالتہ :	۳۳۳۳۳/۷۷
۳۳۳۳۳/۷۷	شمارہ :	۳۳۳۳۳/۷۷
۳۳۳۳۳/۷۷	ایک سال میں چار شمارے	۳۳۳۳۳/۷۷

۱۹۹۶ء

مصطفیٰ کمال ہاشمی نے سنو شی پرٹرس شاؤنگ پلٹہ ۶۰ میں چھوڑا کر خدا بخش اور ٹیک پبلک لائبریری پلٹہ سے

فہرست

صیب الرحمن چغتائی

حرف آغاز

ہندستانی مذاہب

انیسویں صدی کی زبردست یادگار سوامی تلک چندر

اوران کا جلسہ مذاہب — احوال و آثار عامہ جمالی

۱

اردو دانشوری

قوی تہذیب کی تعمیر کے سلسلے میں ڈاکٹر عابد حسین

کی دانشوری

ڈاکٹر ایم کمال الدین

۱۹

اردو، ہندی، ہندستانی

سجاد ظہیر اور اردو، ہندی، ہندستانی

ڈاکٹر عبدالقیوم ابدالی

۲۵

اردو شاعری

ایہام گوئی

ڈاکٹر منظر اعظمی

۳۱

کمال حامدی حیات و انتخاب کلام

عبدالمجید خاں کمال حامدی

۳۱

نسیم امروہوی اوران کی مرثیہ گوئی

سید محمود حسن قیصر امروہوی

۵۸

غالبیات

ابیم شجہرودی — شاگرد غالب

ڈاکٹر محمد رضوان احمد خان

۸۰

اقبالیات

مسئلہ ارتقاء سے متعلق اقبال اور آزادی تحقیق

ڈاکٹر سمیع الحق

۹۳

مشاہدات اقبال

ڈاکٹر منصور عالم

۱۰۹

اردو ناول

پہلی خاتون ناول نگار — رشیدۃ النساء

ادیب سہیل

۱۲۳

تین

اردو صحافت

- ۱۳۰ خواجہ احمد عباس۔ ایک ڈاکٹر صحافی
۱۵۲ صحافت نسواں۔ انیسویں صدی کے چند گذشتہ ادراک ڈاکٹر عزیز محمد

طب

- ۱۶۸ تاریخ طب کے مسائل و اصول تحقیق
تاریخ حیدر آباد (دکن)
۱۸۵ پھاگتی کا تاریخی وجود
مخطوطہ شناسی
۱۹۷ منتخب التذکرہ۔ ایک جائزہ
۲۰۱ مثنوی قصہ سودا ماں
اسلامی کتب خانے
۲۰۹ اسلامیہ کالج پشاور کا کتب خانہ
فہرست مخطوطات
۲۱۸ موصولہ از کتب خانہ بلو نا
فہرست مخطوطات
تبصرے
۲۳۵ شاہان اودھ کے کتب خانے
۲۳۷ تذکرہ بزم شمال۔ ایک جائزہ
۲۳۳ نیزنگ خیال کا رامن نمبر
ڈاکٹر دہاج الدین علوی
ڈاکٹر ایم کمال الدین
ابو سعادت جلیلی

انگریزی حصہ

فارسی ادب

- ترکی کے ترک باشندوں کی مذہبی سماجی
ادراہی زندگی پر رومی فکر کا اثر
ڈاکٹر ایرکن ترکمان

- جدید اردو ادب میں خیالات کا تصادم سید سبط حسن ۱۲
مخطوطہ شناسی
- ہندوستانی ذخروں میں تاریخی اور فنی اہمیت کے حامل تیموری مخطوطات پرو فیسر نذیر احمد ۳۶
تاریخ بہار
- بہار میں کپنی کے ابتدائی محصولاتی انتظامات ۱۷۸۲-۱۷۶۵ء پر ماحول ہندوستانی تبصرہ خلیفہ الدین ملک ۷۷
سکھ مت
- گرو تیغ بہادر کی شہادت ڈاکٹر وید پرکاش ۹۶

حرف آغاز

یہ ایک خوش آمدن خبر ہے کہ حکومت نے اردو یونیورسٹی کی منظوری دیدی ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا عنقریب حیدرآباد میں قیام عمل میں آنے والا ہے۔ ہندستان میں کم و بیش چالیس یونیورسٹیاں ایسی ہوں گی جہاں اردو زبان و ادب کی تعلیم ہوتی ہے۔ مگر اس مجوزہ یونیورسٹی میں دیگر معنائیں بھی اردو زبان میں برصاے جائیں گے۔ یہ بات کوئی زیادہ پرانی نہیں جب جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا اور اردو زبان میں کتابوں کی فراہمی کے لیے دارالترجمہ قائم ہوا تھا۔ اس ادارے نے سائنسی موضوعات پر اہم کتابوں کو اردو کا لباس دیا۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ نہ چل سکا۔ اس کے اسباب کیا تھے اس سے بحث نہیں۔ اس کا انجام ہمارے سامنے ہے۔ انداز فکر ہمارا قومی ہے نہ بالوہی ہماری فطرت۔ حالات کا صحیح تناظر میں جائزہ لینا ضروری ہے۔ فروغ انسانی وسائل کے وزیر نے فرمایا کہ یہ مجوزہ یونیورسٹی اردو کو ایک بنیاد فراہم کرے گی۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ ان کی آرزو ہے کہ اردو کی جڑیں گہری ہوں اور اسے ابھرنے کا پورا موقع ملے۔ ہم سب بھی چاہتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ وزیر موصوف اردو کو مضبوط بنیاد فراہم کرنے میں اور اس کی توسیع و ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ صرف حکومتوں کے بل بوتے پر کہیں زبان پنپ سکی ہے۔ اس کی جڑیں تو عوام کے دلوں میں ہوتی ہیں۔ زبان کی آبیاری عوام کرتے ہیں۔ حکومت کی دستگیری سے اسے بڑا سہارا ملتا ہے۔ اردو محض ایک زبان ہی نہیں وہ ہماری تہذیب و ثقافت کا سرچشمہ ہے۔ اس کے تحفظ کے لیے ہمیں بھی اپنی ذمہ داری نبھانا ہوگی۔ حرف حکومت پر نکیہ کر کے

لاطلق نہیں ہو جاتا ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ بعض دانشور اس کے خوبصورت چہرے ہی کو مسخ کرنے پر تے ہوئے ہیں۔ وہ اس کے رسم خط کو بدلنے کے درپے ہیں۔ زبان اور رسم خط کا تعلق روح و جسم کا تعلق ہے۔ روح اگر تئ سے جدا ہو جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔

زبان افکار و آرا کے اظہار کا ذریعہ ہوتی ہے۔ مشکل کو اگر زبان پر عبور ہے مگر مخاطب اس سے نااہل ہے تو ترسیل خیال ممکن نہیں یہی سب سے بڑا مسئلہ ہمارے سامنے ہے۔ اردو سمجھنے، لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد میں کمی آرہی ہے۔ اردو گھرانوں ہی کو لے لیجیے، ان کے بچے اردو سے ناواقف ہیں۔ دہلی شروع ہی سے ان کو انگریزی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہندی ہماری قومی زبان ہے، اس لیے اس کو پڑھنا بھی ضروری ہے۔ اردو دیکھنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ نصاب اس کی اجازت نہیں دیتا۔ سرسائی فاروقی لا قابل عمل نہیں۔ ماہرین تعلیم کا یہ قول اپنی جگہ مسلم ہے کہ مادری زبان میں تعلیم بہتر طریقے سے ہوتی ہے۔ یہ ایک طرفہ تماشہ ہے کہ اس کے حامی اپنے بچوں کو پڑھاتے تو ہیں انگریزی اسکولوں میں مگر بات ہمیشہ اس کے حق میں کرتے ہیں۔ ہم انگریزی کے مخالف نہیں بلکہ کسی بھی زبان کے مخالف نہیں۔ ہاں اردو زبان کے طرفدار ہیں۔ جو لوگ اردو رسم خط کو بدلنے کے حق میں ہیں ان کے موقف میں وزن ہے۔ وہ یہ بات اس لیے کہتے ہیں کہ اردو اخطاط پندیر ہے اور اس کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ دیوناگری رسم خط کو اختیار کر لیا جائے تاکہ اسکے قارئین کی تعداد میں اضافہ ہو جائے۔ یہ خیال گرچہ اچھا ہے مگر طریقہ منقہ ہے۔ ان سے ہمارے اختلاف کبھی سبب ہے۔ ہم اس پر غور کریں کہ اردو اپنے رسم خط کے ساتھ کس طرح پھلے پھولے اور پھیلے؟ یہ کام ناممکن نہیں مشکل ضرور ہے۔ اب جبکہ حکومت پشت پناہی کر رہی ہے ہمیں بھی ہرچیز پر فروغ اردو کے لیے اپنی سامی کو تیز کر دینا چاہیے۔

علم و ادب کے علاوہ حصول تعلیم کا ایک اہم مقصد کسب معاش بھی ہے۔ اردو زبان کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ وہ روزی کے مسئلے کو بھی حل کر سکے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ صرف مشاعر و نثر تک محدود ہو کر رہ جائے۔ مجوزہ یونیورسٹی کا قیام اسی سمت میں ایک قابل قدر کوشش ہے۔ اس کی توسیع کے لیے ضروری ہے کہ ہماری روزمرہ کی زندگی میں اردو کا ملن عام ہو۔ لیکن اس کے برعکس دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ خالص اردو زبان و ادب سے متعلق تقریبوں کے دعوت نامے بھی انگریزی زبان میں ہوتے ہیں اور جواز دی اردو سے ناواقفیت کا ہوتا ہے۔ ہمیں اس انداز فکر کو بدلتا ہوں گا۔ ہر وہ طریقہ اختیار کرنا ہو گا جس سے اردو زبان کو قبول عام حاصل ہو۔

یہ سائنسی دعوہ ہے۔ نئی ایجادات سلسلے آ رہی ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے پر اثر پڑ رہا ہے۔ کتابوں کی دنیا بھی متاثر ہو رہی ہے۔ کتابیں اپنی روایتی شکل بدل رہی ہیں اور اب وہ آڈیو، ویڈیو کیسٹس، مائیکرو فلمز اور سی ڈیز پر محفوظ کی جا رہی ہیں۔ بعض اخبار اور میگزین انٹرنٹ پر بھی دستیاب ہیں۔ کمپیوٹر نے انسانی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ کتابوں کی طباعت کے جدید طریقے وجود میں آ گئے ہیں مگر ان کو اختیار کرنا اردو کے لیے اتنا آسان نہیں۔ ناشرین خوب سے خوب تر کی خواہش تو رکھتے ہیں مگر مجبور ہیں۔ معصوف اچھی طباعت میں خارج ہیں۔ اردو کتابوں کی مانگ کم ہے۔ اس لیے چھپتی کم ہیں۔ صرف زیادہ آتا ہے اس لیے قیمت زیادہ ہوتی ہے اور جب قیمت زیادہ ہوتی ہے تو فروخت خود بخود کم ہو جاتی ہے۔ گویا یہ ایک ایسا دائرہ ہے جس سے نکلنا مشکل ہے۔

خدا بخش لائبریری ایک ناشر بھی ہے اور ان وقتوں کے باوجود ہماری کوشش یہی ہے کہ طباعت بہتر ہو۔ نوری نستعلیق سو فٹ ویر خرید لیا ہے۔ دیگر طباعتی آلات کے حصول کی فکر ہے۔ اگر اردو کے شیدائی و فدائی کمر بستہ ہو جائیں تو وہ دن دور نہیں کہ اردو اپنا جائز مقام حاصل کرے۔

— حبیب الرحمن چغتائی

انیسویں صدی کی زبردست یادگار سوامی شگن چندر اور انکا جلسہ مذاہب احوال و آثار

پہلے زمانہ میں مختلف مذاہب کے لوگ دوستانہ ماحول میں بات چیت کیا کرتے تھے۔ وہ باتیں اور مسائل جو عام لوگوں کی سمجھ و بوجھ سے بلند ہوتی تھیں ایسی ہی مجالس اور جلسوں میں حل ہو جایا کرتی تھیں۔ مہاراجہ بکراجیت کے زمانہ میں نورتن لکھے گئے۔ اسی طرح مہاجرات میں لوگ اپنی زبانوں میں بولتے تھے۔ یہ روایت قدیم سے چلی آرہی تھی۔ انیسویں صدی کے آخر میں امریکہ کے شہر شکاگو میں ایسا ہی ایک جلسہ ہوا جو اگرچہ نہایت امن اور شائستگی کے ساتھ ہوا مگر اس کے انتظام میں بھی پولیس انسپکٹروں کا شور و شبہ شال تھا اور جلسہ کی تعداد پانچ ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ مگر جو جلسہ ۲۱ دسمبر ۱۸۹۶ء تا ۲۹ دسمبر ۱۸۹۶ء اسلامیہ بانی اسکول اندرون شیرانوالہ دروازہ لاہور میں منعقد ہوا وہ نہ صرف اپنی عددی تعداد (یعنی آٹھ ہزار سیکن پرشکل تھا) میں شکاگو کے جلسہ پر فوقیت رکھتا تھا بلکہ علاوہ اور پہلوؤں کے یہ جلسہ قرآن مجید، وید، گرنہز اور توریت کے کمال حاملین پرشکل تھا اور ان حالات میں ایسا جلسہ صرف ہندستان کی سرزمین میں ہی ہو سکتا تھا۔ جہاں اس وقت دنیا کے کل مذاہب موجود تھے۔ اس لحاظ سے اگر اسے انیسویں صدی کی زبردست مذہبی یادگار کے نام سے موسوم کیا جائے تو یہ اس کے شایان شان ہے۔

اس جلسہ کے بانی سوامی شگن چندر مذاہب تھے، جو ہندوؤں کی کائنات سے تھے۔

جلسہ زبردست جلسہ مذاہب میں آپ کا نام اسی طرح رقم ہے اگرچہ بانی اکثر مقامات پر جہاں اس جلسہ کا ذکر ہے۔ موصوف کا نام شگن چندر لکھا ہے۔ جلسہ سرشمن کی رو سے انھیں ایک "دریائی ذات" قرار دیا گیا ہے۔ لیکن کتبوں میں یہ اکثر کمری ظاہر کیے گئے ہیں۔ ان کا پیشہ بدھوں سے تعلق رکھتا ہے۔ چلا آ رہا ہے۔

یہ قدرت کی وجہ سے ظہور ہے یا کوئی اور اساتفل مدد کا وجود وہ شخص ایک بہت بڑے جملے کا محرک بنا اور بہت سارے لوگوں سے وابستہ ہو گیا اس کے ذاتی حالات مناسب تفصیل کے ساتھ شاید کہیں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ چند یادداشتوں میں معمولی اشکالات ملے ہیں جو کسی صورت میں مکمل کے ذیل میں انہیں لکھے جاسکتے۔

سوامی ششک چندر کا وطن اور تاریخ پیدائش کہیں بھی موجود نہیں پائی گئی۔ البتہ جلد مذہب کی اختتامی تعداد پر سے ان کی بھی ایک تقریر تھی جس میں آپ نے بتایا کہ وہ کچھ عرصے کے لیے غیر ہو گئے اور گجرات کے علاقہ کنجاہ کے مقام پر ایک مہلت تھے۔ ان سے آپ کا تعلق ہو گیا تھا۔ اب اس بیان سے یہ خبر مفقود ہے کہ آیا گجرات ہی ان کا وطن تھا یا کوئی اور جگہ؟ اور وہ علاقہ کنجاہ کے مہانتا کون تھے اور ان کا نام و مسلک کیا تھا؟ سیرکین اگر آپ کا وطن اس نسبت سے گجرات (پاکستان) کنجاہ کو بھی تسلیم کر لیا جائے تو بظاہر اس میں کوئی تباہت محسوس نہیں ہوتی۔ سوامی صاحب کے حالات سے اگر کوئی شخص پوری شرح و بسط سے پردہ اٹھا سکتا تھا تو وہ جناب سابق پرنسپل چند صاحب تھے جو مذکورہ جلد میں قادیان سے جاکر تال ہوئے تھے۔ وہ بھی اپنے ایک مضمون مطبوعہ ۲۰ جولائی ۱۹۲۶ء میں لکھتے ہیں کہ "جلد کی تمام تر کاروائی کے دوران میں اور پھر رپورٹ کی اشاعت تک تو سوامی جی ملنے ملائے اور آتے جلتے بہتے پھر نہ معلوم وہ کیا ہوئے اور کہاں چلے گئے۔ گویا خدائی قدرت کا ہاتھ انہیں اس خدمت کی غرض سے قادیان لایا تھا اور پھر پہلے کی طرح غائب کر دیا۔"

بہر حال سوامی ششک چند کے ایک ہم نشین اور محبت یافتہ حضرت منشی جلال الدین صاحب جو جناب حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے اس جلد میں پڑھے گئے مضمون کے کاپی نویس بھی تھے، کا بیان ہے کہ سوامی ششک چند رسالہ فوجی میں جیڈ کرک تھے کہ ان کے خیال و اطفال فوت ہو گئے۔ اس لیے نوکری چھوڑ کر فقیر بن گئے۔ اس بیان سے اس امر کا تو پتا چلتا ہے کہ آپ ایک پڑھے لکھے آدمی تھے جو کہ رسالہ فوجی میں جیڈ کرک تھے مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان کی بیوی یا بچوں پر کیا وایا آنت وارد

لے ہریش چندر ولد بہتہ گوداد ۲۱ جولائی ۱۸۷۹ء پیدائش یکم جنوری ۱۸۷۹ء بمقام کجروڑ و تھان تحصیل شکر گڑھ اور وفات ۵ جنوری ۱۹۶۱ء بمقام سریناں تالہ سوال مدون قادیان (انڈیا) آپ کا سوامی نام حضرت بھائی عبد الرحمن قادیانی تھا۔

ہوئی کہ وہ فوت ہو گئے نیز یہ کہ وہ رسالہ فوجی کہاں تھا۔ لیکن ایک دستہ کھلا ہے کہ حضرت منشی جلال الدین صاحب کے حالات سے رسالہ فوجی کا تعین کیا جاسکتا ہے مگر باقی احمد پھر بھی پردہ راز میں رہیں گے۔

سوامی صاحب کے حالات مشمولہ جلسہ مذاہب رپورٹ میں اس بیان کی جزوی تائید کی جملک پائی جاتی ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ لڑکپن سے میری زندگی عجیب ہو رہی ہے، عمومی عمر سے ہی مجھے مذہب کا خیال تھا مجھے ملازمت بھی ایسی مل گئی جس میں اکثر مجھے دورہ پر رہنا پڑتا تھا۔ اور اس طرح میں اکثر مذاہب کے لوگوں سے ملتا رہتا تھا۔ میرا تمام تجربہ یہی ہے اور میں نے بھی سمجھا کہ اگر ہمارے ملک کو کسی کی ضرورت ہے تو باعمل لوگوں کی ضرورت ہے۔ یہ بات جب مجھے سمجھ میں آگئی تو میں کچھ عرصہ کے لیے فقیر ہو گیا۔ گجرات کے علاقہ میں کبناہ مقام میں ایک مہاتما تھے اور میرا ان سے تعلق ہو گیا۔ میں جہاں کہیں ہوں مجھے وہ خواب کے ذریعے سے ہدایت کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے ایسے ہی حکم سے میں تین چار سال تک کاسٹھ شول بیفارم میں لگا رہا۔

مزید لکھتے ہیں کہ انسان کو تمام قسم کے فرائض ادا کرنے چاہئیں۔ میں اپنے بزرگوں کی زیادہ خدمت نہیں کر سکا۔ اس سے عیاں ہے کہ آپ اپنے گیان دھیان میں لگے رہے اور اپنے بزرگوں، والدین وغیرہ کی خدمت نہ کر سکے۔ اور فقیر ہونے سے دونوں مطلب لیے جاسکتے ہیں کہ وہ مسلمان فقیر ہو گئے یا ہندو فقیر بن گئے۔ یہ امر تو ان مہاتما کے نام کے معلوم ہونے سے ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ بہر کیف گمان غالب یہ ہے کہ آپ ہندو فقیر بن گئے۔

سوامی شگن چندر صاحب کو اچانک ۱۸۹۲ء میں خیال ہوا کہ جب تک سارے لوگ اکٹھے نہ ہوں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے آپ نے ۱۸۹۵ء میں امیر میں ایک دھرم ہوسو جلسہ مذاہب کیا۔ پھر لاہور میں آکر ان ہی نعوش پر کام شروع کیا اور ۱۸۹۶ء کو جلسہ مذاہب بمقام لاہور منعقد کیا۔

مذکورہ جلسہ کے متعلق سوامی شگن چندر نے لکھا ہے کہ مجھے میٹنگ کمیٹی کے بعض ممبروں کا خاص شکریہ ادا کرنا چاہیے جنھوں نے مجھے ہر طرح مدد دی۔

اس بیان کی تائید ساجی ہریش چندر صاحب کے مضمون سے بھی ہوتی ہے۔ یوسف رقمطراز ہیں کہ:

تھے جنہوں نے انگریزوں کی دھمکیوں کی ابتداء ۱۸۹۷ء میں بطبع مدنی لاہور سے ۱۲۲۵
 کی تعداد میں خواجہ غلام محمد الدین صاحب تاج پشیمین دھمکیوں کی فرمائش پر رپورٹ جلد نمائش (دھم
 دھمکیوں کی) اگرچہ شروع ہی سے سوامی سنگھ چند صاحب کے "اشتہار واجب الاظہار" مؤلفہ...
 میں اس امر کا اظہار موجود تھا کہ یہ سب تقریریں ایک مجموعہ میں چھپ کر پبلک کے فائدے کے
 لیے اردو انگریزی میں شائع کرنی چاہئیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ جبر مذکور نے سوامی جی کے بذریعے
 متاثر ہو کر اس کی اشاعت میں کوئی خاص مدد دی ہوگی۔ جن کے باعث جبر صاحب کا نام بطور فرمائش نام
 رپورٹ جلد نمائش کے نمائش پر مذکور ہے۔ کتاب رپورٹ کا اردو ایڈیشن (ہمارا) رقم ہمارے
 پیش نظر ہے مگر سوامی جی کے اعلان کے برخلاف رپورٹ کا انگریزی ایڈیشن آج تک ہماری نظروں
 سے نہیں گزرا۔ البتہ جناب حضرت مرزا غلام احمد صاحب تادیانی کی تقریر جو آپ کی فائدگی میں جلد نمائش
 میں پڑھی گئی، اے کے کئی ایڈیشن نہ صرف انگریزی بلکہ دنیا کی کم و بیش میں پچیس زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں۔
 سلاطین ہریش چند جی اپنے مذکورہ بالا مضمون میں بیان کرتے ہیں کہ رپورٹ جلد نمائش
 نمائش شائع ہوئی۔ اور منظر کمیٹی جس کے اراکین ہر مذہب و ملت کے ممبرانہ اپنے طبقے کے ذمہ دار
 لوگ تھے، ان کی طرف سے اس کے خراج و صرف سے شائع ہوئی۔ یہ درست معلوم ہوتا ہے کہ خراج و
 صرف کا مقصد حصہ اراکین کمیٹی کا جو محکمہ رپورٹ کی ابتدا اور آخر میں دیئے گئے اشتہارات
 اس امر کی غرض کرتے ہیں کہ اس کی اشاعت میں حتمیے والوں میں چند اشاعتی مراکز اور اخبارات
 و رسائل کا بھی حصہ تھا کیونکہ ان کے اشتہارات بھی اس رپورٹ کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ ان اشاعت
 انواع اشتہارات ہی سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ جلد ہر مذہب و ملت میں کس قدر مقبول ہو چکا
 تھا اور اس معانی سے تحریری اظہار پانے کی کس قدر بے قراری تھی۔ ترتیب دار اشتہارات کی
 تفصیل یوں ہے :

سنان دھم گزٹ (سنان دھم دھم) کا ماہوار رسالہ، اخبار پنجاب ساچار لاہور جو ہندو
 ہی کا لاہور ہی سے نکلنے والا ہفتہ وار اخبار تھا۔ کمال الدین بی۔ نے پروفیسر سلاویہ کالج لاہور کی
 طرف سے ایک ہالک تجویز متعلقہ بطبع ثانی براہین احمدیہ و دیگر کتب جس میں حضرت مرزا غلام احمد تادیانی
 صاحب کو محمد اللہ المسیح المولود والہدی المسعود لکھا ہے۔ ویسٹرن سوپ کچن کشمیری بازار لاہور کی

طرف سے پاک و سات ماہوں - تحفہ لاہور کا اشتہار ہے، فقیر محمد صاحب جو سراج الاخبار، جامع شہر کی طرف ایک کتب خانہ الانفا و اولیٰ فی ترویج القرآن فی الانجیل کا اشتہار ہے، اسی طرح غلام محی الدین اینڈ کمپنی سوہاگرا و ٹیکیداران نوبی لدھیانہ کی طرف سے ایک لمبا چڑا اشتہار ان کی مہنعات بمع قیمت مہنوعات درج ہے اللہ اشتہار کے آخر میں درج ہے کہ غلام محی الدین پرنسپل کشر لدھیانہ لیٹ ۸۸ بنکال مطبع رضوی دہلی کی طرف سے ان کتابوں کے بارے میں اشتہار ہے۔ نصاب المعارف ترجمہ معراج المؤمنین، حضرت امام اعظم کے بارے میں کتب حیات اعظم، محمود رسالہ متبرکہ، رحمانی فوائد اسلام ربانی محکمہ سیر الاولیاء سیر المعارفین، محمد فخر گوپالاری کی کتاب بحر الحیات، حضرت نظام الدین اولیاء کی امن الشواہد، حضرت اویس قرنی کی بابت لطائف فیسیہ در فضائل اولیسیہ ہے۔ اس کے بعد ہفتہ کا اخبار عدلے ہند لاہور کا اشتہار ہے جو دین محمد ملک اخبار عدلے ہند کی طرف سے ہے۔ کئی چند کہیں دروازہ شاہ ماسی و محمد عدال لاہور کی طرف سے اخبار ہمدرد ہند لاہور کا اشتہار ہے۔ پھر خاندان بہادر لاہور کی کتابوں، آخری پیشوا، فخر نامہ، تواریخ گورو خاندان کا اشتہار فیروز خانہ بہادر انارکلی لاہور کی طرف سے ہے۔ فیروز الدین مالک اخبار شیر ہند و ہتھم تبارقی انجمن لاہور کی طرف سے اپنے تجارتی مال کا اشتہار ہے۔ بعد ازاں فہرست کتب حضرت اقدس مرزا غلام احمد صاحب درج ہے جو قادیان سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ مثلاً کتب متعلقہ حیاتیات، نورا القرآن، سراج الدین حیاتی کے چار سوالوں کا جواب، تحفہ یقینہ، افکار الاسلام، فیضان الحق، نور الحق، جنگ مقدس، آریہ مذہب کے متعلق، سرچشمہ، آریہ دھرم، شیعہ مذہب کے متعلق، سراج الخلافہ، حجۃ اللہ اور اپنے دینی حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کے دعویٰ کے متعلق ازالہ اوہام، فتح الاسلام، توفیق المرام، حماتہ البشری، نور الحق، تحفہ بغداد، رسائل اربعہ۔ نشان لیکھرام کے متعلق، سراج میرا استفادہ اسلام براہین احمدیہ، کمالات العادقین، تفسیر سورہ فاتحہ برہان دین، کمالات اسلام ملکہ مغفلہ کی خدمت میں تحفہ یقینہ اس ڈیڑھ کالمی اشتہار کے بعد سید محمد عبدالقادر مالک ڈیڑھ اخبار نمبر کن مداس کا اشتہار ہے۔ پھر اخبار چودھویں صدی، راوی پٹی کا اشتہار منشی سراج الدین احمد ڈیڑھ اخبار ہند کی طرف سے ہے۔ آخر میں مطبع صدیقی محلہ ساہیوان لاہور کے فیروز محمد وید کی طرف سے مکتبہ مذکور کا اشتہار ہے۔ آخری صفحہ پر غلام محی الدین تاجر شمیم محلہ چل بیلیاں لاہور کا اشتہار ہے جو ریڈیٹ

جلد مذہب کے بارے میں ہے۔ یہ رپورٹ ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی اشاعت میں بالخصوص دلچسپی اخبارات و رسائل کی ہے، جس سے اعلاذہ ہوتا ہے کہ ان اخباروں میں بھی جلد مذہب کے بارے میں تبصرہ جات، بھی مندرج ہوں گے۔ جو تا ایں دم اشاعت عامہ کے محتاج ہیں۔

سوامی شگن چندر نے اپنی مختصر تقریر میں اپنے مذہب کے بارے میں بھی پردہ اٹھایا ہے:

”میرا کوئی مذہب نہیں سوا اس کے جو میرے ماں باپ کا تھا۔“

اس سے ظاہر ہے کہ سوامی جی کی تربیت میں موصوف کے ماں باپ کا زبردست اثر موجود ہے جو شگن چندر میں جلد اعظم کے وقت میں موجود تھا۔ مگر سوامی جی کے والدین کے نام ابھی تک معلوم نہیں ہو سکے۔ سوامی جی اپنے مذہب کی مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

”سادھارن میرا مذہب یعنی آسان مذہب، یہ وہی مذہب ہے جو سب

سے پہلے ہندوستان میں تھا جبکہ ہندوستان تمام دنیا میں فضیلت رکھتا تھا۔“

سوامی جی نے سادھارن مذہب کی فضیلت کی درجہ بیان نہیں کی ہیں۔ تاہم اسلام بھی ایک آسان مذہب کی تعلیم دیتا ہے جس سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ تمام مذاہب خدا کے واحد و یگانہ کی طرف سے تھے۔ بعد میں لوگوں نے ان میں اپنے نفوس کی تلونیاں شامل کر کے مصطفیٰ چشم گدلا کر دیا۔ اسی وجہ سے خالق کائنات نے ہر زمانہ میں اپنی مخلوق کو راہ راست پر لانے کے لیے اپنے ہادی بھیجے اور ہندوستان بھی اس سنت مستمر سے استثناء کا پہلو نہیں رکھتا۔ سوامی جی نے اپنے مذہب کے بارے میں مزید بتایا کہ:

”اس مذہب کی رو سے انسان کا مذہب پیدا ہونے کے وقت سے شروع ہوتا ہے اور مرنے کے بعد اس کی تمام چیزیں یہاں رہ جاتی ہیں، مگر سادھارن دھرم ساتھ جاتا ہے۔ سادھارن مذہب کیا سکھاتا ہے۔ اول ورزش جسمانی اس زمانہ میں ہر ایک آدمی ورزش کرنا تھا۔“

اس کی تفصیل سوامی جی نے اپنی کتاب میں بھی لکھی جو جلد مذہب کے موصوف پر دستیاب تھی۔ مگر آج وہ شاید کہیں بھی نہ مل سکے۔ البتہ اہل علم کے ذاتی کتب خانوں میں کہیں محفوظ ہو تو ہو مگر اس کا تذکرہ سوامی جی کے نام کے ساتھ کہیں سننے میں نہیں آیا ہے۔ سوامی جی آگے فرماتے ہیں:

• دوسرا امر ہے اخلاقی صمت (برہم چرج) یعنی دودھ یا پڑھنا انسان کی قوت کو ضائع نہ کرنا اور ادھی زبان میں علم حاصل کرنا۔ امر تیسرا روح اور روحانی زندگی کے حاصل کرنے کے طریق مثلاً گوشہ نشین دودھ دانوں کی صحبت، نعل کے گئے تعریف اور دعا ان سب کے بعد میں فکر معاش کرنا، اس دھرم کی رو سے خانہلوں کے ساتھ جو سلوک کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ جو تکلیف کوئی دیوے اس سے زیادہ تکلیف اس کو نہ دی جاوے۔ ایسا ہی اس دھرم کی تعلیم ہے کہ شادی سے ثنات جسمانی کی مراد نہ ہو بلکہ عہد اولاد کا پیدا کرنا۔ اگر یہ کام نہ ہو سکیں تو اپت دھرم یعنی تکلیف کا مذہب ہے۔ اور ایک سماجک دھرم ہی ہوتا ہے یعنی ہر طرح کے لوگ جمع ہوں تو ملک کی بہبودیوں میں خود کریں۔ الغرض اس دنیا میں رہ کر اس دنیا کو چھوڑنا، عقل کو کچھ شئی نہ سمجھنا۔ گناہ کو چھوڑنا یہ وہ اور میں کہ سادہ دھرم نے انسان کو تعلیم کئے ہیں۔

سوامی شگن چندر کے خیالات سے اتفاق و اختلاف ممکن ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ ایک امن پسند انسان تھے جو صداقت کے جویا تھے۔ جیسے کہ انہوں نے اپنے جلسہ مذاہب کے پہلے اشتہار میں لکھا تھا: ان سب بزرگوں کے مجمع میں ہر ایک تقریر کا دوسرے کی تقریر کے ساتھ موازنہ کریں اور جہاں حق کی چمک پاویں اس کو قبول کر لیں۔

مگر سوامی جی نے اپنے ان خیالات کے برخلاف کسی تقریر کے حسن و قبح پر تبصرو نہیں کیا۔ بلکہ اگر کوئی تبصرو کے رنگ میں ان سے بات منسوب کی جا سکتی ہے تو ان کا یہ بے مزارسا اور مناظرنگ میں بیان ہے: مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ کوئی مذہب خودیوں سے خالی نہیں۔ لیکن

مذہب میں بظاہر کوئی کمی یا خرابی نظر آتی ہے تو اس لیے کہ ہر ایک مذہب ملے اپنے مذہب کی خوبیوں پر عمل نہیں کرتے۔ چنانچہ اب اس مقام پر ہر ایک نے اپنے مذہب کی مدح گایاں ظاہر کر کے لوگوں کو فائدہ پہنچایا ہے۔

سوامی جی نے جو فائدہ حاصل کیا اس سے پردہ نہیں اٹھاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوامی جی پر کسی محنت سے بالخصوص ان کے ہم مذہبوں کی بابت سے کوئی دباؤ تھا جس کے باعث وہ کھل کر کچھ نہ کہہ سکے۔

اور کچھ کہا بھی تو اپنے ماں باپ کے خیالات کو ہی درست بیان کیا اور جملہ تقریروں پر مبنی ریل کو دم در گلو گمہ کن ہی سے کہا۔ مبادا کوئی مزید پتازہ ٹوٹ پڑے جس کے باعث ان کی یہ کایا کلب ہو گئی تھی۔ یہ گمان کرنا شاید موصوف سے زیادتی کا باعث ہی گردانا جائے مگر اپنی جگہ یہ بھی ایک حقیقت ہے اور نہ ہی اپنی طرف سے ایذا بلکہ ردِ پورٹ جملہ مذاہب مرتبہ و صہنت ریل کیٹی کو تقریروں سے اندازہ کرنا تھا جو کہ شاید عمداً پس پشت ڈال دیا گیا اور صرف تقریروں کو ٹلنے کرنا ہی کافی سمجھا گیا۔ اس کے باوصف سوامی جی کے سینے پر ایک بھلدی پتھر رکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ جیسا نقشہ سابق ہریش چندر نے سوامی شگن چندر کے باپ میں کھینچا ہے وہ کسی کھلے انبار کا تقاضا ہی تھا مثلاً یہی کہ :

۱۸۹۶ء کے نعت دوم کا زمانہ تھا کہ اچانک ایک اجنبی انسان سادھو
نشی بھگوبے کپڑوں میں لمبی شوگن چندر نامی وارد دارالامان (قادیان) ہوا۔ اور
جلدی ہاری مجالس کا ایک بے تکلف رکن نظر آنے لگا۔ ایک دن سیدنا
حکیم الامت مولانا نور الدین صاحب ... کی مجلس میں شریک ہوا تو دوسرے ہی
روز سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود ... کے دربار میں شام اور صبح کی سیر میں شامل ہو کر
حضور کی خاص توجہات کا محو بن گیا کیونکہ وہ شخص اپنے آپ کو حق کا متلاشی اور
صداقت کا طالب ظاہر کرتا ہوا اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لیے آسمانی پانی
کی تلاش میں دور و نزدیک قریہ بہ قریہ بلکہ کوئٹہ سرگرداں پھرتا ہوا قادیان کی
مقدس بستی میں اپنے مدعا و مقصود کے حصول کی امید لے کر آیا اور کچھ لے کر ہی لٹنے
کی نیت سے پہنچا تھا اور اس کی نیک نیتی ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ باوجود غیر ہونے
کے بہت جلد اپنا لیا گیا وہ صرف سادھو تھا جو بھگوبے کپڑوں میں اپنا فقر و مجابات
چھپائے تھا اور نہ کوئی ایسا سوال جس کو دام و مدہم کی ضرورت لاحق ہو پیسے
کی لالچ قادیان میں تقسیم ہوتے خزان کی خبریں یہاں کھینچ لئی ہوں۔ بلکہ
وہ واقع میں متلاشی حق اور طالب صداقت تھا۔ وہ نہ خدا کے برگزیدہ مسیح الزمیل
جس کی فراست کمال جوہر شناس تھی اور جو خدا کے عطا کردہ نور سے دیکھا کرتا تھا۔

یوں اس کی طرف گفت نہ ہو جاتا۔

جناب حضرت مرزا غلام احمد قادیانی میں ایک خاص استغفار تھا۔ جب سابق ہریش چندر کے والد صاحب لکھنؤ تاجیان سے ملے جانے پر ٹہر گئے اور مولانا محمد الدین صاحب نے اس ضمن میں کچھ کہنا چاہا تو فرمایا۔ اس وقت آپ کا چہرہ جلدک سرخ تھا اور آواز میں ایک جلال، شوکت اور رعب تھا:

”نہیں مولوی صاحب! میں نام کے مسلمانوں کی عزت نہ نہیں۔ اگر ہمارے

تو اہلے کا در نہ کھڑا کر کٹ جمع کرنے سے کیا حاصل؟

اور یہی حال غالباً سوائی چندر کے باپ میں مستنبط ہے۔ اگرچہ وہ جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے اظہار حق سے رُکے رہے مگر بہتوں کے لیے ہدایت کا موجب بن گئے۔ ابتداءً سوائی جی بقول سابق ہریش چندر جناب غلام احمد قادیانی کی صحبت فیض بخش سے ایک گرویدہ ہوا کہ وہ قادیان رُک جانے پر آمادہ ہو گیا مگر عدلے تعالیٰ کو اس کے ذریعہ سے ایک عظیم الشان کام لینا تھا جو جناب مرزا صاحب کی ایک دیرینہ خواہش تھی اور اس کی تکمیل کا باعث سوائی جی بن گئے۔

اوپر کہیں مضمون زیر نظر میں سوائی شگن چندر کے دوران جلسہ اہر بعد میں رپورٹ جلسہ مذاہب کی اشاعت تک ملتے جلتے رہنے کا ذکر آیا اور بعد میں غائب ہو جانے کا بھی۔ تاہم سوائی شگن چندر جی کی وفات بعد ۶ سال ۷ اگست ۱۹۱۵ء کو دہلی میں ہوئی۔ اس لحاظ سے سوائی جی کا سال پیدائش ۱۸۴۸ء بنتا ہے اور اگر سوائی شگن چندر کے حالات پر مشتمل شدہ مآخذ پر اعتبار کر لیا جائے تو موصوف گجرات کے علاقہ کنگاہ سے تعلق رکھنے والے ثابت ہوتے ہیں۔

جلد دھرم ہوتو (یا جلسہ مذاہب) میں درج ذیل سوالات کو مقررین کے اظہار خیال کے لیے تجویز کیا تھا۔ ۱۔ انسان کی جسمانی، اخلاقی اور روحانی حالتیں ۲۔ انسان کی زندگی کے بعد کے حالات یعنی جنت ۳۔ دنیا میں انسان کی ہستی کی اصل غرض کیا ہے اور وہ غرض کس طرح پوری ہو سکتی ہے ۴۔ کرم یعنی اعمال کا اثر دنیا اور عاقبت میں کیا ہوتا ہے ۵۔ علم یعنی گیان اور معرفت کے فوائد کیا ہیں؟

لے غلط ہو ”خدا بفضل“ قادیان دارالامان ۱۶ ستمبر ۱۹۱۵ء۔ یہ حال میرے پیلے دوست غلیل قمر نے ناچیز کو ہم پہنچایا ہے۔ ہم ان کی اس غایت کے لیے سر ہلا سپاس ہیں۔

پہلی تقریر سنتن دھرم کے پنڈت ایٹری پرست ادکی تھی۔ انھوں نے کہا کہ جن خیالات کو میں ظہر کرو چکا وہ خاص میرے ذاتی بطور سنتن دھرم ہندو کے تصور کیے جائیں۔ جبکہ شرائط جلسہ میں یہ مثال تھا کہ مقرر اپنی مذہبی کتب سے سوالات کے جوابات دیں۔ اس تناظر میں یہ تقریر قابل الغفلت نہیں تھی۔ اسلام کی فائدگی میں جناب ابوسعید مولوی محمد حسین بٹالوی نے سوالات کے جوابات دیئے کی بجائے نبوت اہل معجزہ پر غیر متعلق بحث کی جو جلسہ کے مقاصد سے خارج تھی۔

تیسرا سائیکل سوسائٹی کے پروڈاکشن کی تقریر ان الفاظ کے گرد گھومتی رہی، یعنی سچ، تیاگ اور نیای لہذا صاحب ضابطہ یہ تقریر بھی بے تعلق تھی۔

مولوی شاعر اللہ کی تقریر میں بقول اخبار چودھویں صدی راولپنڈی یکم فروری ۱۸۹۷ء رولپنڈیا کسی قدر اچھا تھا لیکن بیکھر ٹوٹا و غلط کی قسم کا تھا۔ فلسفیانہ ڈھنگ نہیں تھا۔ جس کی جلسہ کو ضرورت تھی۔

اور تقریر دوم جس کا اوپر ذکر آچکا ہے، کے بارے میں اخبار محمولہ بالانے لکھا کہ مولوی محمد حسین بٹالوی کا بیکھر بالکل معمولی تھا۔ وہی ملاتی خیالات تھے جن کو ہلوگ ہر روز سنتے ہیں اس میں کوئی عجیب و غریب بات نہ تھی اور مولوی صاحب کے دوسرے بیکھر کے وقت کئی لوگ اٹھ کر چلے گئے تھے۔

اگر یہ سلیج کے لیڈر ابوبجراما نے باقی سوالات سے اعراض کیا اور صرف تیسرے سوال کے بارے میں کہا کہ میں اس پر بحث کروں گا۔ لیکن کوئی تسلی بخش جواب دینے سے قاصر رہا۔ تری متھنکر کے پنڈت گوردھن داس نے کہا کہ ہماری زندگی کی غرض میں یہی ہے کہ ہم اپنی رستی کے تمام اجزاء اہل توہنی کا ہم آہنگی کے ساتھ نشوونما کریں ... ایسا ہی ان باتوں کو ترک کریں جو اس کے برخلاف ہوں تو بے شک ہم زندگی کی تیسوری پر قابض ہو جائیں گے۔

دوسرے سوال کے جواب میں کہا کہ یہ تمام کی تمام قیاسی حالت (بعد از وفات) محض ہوا میں مفل ہے۔ یہ عمل ثابت کرنے کے لیے کوئی بھی شہادت نہیں ہے کہ ہمارا نفس جس کا نام بعد رکھ چھوٹا ہے۔ جلسہ جس سے پہلے بھی تھا تو پھر کیوں موت کے بعد اس کی بقاء ہو۔ اس لایہی کلام میں کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔

جناب حضرت مرزا غلام احمد دیانی کے مضمون کو حضرت مولوی عبدالمکریم صاحب سیالکوٹی نے پڑھ کر سنایا کیونکہ مرزا صاحب امانتاً بلکہ میں بوجہ دھرم صحت شرکت نہ کر سکے۔ آپ نے پہلے سوال کے جواب میں قرآن کریم کی سحدۃ یسوت، القیامہ اور سحدۃ النجری سے انسان کی جسمانی حالت نفس لامہ، اخلاقی حالت نفس لامہ اور روحانی حالت نفس مطہرہ کا بیان کیا اور بتایا کہ طبعی، اخلاقی اور روحانی حالتیں آپس میں باہم بطور کئی ہیں۔ طبعی حالتیں تبدیل کے بعد اخلاق بن جاتی ہیں پھر ترقی کر کے روحانیت کے اعلیٰ مقام پر جا پہنچتی ہیں جہاں سے گمراہ کو کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا۔ اجلاس کا وقت پہلے سوال کے جواب میں ہی ختم ہو گیا اس لیے سامعین کے پرزور اہرار پر انتظامیہ نے ۲۹ دسمبر کا دن حضرت مرزا صاحب کے مضمون کے لیے بڑھا دیا۔

مولوی محمد حسین بناؤی کے دوسرے لیکچر کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

سکھ ازم کے نمائندہ سردار جواہر سنگھ نے صوفیہ سوال کے متعلق تقریر کی کہ سکھ مذہب کی تفسیر ہم لوگ اپنے جسم کو اس طرح سمجھتے ہیں کہ یہ پیدا ہونے سے ہی۔ یعنی بالوں کا کٹنا یا ختنہ وغیرہ نہیں کرتے کیونکہ اخلاقی اور روحانی باتوں کا مدار جسم پر ہے اس لیے خالصہ دھرم یہ تعلیم دیتا ہے کہ جسم کی اچھی طرح پرورش کرو، برت وغیرہ کرنے سے کمزور نہ بن جاؤ۔ جسم مٹی، پانی، آگ اور مٹی سے بنا ہے یہ عناصر ایک دوسرے سے درجہ دار لطیف ہیں۔ ان سب کا بننے والا خدا ان سب سے زیادہ لطیف ہے۔ اس ترکیب سے گرو صاحب نے عقلی دھرم سے آسمانی درجہ کی طرف راہ دکھائی۔ اس تقریر سے پہلے سوال یعنی انسان کی جسمانی، اخلاقی اور روحانی حالتوں پر کسی قسم کی روشنی نہیں پڑتی۔

برہمچاریوں کے نمائندہ لالہ کانشی رام نے آخرت و عقیقہ وغیرہ کا اقرار کیا مگر کسی سوال متحرکہ

کا جواب نہ دیا۔

رہنما آف لارڈز کے نمائندہ لالہ رام جی داس نے کہا کہ علم کے چار ذرائع ہیں۔ حواس خمسہ، دلائل منطقی، شہادت تواریخ، انٹیوشن (وجدان)۔ پہلے سوال کے جواب میں کہا کہ انسان نے جسمانی حالات کی اصلاح کرنے میں بہت ترقی کی ہے۔ زمانہ ان حالات کو خود بخود مہلک ہے اب بدیل بن گئی ہے جیسا ہی ان تمام کاموں میں بن گیا کسی حد تک جسم کو دخل تھا بہت ترقی ہو چکی ہے۔ اخلاقی حالتوں کے ذکر میں

کہا کہ پاکیزگی اختیار کرنا، محبت رکھنا، دوسروں کی خدمت کے لیے آٹھلے پیر تیار رہنا اور ان کی خدمت میں لگ جانا ہی اخلاقی امور ہیں۔ روحانی حالت انسان کی وہی ہے جسے محبت کا ڈر نہیں۔ جو ہر ایک کتاب کو کلام مجید جلانے۔ دوسرے سوال کے جواب میں کہا کہ ممکن نہیں کہ ابدی جہنم ہو۔ کوئی آگے کوئی پیچھے سب کے سب خدا تک پہنچ جاویں گے اور وہاں جا کر سمجھیں گے ہنوز ابتداء میں ہے۔

تیسرے سوال کے جواب میں بیان کیا کہ زندگی کی بڑی غرضیں تین ہیں۔ رستہ، راستہ، پاکیزگی۔ مسکرا کر فرمایا کیا ہیں۔ موصوف نے بیان نہ کیے۔ آپ نے اپنے جوابات کا اپنی انہی کتاب سے کوئی ثبوت نہ دیا اور تقریر تھکنے لگی۔

جلسہ مذاہب کے آخری روز حضرت مرزا غلام احمد قادیانی صاحب کے مضمون کا بقیہ حصہ پڑھا گیا۔ سائین جلسہ کے وقت سے پہلے ہی جلسہ گاہ میں اپنی نشستوں پر موجود تھے اور حاضرین کی تعداد آٹھ ہزار سے تجاوز تھی۔ جناب مرزا صاحب کے مضمون سے بقیہ سوالات کے جوابات نہایت اختصار سے ہدیہ قارئین کیے جاتے ہیں۔

دوسرے سوال یعنی انسان کی زندگی کے بعد کی حالت یعنی معنوں کا جواب۔

دنیا میں جو اعمال انسان کرتا ہے اس کے نقوش پوشیدہ طور پر جیسے پلے جاتے ہیں۔ انسان کے مرنے کے ساتھ ہی انسانی روح کو جو اس خاکی جسم سے علیحدہ ہوتی ہے فوری طور پر ایک لطیف جسم مل جاتا ہے جو کہ اعمال کے نیک و بد ہونے کے مطابق نورانی یا ظلماتی ہوتا ہے۔ اس آخرت میں انسان اپنے اعمال نیک یا بد کا مزہ چکھے۔ آخرت میں جو جسم ہوگا وہ اس جسم کی طرح کشیف نہیں ہوگا۔ بلکہ انتہائی لطیف ہوگا جس کے اندر اس سے بھی لطیف تر مدوح ہوگی اور یہ روحانی جسم اسی دنیا میں انسانی اعمال کے مطابق اچھا یا بُرا یا نورانی یا ظلماتی ہوگا۔ اگر کوئی برے کام چھپ کر بھی اس دنیا میں کرے گا تو آخرت میں اس کا نتیجہ انسان کی اس حالت میں ظاہر ہو جائے گا۔ جو سب کو نظر آچکا۔ عالم معاد میں ترقیات لامتناہی ہیں۔ مرنے کا خطرہ نہیں ہوگا۔ روحانی سفر آگے ہی آگے مثبت طور پر جاری رہے گا۔ ہاں مختلف لوگ مختلف درجات میں ہوں گے۔ مگر ہر دم ترقی کی طرف کا مزن، مگر کوئی تھکاوٹ اور تکلیف نہیں ہوگی۔

تیسرا سوال یعنی دنیا میں انسان کی زندگی کی اصل غرض کیا ہے اور وہ کس طرح حاصل ہو سکتی

جواب۔

انسان کی زندگی کی غرض خالق ہی بنا سکتا ہے۔ مخلوق کا یہ کام نہیں کہ اپنی پیدائش کا کوئی مقصد مقرر کرے۔ سو خالق نے قرآن کریم میں انسانی زندگی کے اہل مدعا کے حصول کے لیے متعدد وسائل بیان کیے ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

۱۔ خدا پر ایمان یعنی انسان کسی مخلوق کو کہیں خدا نہ سمجھے۔
۲۔ خدا کے من و جمال پر اطلاع پانا۔ حسن باری تعالیٰ اس کی وحدانیت ہے اور اس کی عظمت، بزرگی اور صفات میں (سورۃ اخلاص)۔

۳۔ خدا کے احسان پر اطلاع پانا اور یہی وسیلہ محبوب حقیقی تک پہنچنے کا ہے۔ (سورۃ ابراہیم)
۴۔ دعا۔ دعا کے ذریعے انسان اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتا ہے اور اس کا حقیقی عہد بن سکتا ہے۔ (سورۃ المؤمن)

۵۔ مقصود حقیقی کو پانے کے لیے مجاہدہ (الصکوت)

انسان کو اپنا مال اور اپنی طاقتیں اور صلاحیتیں خدا کی راہ میں خرچ کرنا ضروری ہیں۔ تاکہ انسان زندگی کے مقصود کو پالے اور اپنے خالق حقیقی کا وصال حاصل کرے۔
۶۔ استقامت (ثم السجدۃ) اور ثابت قدمی۔

۷۔ لاستبازوں کی صحبت اور ان کے کامل نمونوں کو اپنانا (التوبۃ) انسان طبعاً نمونے کا محتاج ہے اور کامل نمونہ شوق کو بڑھاتا اور ہمت کو بلند کرتا ہے۔

۸۔ پاک کشف۔ پاک الہام اور پاک خواہشیں۔ اگر انسان کو خدا کی طرف لے جانے والے راستہ میں ان امور سے تسلی نہ ملے تو وہ ناامید ہو کر قدم بڑھانا ترک کر سکتا ہے (سورۃ یونس) خدا کی طرف سے خوش خبریوں کے نتیجے میں انسان کی کمر ہمت بندھتی ہے اور وہ قرب الہی کی منازل تیزی سے طے کرتا ہے۔

جو تھے سوال یعنی کرم یعنی اعمال کا اثر دنیا اور عاقبت میں کیا ہوتا ہے؟ کا جواب۔
اعمال کا اثر دنیا میں۔ انسان و حیوانہ حالت سے نکل کر با اخلاق انسان بنتا ہے اور پھر مزید ترقی کرنے کرتے با خدا انسان بن جاتا ہے۔ اعمال کا اثر عاقبت میں۔ نیک انسان کو خدا تعالیٰ

روحانی اتصال سے کھلنے کے دیدار کے طور پر نظر آئے گا اور اس کے نیک اعمال بہشت اور اس کے درختوں اور نہروں وغیرہ کی طرح متشکل ہو کر دکھائی دیں گے۔

پانچواں سوال علم یعنی گمان اور معرفت کے فناء کیا ہیں؟ کا جواب۔
قرآن کریم کی رو سے علم کی تین قسمیں ہیں۔

علم الیقین :- کسی چیز کو براہ راست مشاہدہ نہ کرنا بلکہ کسی اور چیز کو دیکھ کر کسی دوسری چیز کے وجود کا استنباط کرنا۔ مثلاً دور سے دھواں دیکھ کر استنباط کرنا کہ وہاں آگ ہے۔ اگرچہ آگ کو آنکھوں سے دیکھنا نہ ہو یا علم الیقین کے حصول کے ذریعہ عقل اور منقولات ہیں (سورۃ الملک) انسانی فطرت بھی علم الیقین کا ایک ذریعہ ہے۔ اگرچہ اس میں ظاہری انتقال نہیں مگر ایک لطیف انتقال ذہنی موجود ہے۔ مثلاً خدا کی ذات کے بارے میں کہ وہ کیسی ہونی چاہیے۔ کیا قدرت مافیہ ہے کہ خدا کمزور ہو یا انسان کے ہاتھوں دکھ اٹھانے والا ہونا چاہیے یا ہو سکتا ہے ہرگز نہیں۔

عین الیقین :- اس سے مراد براہ راست علم ہے یعنی یقین اور اس کے درمیان کوئی فاصلہ نہ ہو مثلاً آگ کو آنکھ سے دیکھنا نہ کہ دور سے دھواں دیکھ کر سمجھ جانا کہ وہاں آگ موجود ہے زندہ خدا کا انا الوجود کہنا معرفت کا مرتبہ عطا کرتا ہے۔ وہ الہام جو عین الیقین کا مرتبہ عطا کرتا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ایک ہی شے میں بندہ اپنے رب سے کچھ عرض کرے اور خدا اسے جواب دے پھر کوئی اور عرض کرے اور خدا جواب دے اس طرح دس بار بندہ مختلف معروضات خدا کے سامنے پیش کرے اور خدا اسے جواب دے۔ یہ وہ الہام ہے جس سے عین الیقین والا علم حاصل ہو سکتا ہے۔ کامل علم کا ذریعہ درحقیقت الہام ہی ہے۔

عق الیقین :- جس طرح مال تجارت سے بڑھتا ہے۔ ایسا ہی علم علمی مزاوت سے اپنے روحانی کمالات کو پہنچتا ہے۔ مزاوت سے علم میں نور آ جاتا ہے اور یہی علم حلقہ الیقین کے مرتبے تک پہنچتا ہے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے دو نسلے ہیں۔ یعنی دیکھوں اور کامیابی کے نسلے۔ آنحضرتؐ نے شدید دیکھوں اور تکلیفوں اور اذیتوں کا مبارزہ انتہائی صبر و شکر سے گزارا۔ معجزانہ ثابت قدمی دکھائی بلکہ اس دور میں آپؐ کے اخلاق عالیہ خوب ظاہر ہوئے۔ فقیہ بلی کے بعد مخالفوں پر پورا اقتدار رکھنے کے باوجود فیاضانہ معافی کا اعلان فرمایا۔ لوگوں نے آپؐ کے اخلاقی دیکھ

کہ گمراہی دینی کہ جب تک خدا کی طوط اور حقیقتاً راست باز نہ ہو وہ یہ اخلاق ہرگز نہیں دکھلا سکتا۔
 یہی وجہ ہے کہ آپ کے دشمنوں کے پہلے کیے بخلت ہو جو گئے۔ روحانی حالتوں کا منبع اور چشمہ
 نفس مطمئنہ ہے۔ جو انسان کو با اخلاق ہونے کے مرتبہ سے باہر ہونے کے مرتبہ تک پہنچاتا ہے۔
 سنانی دھرم کے پنڈت گوپی ناتھ صاحب نے اپنے مذہب کی چھ خوبیوں کا ذکر کیا جو سنا
 مندرجہ بالا کے جواب پر شش نہ تھیں۔

ہندو شاستر سے پنڈت بھانودت نے صرف تین سوال کا ذکر کیا مگر ساری تقریر اس کی
 تشریح سے خالی تھی اور ان کا مضمون باقی سوالات کے جواب سے ہی تھا۔ منشی امام الدین نے کہا کہ
 میں نہ عیسائی ہوں نہ موسوی نہ محمدی۔ میں مسلمان ہوں اور اسنے والا ہوں علی طو پر تو سنا ہے،
 انجیل اور قرآن کا۔ ان کی تقریر میں نہ دعویٰ تھا نہ دلیل۔

اگر یہ سامان کے ماسٹر دھماکا پرشاد نے اپنے مضمون میں بالترتیب پانچوں سوال کا ذکر کیا مگر
 کہیں بھی ان سوالات کا جواب نہ دیا۔

عیسائی مذہب کی طرف سے مشرمان الہس پیش ہوئے۔ آپ نے ادھر ادھر کی باتیں کی
 مگر زیر بحث امر کی طرف التفات آخر چند لفظوں میں ہوا مگر سامعین کو سوالات کے جوابات
 کا انتظار رہا۔

اخبار چودھویں صدی یکم فروری ۱۸۹۷ء کو جو ریویو جلسہ کے بارے میں لکھا۔ اس میں مرزا
 صاحب کے لیکچر کے علاوہ باقی لیکچر کے بارے میں لکھا کہ ”دیگر مذاہب میں سے جتنے لوگوں نے لیکچر
 دئے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ جلسہ کے متفسر و سوالوں کے جواب بھی نہیں تھے۔“ اس کے برعکس مرزا صاحب
 کے لیکچر کے بارے میں لکھا کہ ”مولوی عبدالکریم صاحب نے لیکچر شروع کیا اور کیسا شروع کیا کہ تمام
 سامعین لٹو ہو گئے۔ فقرہ فقرہ پر حملے آفرین دشمن بلند ہوئے اور با اوقات ایک ایک فقرہ کو دھما
 پڑھنے کے لیے حاضرین سے فرمائش کی جاتی تھی۔ عمر بھر ہمارے کانوں نے ایسا خوش آئند لیکچر نہیں سنا۔
 مزید لکھا کہ ”مرزا صاحب کے لیکچر کے وقت اور دیگر اسپیکروں کے لیکچروں میں امتیاز اسی قدر کافی

لے جلسہ کی تقاریر کے علاوہ بات جناب میل رفیق اہ جناب شبیر آقب کے مضامین سے کہ کہیں کہیں اصل سے
 بھی سو فیصد کیا گیا ہے۔ (مامم جلی)۔

ہے کہ مرزا صاحب کے لیکچر کے وقت خلقت اس طرح آگری جیسے شہد پر مکھیاں۔ مگر دوسرے لیکچروں کے وقت بوجہ بے لطفی بہت سے لوگ بیٹھے بیٹھے اٹھ جاتے۔ اور آخر میں لکھا کہ ”اس جلسہ میں اسلام کا بول بالا رہا اور تمام غیر مذاہب کے دلوں پر اسلام کا سیکٹہ بیٹھ گیا۔ گویا ان سے وہ اقرار کریں یا نہ کریں۔“

بطور حرف آخر سوامی جی کے بارے میں ہم اپنی اس رائے کے اظہار کرنے سے نہیں رُک سکتے کہ ان سے جلسہ مذاہب میں مقرر کردہ سوالات کی توقع بعید نظر آتی ہے کیونکہ یہ سوالات تو ایک کامل مذہب کے پس منظر کے لیے ہونے چاہئیں۔ جبکہ سوامی جی تو اپنی تقریر مندرجہ رپورٹ جلسہ مذاہب کے مطابق سب لوگوں کو صرف اٹھنے کھڑے کرنے کی فکر میں تھے۔ اس میں تو وہ کامیاب ضرور ہوئے مگر یہ سوالات جو کامل مذہب کی کھوج لگانے والے ہیں کسی مرد کامل کے ہی ہو سکتے ہیں۔ ہماری رائے میں وہ جناب مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی ذات گرانی ہے جو اس تمام کاروائی کے لیے ایک طور پر پشت پناہ بھی رہی۔ جنہوں نے اس جلسہ کا مضمون قلم برداشتہ لکھا اور رب العرش نے قبل از وقت آپ کو بتا دیا کہ ”مضمون بالا رہا۔“ اسے آپ کے ایک سرمد سابق ہریش چندر کے ذریعے ۲۲ دسمبر ۱۸۹۶ء کی رات بذریعہ اشتہارات مشہر کرنے کے لیے بھجوا دیا گیا اور یہ آپ کی تقریر کے بعد جلسہ گاہ میں بھی تقسیم کیے گئے۔

پہلے پہل یہ جلسہ ٹائون ہال لاہور میں ہونا قرار پایا تھا مگر اس کی مختلف لوگوں کی طرف سے بہت مخالفت ہوئی اور یہ جلسہ ٹائون ہال لاہور میں نہ ہو سکا۔ جیسا کہ دھنپت رائے سکریٹری جلسہ نے بھی اپنی اختتامی تقریر میں کہا کہ ”بڑا خسوس ہے کہ ہمارے اس کام کی مخالفت بہت کچھ کی گئی۔“ وغیرہ وغیرہ بخلافین کی تفصیل اور وجوہ مخالفت کا علم رپورٹ سے نہیں ہوتا۔

پھر سکریٹری صاحب نے سادھو سوامی شوگن چندر صاحب (بپاں پر سکریٹری صاحب نے لفظ شوگن کی بجائے شوگن ہی استعمال کیا ہے) کا شکریہ ادا کیا ہے اور ان کے لاہور کے علاوہ مختلف مقامات سے چندہ وغیرہ کے ذریعے ہر دبلسلہ انعقاد جلسہ کا تذکرہ و شکریہ ادا کیا ہے۔ آخر میں سکریٹری صاحب نے حاضرین سے پوچھا کہ اب اگر لوگوں کی پسند ہو تو جلسہ اگلے سال پھر ہو۔

سکریٹری صاحب کے بیٹھ جانے کے بعد کتنے منٹ تک چاروں طرف سے ہندو مسلمان

میسائی، آریہ دین، ایک زبان جو کہتے تھے کہ:

”یہ جملہ فرقہ رواد بالضرر ہو۔“

پریزیڈنٹ انگریجو کمیٹی جملہ مذاہب درگاہ پرست اور صاحب نے دونوں جوانوں کا خاص طور پر ذکر کیا یعنی:

”خواجہ کمال الدین صاحب بی۔ اے پروفیسر اسلامیہ کالج اور میاں مولان دین

صاحب ٹیکہ دار۔“

اور کہا کہ اگر ان دونوں کی کوشش نہ ہوتی تو یہ کام سرانجام نہ پاتا۔ اگرچہ ان کی شمولیت کمیٹی میں سب سے اخیر تھی لیکن ان کی مدد سب سے اول تھی۔

سابق ہریش چندر صاحب کے مطابق جب خواجہ صاحب کے پاس موصوف نے بظنی اشتہار بناب مرزا حضرت غلام احمد قادیانی صاحب کو لا گیا تو ان کا چہرہ جملے بشاش اور خوش ہونے کے افسرہ سا ہو گیا۔ بعد ہی انہی خواجہ صاحب نے حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کے مشن کی Main St۔ سے یہ مدگی اختیار کر لی اور چند ہی سالوں میں انہی متردود صاحب کا تذکرہ ہی معدوم ہو گیا۔ مگر حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کے جملہ مذاہب کی تقریر زیر عنوان ”اسلامی اصول کی تفاسی“ کے نام سے چھاپی گئی اور اب تک لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر چار و انگ عالم میں اپنے تو کیا غیر دول سے بھی خراج تحسین وصول کر رہی ہے اور ساتھ ہی سوائی شکنجہ چند کے نام کو بھی زندہ رکھے ہوئے ہے۔

لکھتہ کے اخبار ”جزل و گوہر“ اصفیٰ نے جملہ کے بارے میں ۱۹۱۹ء کی اشاعت میں لکھا کہ:

”اگرچہ جملہ اعظم کا ہند میں یہ دوسرا جملہ تھا۔ لیکن اس نے اپنی شان و شوکت اور جاہ و عظمت کی رُو سے سارے ہندوستانی کانگریسیوں اور کانفرنسوں کو ملت کر دیا۔“

قومی تہذیب کی تعمیر کے سلسلے میں

ڈاکٹر عابد حسین کی دانشوری

اردو میں شعروادب اور تنقید کے علاوہ دوسرے علوم و فنون پر ایسی کتابیں کم ہیں جن میں دانشورانہ تفکر کی جلوہ گری ہو۔ فلسفہ، عمرانیات، سیاسیات اور دیگر سماجی علوم پر کتابیں کم آتی ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ طبع زاد اصناف کے علاوہ دیگر علوم محنت خاۓ اور مسلسل غور و فکر کے متقاضی ہیں اور کسی محسوس نتیجہ فکر پران کا خاتمہ ضروری ہے۔

اب رہی یہ بات کہ وہ افکار ماقبل کی تو بیع حسین کرتے ہیں اور افکار مابعد پر اثر انداز ہوتے ہیں یا نہیں تو یہ فلسفہ کا میدان عمل ہے۔ شعروادب اور تنقید ادبی تحقیق کے میدان میں اس قسم کے گوشے دانشوری کا اچھا نمونہ مشکل ہے۔

اس قلت میں بھی کچھ ایسی کتابیں باہرہ نواز ہو جاتی ہیں جن میں فکر کی ایک خاص بیج اور دانشوری کی شمعیں فروزاں ملتی ہیں۔ اس روشنی میں فکر کی کچھ راہیں بھی اجاگر ہو جاتی ہیں۔ سید عابد حسین صاحب کی کتاب ”قومی تہذیب کا مسئلہ“ واقعی ایک اہم مسئلہ کی اہتمام و تفہیم کی کوشش کی طرف ایک دانشورانہ قدم ہے۔ اس کتاب میں ہندوستانی تہذیب کے تشبیب و قزاق پر نظر غائر ڈالی گئی ہے اور تاریخی و عمرانی پس منظر میں وقت کے ایک اہم مسئلہ کو ایک صحت عطا کرنے کے واسطے بڑی عالمانہ اور دانشورانہ فکر ملتی ہے۔ تجارت میں قومی وحدت کا مسئلہ بڑا ہی نازک مسئلہ ہے۔ بلوچوں میں یکجہتی اور کثرت میں وحدت کے عوامل کی جڑیں تلاش کرنے کی سعی بیخ متی ہے۔ ہندوستان ایک عظیم ملک رہا ہے اور موجودہ ہندوستان بھی حدود اربعہ میں کچھ کی کچھ کے باوجود عظیم ہے۔ اس کی اس عظمت کو برقرار رکھنے کا جذبہ بھی موجود ہے۔ اس ملک میں آریوں کی آمد سے قبل اور بعد میں بھی بہت سی قومیں اپنی اپنی تہذیبی روایات

اور رسومات کے ساتھ تھیں لیکن ہر عہد میں مذہب کو سرمندی حاصل رہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:
 ”ہندوستان کی کئی ہزار کی ہندی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اس میں گونا گوں کثرت
 کے اندر وحدت کا جو باریک رشتہ موجود ہے وہ ارباب قوت کے جبر و تشدد سے
 نہیں بلکہ عارفوں کے وجدان سے فلسفیوں کی فکر سے، زابدوں کی ریاضت سے اور
 فن کاروں کے تخیل سے پیدا ہوا ہے اور یہی سادہ سن ہے جن کے ذریعہ سے اسے زیادہ
 وسیع، مضبوط اور پائیدار بنایا جاسکتا ہے۔“

اس سلسلے میں اس کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر اداکار شرن فرماتے ہیں:

”شاید لوگوں کو تعجب ہو کہ ہمارے ہندی مذہب کی جڑیں تو روحانی قدروں میں پیوست
 ہیں لیکن ہمارے حکومت غیر مذہبی ہے۔ دراصل غیر مذہبی ہونے سے مراد لائڈ ہیٹ دنیا
 دہریت یا مادہ کی راحت کو اہم سمجھنا نہیں بلکہ اس بات کا اعلان کرنا اور اس پر زور
 دینا ہے کہ روحانی قدریں عالمگیر ہیں اور ان کو حاصل کرنے کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں۔“

یہی حقیقت ہے کہ ہمارا قومی مذہب ہی اس طرح پیش کیا گیا ہے جس میں ”مرد و عہم سمانہ“
 کی ایک خوبصورت تصویر ہے۔ قومی سطح پر کسی مذہب کو برتری حاصل نہیں ہے بلکہ سارے مذاہب
 برابر ہیں۔ یہ بھی قومی وحدت کی طرف ایک کارگر قدم ہے۔ اس لیے کہ ہندوستان میں دنیا کے سارے مذاہب
 کے پیرو معتد بہ تعداد میں پائے جاتے ہیں اس میں سب کی دل جوئی اور سبوں سے ہم آہنگی تھی ہے۔ اس سے
 اچھا کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ لائڈ ہیٹ بھی اس کے مناسب حال نہیں ہے اس لیے کہ ہر عہد میں مذہب کو
 بالادستی حاصل رہی ہے۔ یہاں کا ہر طبقہ اور خطہ مذہب میں اوطاف رشتہ رکھتا ہے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین کا
 یہ خیال گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہے اور اس میں رچی ہوئی دانشوری ہے۔

ڈاکٹر سید عابد حسین نے اس کتاب میں بڑے ہی منطقی استدلال اور پر زور انداز بیان کے ذریعے
 یہ بھی بتایا ہے کہ ہندوستان میں ہر عہد میں ایک مخصوص ہندی دانشوری ملتی ہے اور اپنے عہد کی تہذیب کی
 تشکیل میں کامیابی بھی ہوئی ہے۔ مسلمان آئے تو انھوں نے بھی اپنی تہذیب اور ہندوستان کی قدیم تہذیب کے
 درمیان ایک ایسا رشتہ قائم کیا جس کا نقطہ عروج اکبر کا عہد ہے۔ اکبر نے ہندو اور مسلمانوں کو ایک رشتہ میں
 بانڈھنے کی کوشش کی اور اس مطلق العنان شہنشاہیت کے عہد میں بھی عوام کے جذبات کا احترام کیا۔ اس میں

وہ کامیاب بھی ہوئے۔ اس راہ سے ہٹ کر اورنگ زیب نے اسلامیت پر کچھ زور دیا تو قومی وحدت خطرے میں پڑ گئی اور وہ زندگی بھر شیواجی کے حوں اور بنارس و نواح بنارس کی فرقہ وارانہ شاخیں یوں سے متشابہاں لاکھڑے جیسے ہی اورنگ زیب ۷۷۷ء میں راہی ملک عدم ہوا تو قتل سلطنت بھی مازم را دنا ہونے لگی۔ زوال کا خوف ایک اندھیرا پڑھنے لگا۔ اس سلسلے میں سید عابد حسین صاحب نے بڑی دانشوری سے سیکرٹزم کے تصور کو استوار کرنے اور تاریخی و تہذیبی پس منظر میں پیش کرنے کی سعی مشکور کی ہے۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد اس کی دستور سازی، ریاستوں کے دفاع، مذہبی ہم آہنگی اقلیتوں کے حقوق، ملک کی وحدت و سالمیت، انسانی دل جوئی اور محاشی و سماجی پیہو کے بیشمار مسائل تھے۔ دوسری طرف اکثریت کو بھی اپنی بڑی بڑی آرزوئیں تھیں جو ایک مدت کی غلامی کے بعد لگاتار تھیں، تعدادات و اختلافات کی ایک ایسی فضا نے نا پید اکن تھی جس میں بڑے بڑے قومی داغ الجھن کا شکار تھے۔ اس حالت میں ہمارے قومی رہنماؤں نے قدم چھونک چھونک کر رکھے اور اس عظیم ملک کی کشتی کو باد مخالف کے تھپیڑوں کے باوجود صمیع و سالم لکے جانے تھے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین کو اس کا شدید احساس ہے اور انہوں نے بجا طور پر محسوس کیا۔

”آج جبکہ ہندوستان کے اندر اتنی گہری سیاسی وحدت ہے جتنی اس کی تاریخ

میں کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ اس کا امکان پیدا ہو گیا ہے کہ ایک نئی قومی تہذیب کی عمارت بہت وسیع اور پائیدار بنیادوں پر کھڑی ہو سکے۔ اس نئی قومی تہذیب کی تعمیر نہ صرف ممکن بلکہ شد ضروری ہے اس لیے ہماری قومی آزادی اور سیاسی وحدت بغیر اس تہذیبی وحدت کے ڈالوا ڈول نہ ہے گی۔“

اس اقتباس کو پڑھنے سے اس کی صداقت پر ایسے طوراً شکار ہو گئی ہے کہ ملک کے طول و عرض میں ایک وحدت کے باوجود اس کی بنیادیں پائیدار نہیں ہو سکی ہیں۔ جس کا مظاہرہ اکثر ہو جاتا ہے اور اب بھی ہماری دلش بعض صوبہ جاتی تعصبات کی آگ میں تپ رہا ہے۔ عابد حسین صاحب نے تہذیبی وحدت کی باتیں کہی ہیں۔ اس کی طرف ہماری قومی اور تہذیبی پالیسی بھی گامزن ہے۔

ہماری قومی تاریخ جو ہزاروں سال پر محیط ہے اس کے مطالعہ سے یہ بات واضح طور پر سامنے آئی ہے کہ ہر عہد میں حکمران خاندان نے اپنی فرمان روائی اور حکمرانی کی سالمیت کے لیے وقت اور لگی شعور اور سیاسی، سماجی اور ملی بیداری کے اعتبار سے قومی تہذیب کی تشکیل کی ہے۔ موصوفہ مجاہدیت حال کی فضا میں سامنے لے رہا ہے

اس نے مختلف وقت کے مطابق ہی قومی تہذیب کی تشکیل کرنی ہے جس سے ہماری آراوی اور لکی وحدت برقرار رہ سکتی ہے۔ اس سلسلے میں مابد صاحب مختلف لسانی موبوں کو بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں اور جب یہ لسانی فرقہ پرستی کا روپ دھار لیتے ہیں تو اس کے بھیمانک نتائج رونما ہوتے ہیں۔ اس کے اثرات ہم ماضی میں دیکھ آئے ہیں اور موجودہ ہندوستان بھی اس خبردار آواز ہے۔ اس لیے مختلف زبانوں کی علاقائی سالمیت کو برقرار رکھتے ہوئے ایک قومی اور بین الصوبائی زبان کو فروغ دینا ضروری ہے۔ قومی تہذیب کی تعمیر کے لیے مابد حسین صاحب نے تین نمایاں پیش کی ہیں:

(۱) ایک معقول لسانی پالیسی اختیار کرنا تاکہ ہندی کی آمریت کم ہو جائے اور اسے تمام موبوں میں اثر و نفوذ کا موقع حاصل ہو۔

(۲) مختلف لسانی جماعتوں کے منتخب مفکرین، مصنفین اور فن کاروں کو ایک جگہ جمع کرنا تاکہ ان کے میل جول اور لین دین سے ادب اور فنون لطیفہ کے قومی طرز و اسلوب جو قومی تہذیب کی تشکیل میں اہم حصہ لے رہی حیثیت رکھتے ہیں وجود میں آئیں۔

(۳) اس مشترکہ تہذیب کو جو اس طرح بنے گی ہندوستان کے ہر خطے اور ہر جماعت میں پہونچانا تاکہ سارے ملک میں قومی وحدت کی روح پیدا ہو۔

معقول لسانی پالیسی کے ذریعہ ہندی کو دستور ہندی کی جڑ چھایا میں پورے ملک میں رائج کرنے کی کوشش کرنی ہے بشرطیکہ صوبائی زبانیں مجروح نہ ہوں۔ ہندی نے دن دوئی رات چو گئی ترقی کی ہے۔ اس میں اصطلاحات علمی وضع ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک اتر پردیش ہندوستان اور جنوبی ہندوستان میں اس کی حیثیت اگر شجر مجموعہ نہیں تو مشتبہ مزدور ہے۔ کچھ تو ہندی والوں کے غلط رویے اور آمرانہ ذہنیت کی وجہ سے کہہ اس لیے بھی کہ ہندی زبان صوبائی زبانوں سے زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہے۔ تیسری دقت یہ بھی ہے کہ علاقائی زبانوں اور ہندی سیکھنے کے باوجود ایک بین الاقوامی زبان سیکھنی ہی پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں انگریزی کی طرف توجہ جاتی ہے۔ اب محض قومی یکجہتی کے طور پر ہم خوب کی کوئی زبان سیکھیں اور خوب دلسے شمال کی کوئی زبان سیکھیں تو یہ تمنا دینے والا عمل جو گنا غالباً اسی وجہ سے اس پالیسی پر عمل درآمد نہیں ہو سکا۔ اگر ہندوستانی کو ملک کی راج بھاشا بنایا جاتا اور اسے اردو رسم خط کے ساتھ ہندوستان کے سارے رسم خط میں لکھا جاتا تو اس قسم کے مسائل کھڑے ہونے کے امکانات کم تھے اور میرے خیال میں راج بھاشا ہندی کو ایسا کرنا چاہیے تب

ہی ہم کہہ سکتے ہیں کہ

بہر رنجے کو خود ہی جبار ہی پوشش
 لیکن اس کے برعکس ہندی کو ہندی وطن استوار اور مشرکت کے تحت سہمنا طاسے جو جمل بننا
 رہے ہیں کہ یہ بھی حوای دھار سے علاحدہ ہو چکا ہے جس صورت میں قومی تہذیب کی تیسرے قومی مشکل
 ہے۔ اس لیے کہ لسانی وحدت اس کا جزو لازم ہے۔ گاندھی جی نے ہندوستان کو دونوں رسم خط میں قومی
 سطح پر رائج کرنے کی تلقین کی۔ مابعد صاحب بھی اس کی حمایت کرتے ہیں۔ گاندھی جی کی تلقین پر عمل کرنے کے نتیجہ
 میں بھارت لسانی سطح پر طرح طرح کے مسائل میں الجھا ہوا ہے۔ انگریزی دن بہ دن لنگو افریقا کے طور پر مضبوط
 ہوتا جا رہی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کئی۔ دی کے وہ سلسلے ہر دو گرام جو علی اور بن العوامی سطح کے ہوتے ہیں
 انگریزی میں پیش کیے جاتے ہیں اور انگریزی ذریعہ تعلیم کے سکولوں میں دن بہ دن بیڑ بڑھتی جا رہی ہے۔ کیا
 اس صورت میں قومی تہذیب کی تیسرے ہندوستانی ثقافت پر ہو سکتی ہے؟

مابعد صاحب لسانی وحدت کی ترقی کے واسطے ہندی کو غیر ہندی صوبوں میں رائج کرنے کی تلقین کرتے
 ہیں تفصیل میں چلے گا وقت نہیں ہے اس سے ان کے غلوں کا اندازہ ہوتا ہے لیکن زمانے کی پیش رفت
 نے اسے رد کر دیا ہے۔

قومی تہذیب کی تعمیر کے سلسلے میں تمام لسانی اکائیوں کے منتخب مفکروں، مصنفوں اور فن کاروں
 کو ایک جگہ جمع کر کے سال میل اور لین دین سے ادب اور دیگر فنون لطیفہ کے استعمال کرنے کے سلسلے میں ان کی
 فکر و اشتراک ہے اس لیے کہ اگر کے عہد میں یہ ذریعہ کی شکل میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ مگر اس کی طرف خاطر خواہ
 توجہ نہیں کی گئی ہے تو پھر وقتاً فوقتاً مختلف زبانوں کے شعراء وادبا کی گوشنہیوں اور مصلحتوں سے یہ اندازہ ہوتا
 ہے کہ اس سلسلے میں بھی ہمارا قومی شور و میل ہوا ہے اور مابعد صاحب کی رائے کا اثر معلوم ہوتا ہے۔

انہوں نے اس مشترکہ تہذیب کو ہندوستان کے ہر خطہ اور جماعت میں قومی وحدت کی روح پیدا
 کرنے کے لیے جو پختہ کرنے کی تلقین کی ہے۔ یہ بھی گہری سوچ بچار کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر مراد کا کہنا ہے کہ اس کتاب کے پیش لفظ میں فرماتے ہیں:
 "ڈاکٹر مابعد صاحب نے قومی وحدت کو مضبوط کرنے کے لیے کچھ تجویزیں پیش کی
 ہیں جنہیں قبول کریں یا نہ کریں وہ اس کے مستحق غور ہیں کہ سب ہندوستانی خود میں متحد ہوں"

کا مادہ ہے ان پر سنجیدگی سے غور کریں:-

ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے ہندی رائج کرنے کی جو ترکیبیں بتائی ہیں غالباً رادھا کرشنن جی کو بھی اس سے اتفاق نہیں ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے قومی تہذیب کی تعمیر کے سلسلے میں جو خیالات پیش کیے ہیں وہ بہت غور و غوض اور دانشورانہ فکر کے بعد کہے گئے ہیں اور ان سے ہمارے قومی شعور نے خاصا استفادہ کیا ہے۔

ڈاکٹر عبد القیوم ابدالی
شہزادہ
راجہ یونیورسٹی، راجہ

سجاد ظہیر اور اردو ہندی ہندوستانی

سجاد ظہیر کی تشریحی تخلیقات میں زبان کے مسئلے پر اردو ہندی ہندوستانی، ایک مختصر مگر مفرد اور اہم مقالہ ہے جو ستمبر، ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ زبان کے مسئلے پر اس وقت جو کشمکش برپا تھی اس نے دو الگ الگ کیمپ قائم کر دیے تھے۔ ایک اردو والوں کا تھا اور دوسرا ہندی والوں کا۔ اردو دونوں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے۔ ایسے میں کچھ سیکولر ذہن رکھنے والے لوگوں نے اردو اور ہندی کو ہماری قومی ہندوب اور کچھ کی میراث قرار دیتے ہوئے انہیں مشترک وسیلہ اظہار کے طور پر استعمال کے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی۔ سجاد ظہیر بھی اسی انداز نظر کے قائل تھے۔ ان کے مطابق :

”جب تک کسی زبان کی جڑیں کسی قوم کی ہندوبی اور روحانی روایت میں پیوست نہ ہوں اور جب تک اس کی بنیادیں کسی ایسی زندہ بولی پر نہ ہوں جو کسی خاص گروہ یا طبقے تک محدود نہیں بلکہ عوام میں بھی رائج ہو، اس وقت تک وہ عمومی حیثیت حاصل نہیں کر سکتی اور ایک جمہوری اور ترقی پذیر سماج میں کچھ کے ارتقا کی آلاکار نہیں بن سکتی۔ چونکہ اردو اور ہندی ایسی زبانیں ہیں اس لیے وہ ترقی کر رہی ہیں۔ اس لیے ان میں صلاحیت ہے کہ وہ ہندوستان کے مختلف زبانیں بولنے والے علاقوں کے لوگوں کی مشترک زبان بن جائیں۔“ (ص ۷)

انھوں نے دونوں زبانوں کی اصلیت، اہمیت، آغاز اور ترقی پر لسانی نقطہ نظر سے روشنی ڈالتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ :

”اردو کی ابتدا جب کہ اس کا نام ہندی یا ہندوبی تھا، یہاں کی کھڑی بولی میں فارسی، ترکی اور عربی کے ان الفاظ کے ملنے سے ہوئی جسے باہر سے آئے ہوئے عام مسلمان بولتے تھے۔“

دراصل اردو کی ابتدا ہند آریائی ارتقا کے اس مرحلے میں ہوئی جب ہندستان میں نئی لسانی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اور جوڈا کرستی کا رجحان کے مطابق:

اگر مسلمان اس ملک میں نہ بھی آتے جب بھی ہندستان کے لسانی نقشے میں یہ تبدیلی ظاہر ہو کر رہتی۔

بہر حال ہند آریائی ارتقا کا جدید دور ہندستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ہی شروع ہوا اور جدید ہند آریائی زبانیں نئی ہندوئی ثقافتی حیات سے ہوئے نمودار ہوئیں۔ ایک ایسے وقت میں مسلمانوں کے ذریعہ ہندستان کی قدیم آبادی کو سمجھنے اور اس کے مسائل کا فہم و شعور حاصل کر کے ان کے حل میں معاون ہونے اور اس کے ساتھ ربط وارتقا پیدا کر کے اتحاد و یکگاہی کے رشتے کو استوار کرنے کی کوشش کے نتیجے میں ایک مشترک قومی اور رابطے کی زبان وجود میں آئی گئی۔ مسلم فقرا اور صوفیا کی ابتدائی تحریریں اس زبان کی جین مثالیں ہیں۔ یہی اردو کی ابتدائی شکل ہے۔

اردو کا تعلق جدید ہند آریائی زبانوں کے جس گروہ سے ہے وہ مغربی ہندی ہے۔ مغربی ہندی ہی کی ایک شاخ کھڑی بولی سے اس کا جنم ہوا اور اس گروہ کی دوسری زبانوں اور بولیوں بالخصوص برج اور ہریانی نے اس پر فاضل اثرات مرتب کئے۔ اردو کی طرح ہندی کی بھی اساس کھڑی بولی پر ہے۔ سکا دھیر نے ان دونوں زبانوں کی ابتدا سے بحث کرتے ہوئے اس کے مشترک ماخذ کی جستجو اور نشاندہی کر کے اردو ہندی جھگڑے کی اصل بنیاد کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کے خیال میں کھڑی بولی ایک طرف تو مسلم اثرات سے متاثر ہو رہی تھی اور دوسری طرف ہندو اثرات بھی اس پر سایہ افکن تھے۔

ان کے مطابق بگھتی تحریک کے زیر اثر جو دوہے، ساکیاں وغیرہ وجود میں آ رہی تھیں، ان کی نقضا ہندو تھی اور رسم خط دیوناگری۔ یہ حالت پندرہویں صدی تک رہی۔ سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں جب شمالی ہند میں اودھی و برج بھاشا کو بہت عروج ہوا اور اس دور کے بہت سے مسلم شاعروں اور شاعروں نے جو شاعری کی شلاک محمد جالسی (پداوت)، شیخ عثمان (چترولی)، شیخ بنی (گیان دیپ)،

اور عبد الرحیم خان خاناں وغیرہ۔ اس میں مسلم مونیہ کے برعکس ہندو فلسفے، تصورات اور شمالی ہندستان میں رہنے والی اکثریت کی زبان کو اپنایا۔ اس کے ساتھ ہی ملی داس اور سور داس جیسے شاعروں نے بھی اپنے فنی اظہار کے لیے اسی زبان کو چنا۔ ان کے یہاں فارسی اور عربی الفاظ کو بھی جگہ ملی۔ اس طرح ادبی اور برنج ہی گھڑی بولی کو متاثر نہیں کر رہے تھے عربی اور فارسی کے اثرات بھی اس پر پڑ رہے تھے۔

دینی کال کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ گرچہ یہ شاعری تاثر دار موضوع کے لحاظ سے جگہ کال کی شاعری کا مقابلہ نہیں کر سکتی پھر بھی اس کی اہمیت اس لیے ہے کہ اس زمانے میں برنج کی شاعری برنج کے علاقے سے نکل کر ہندستان کے مختلف حصوں میں پھیل گئی اور اس میں مسکرت کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے لیکن یہ فارسی اور عربی کے الفاظ سے بھی اپنا دامن نہ بچا سکی۔

انھوں نے اردو کے ارتقا سے بحث کرتے ہوئے خسرو، دہی، قطب شاہ سے لیکر ۱۴۴۱ء تک کے ادب کا جائزہ لیا ہے۔ ان کے خیال میں خسرو یا دلی کے مقابلے میں حاتم کی شاعری میں فارسی کے اثرات اس لیے زیادہ تھے کہ وہ پہلے فارسی کے شاعر تھے بعد میں اردو کے اور خسرو اور دلی حاتم کے مقابلے میں عوام سے زیادہ قریب تھے۔ اس طرح مغلیہ حکومت کے زوال کے بعد جب لکھنؤ، رام پور، عظیم آباد اور مرشد آباد جیسے مراکز سے اردو کی خصوصیت کے ساتھ حوصلہ افزائی ہوئی تو شاعروں نے اسے نہ صرف عوام کے بڑے طبقے میں عام کیا بلکہ منشی، مولوی، معلم اور حکومت کے اہل کاروں نے اسے گاؤں گاؤں گھر گھر پہنچا دیا۔ اس علاقے کے ہندوؤں نے بھی اس کے فروغ میں کم کارنامے انجام نہیں دیے۔

ہندی اردو جھگڑے کے اصل سبب سے بحث کرتے ہوئے انھوں نے اس لفظ 'نظر کو غلط

بتایا کہ:

"اس کا سبب للوالاں جی تھے جنھوں نے فورٹ ولیم کالج میں بیٹھ کر ایسی ہندی

لکھی جس میں فارسی اور عربی کے الفاظ یکسر ترک کر دیے؟

ان کے خیال میں للوالاں جی نے جو زبان استعمال کی ہے اس کا سلسلہ کیر کے زمانے سے چلا آ رہا تھا جو گھڑی بولی کے رواج پذیر ہونے کے باوجود برابر ترقی کرتی رہی۔ ان کے یہاں برنج بھاشا اور اردو جی زبان کے استعمال نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے قبل ہی ان کی تین کتابیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی تھیں اور عوام میں بھی برنج اور اردو جی کے مقابلے میں گھڑی بولی زیادہ مقبول تھی۔

اس طرح ہندی اور اردو دونوں کا ماخذ کھڑی بولی ہونے کے باوجود ہندی میں ان الفاظ ہندوئوں اور ترکوں، ان خیالات اور ادبی روایات کی روح بھری گئی جو ہندو تہذیب کے زیر اثر مہلوں، اودھی، برہمچاری، بھاشا اور شمالی ہند کے دیگر عوامی بولیوں میں برابر موجود تھی اور جن کا مسلسل ارتقا ہو رہا تھا۔ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں بڑی تبدیلیاں اس وقت رونما ہونا شروع ہوئیں جب یہ دونوں زبانیں علیٰ الترتیب ہندو اصلاحی تحریکوں اور مسلم اچیا پرستوں کی تحریک سے متاثر ہونا شروع ہوئیں۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے قبل ہی شاہ رفیع الدین جو شاہ دلی اللہ دہلوی کے صاحبزادے تھے اردو میں قرآن کا ترجمہ کر چکے تھے۔ پھر شاہ عبدالقادر اور شاہ محمد اسماعیل نے اپنی تحریک کے لیے جو پرچے لکھے وہ سب بھی اردو میں تھے۔ بہر حال مذہبی اصلاح پسندی کے اس دور میں ہندی میں سنسکرت اور اردو میں عربی اور فارسی الفاظ کا کثرت سے استعمال ہوا اور ان میں دوریاں قائم ہونے لگیں۔ جنگ آزادی اور دوسری عوامی تحریکوں نے اس دوری کو پائے کی بھرپور کوشش کی، بہت سارے ہندوؤں نے اردو کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا تو بہت سارے مسلمانوں نے ہندی کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اس کے باوجود اردو زبان و ادب کا غالب عنصر مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا آئینہ دار ہے۔ اور ہندی زبان و ادب کا غالب عنصر ہندو تہذیب و تمدن کا عکاس۔ پھر بھی یہ دونوں زبانیں یکساں طور پر ہندوستانی ہیں اور ان دونوں کو پھیلنے پھولنے کا یکساں حق حاصل ہے۔ سجاد ظہیر کے مطابق یہ دونوں زبانیں شمالی ہندوستان کے ایک بڑے علاقے کے علاوہ بہار اور حیدرآباد کے اکثر علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔

اس کے علاوہ فلموں اور تقریروں میں بھی اسی زبان کا استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے ایک آزاد اور جمہوری مملکت ہونے کے ناطے ہندوستان کے ان علاقوں میں ان دونوں زبانوں کو برابر سہولتیں اور حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔ دونوں زبانوں میں تسلیم دینے کا بندوبست ہو۔ ہندی والے اردو اور اردو والے ہندی بھی لکھیں پڑھیں۔ ان زبانوں کے فیاض کو ان کی اصلیت سے آگاہ کرایا جائے۔ اس کے بعد ہی ہندی اتحاد کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکے گا۔ انھوں نے واضح طور پر اپنے نقطہ نظر کو پیش کیا کہ:

”ہندوستان کی بین الاقوامی زبان ہندی اور اردو دونوں ہوں جس کا جی

چاہے جوئی زبان سیکھے، لیکن یہاں بھی ایسی کوشش جاری رہے کہ ہندی اور

اردو کی مشترکہ چیزیں اُبھر سکیں۔“

سجاد ظہیر کا یہ نظریہ غلط نہ تھا مگر بد قسمتی سے یہ ہمارے ملک کے لسانی مجکر دن کا مادہ ان بن سکا۔ سجاد ظہیر اور دوسرے ترقی پسند ادیب تو خلوص سے اردو اور ہندی دونوں کو ایک ہی عوامی دھارے کی زبان سمجھتے رہے لیکن بعض ہندی دالوں کے پیش نظر یہ بات سچی کہ کسی طرح اگر رسم الخط کی یہ دیوار گرا دی گئی تو پھر اردو اور ہندی دونوں زبانیں ایک ہو جائیں گی۔ ظاہر ہے کہ یہ نظریہ خلوص پر مبنی نہیں تھا۔ ڈاکٹر گوپی چند نازنگ نے اسے لسانی سامراجیت اور جبر سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

”ترقی پسند ادیبوں کے مقابلے میں دوسری طرف ہندی حلقوں سے بعض ایسے ادیبوں کی آوازیں اٹھتی رہیں جن کا ایمان تھا کہ اردو اور ہندی کے درمیان صرف رسم خط کی دیوار حائل ہے۔ اگر یہ دیوار اس گرا دی جائے تو اردو بھی اسی طرح ہندی میں ضم ہو جائے گی جیسے راجستھانی، برج، اودھی، بھوجپوری اور دوسری بولیاں۔ ترقی پسند نظریہ زبان کے مقابلے میں ان خیالات کی بنیاد صاف طور پر لسانی سامراجیت اور جبر پر ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسند ادیبوں کا نظریہ زبان اس لحاظ سے لائق ستائش تھا کہ اس کی بنیاد وسیع النظری، کشادہ ذہنی اور لسانی اتحاد پسندی کے جذبے پر تھی۔“

ان حالات و حقائق نے ترقی پسند ادیبوں کو بھی اپنا موقف تبدیل کرنے پر مجبور کیا۔ کرشن چندر

نے صاف طور پر لکھا:

”ہر زبان کو اس کے رسم خط کے ساتھ زندہ رہنے کا حق ہے۔ ہندی کو دیوناگری رسم خط کے ساتھ، تامل کو تامل رسم خط اور اردو کو اپنے رسم خط کے ساتھ اور بنگلو کو بنگلو رسم خط کے ساتھ زندہ رہنے کا حق ہے۔ رسم خط زبان کی کلید ہوتی ہے۔ اردو سے اگر اس کا رسم خط جھین لیا گیا تو تیر اور غالب ہندی لائبریریوں میں رکھ دیے جائیں گے۔ مومن جو داڑوں کی اینٹوں کی طرح عجائب گھر میں ان کی کتا میں سجا دی جائیں گی۔“

۱۔ احتشام صاحب کے لسانی خدمات۔ گوپی چند نازنگ۔ ’شبِ نون‘ نمبر ۱۵۔ ص ۱۔
۲۔ بمبئی اردو کونفرنس میں کرشن چندر کا بیان مشہور اردو کی موجودہ کشش۔ مرقہ۔ البرز عثمانی۔ ص ۶

اس طرح سجاد ظہیر کا یہ مقالہ یقیناً ان کی وسیع النظری، کشادہ ذہنی اور لسانی اتحاد پسندی کی نشانی ہے لیکن اب یہ وقت ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ ہم ہندی کو قومی زبان کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں لیکن اردو کے لیے ان تمام حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں جو ایک سیکولر اور جمہوری ملک میں کسی عوامی زبان کو حاصل ہوتا ہے۔

••

”سجاد ظہیر۔ فکر و فن“۔ کا: ایک باب،

ایہام گوئی

اٹھارہویں صدی میں اردو کا قومی ادبی رجحان

اردو کی قدیم شعری زبان کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اس پر بھاشانی اور علاقائی روایات کی گرفت شدید نظر آئے گی۔ ۱۶۰۳ء میں دکنی شاعر عبداللہ کی 'زبرالہم نامہ' غالباً وہ پہلی تصنیف ہے جس میں فارسی روایات زیادہ ملتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں جب دلی، شاہ سعد اللہ گلشن کے مشورے کے مطابق دلی سے یہ ذہن بسا کر چلتے ہیں کہ بے کار افتادہ معنائیں فارسی کو اردو کو نکھارنے کے لیے استعمال کریں گے اور بھاکا کے کثرت استعمال کو ترک کر کے ریختہ کو اردو یعنی شاہ جہاں آباد کے موافق بنانے کی کوشش کریں گے تو ہمیں سے خاموشیت کی تحریک کے منظم ہونے کا آغاز ہوتا ہے۔ مگر ابھی یہ تحریک اپنی توانائیوں کو مجتمع بھی کر سکتی تھی کہ میرے خیال سے ہندی کے صنائع کے زبردست ریلے نے ایہام گوئی کا غلطہ بلند کر دیا اور تقریباً راج ۱۷۰۰ء تک اردو کے صفت اول کے شعراء کے دلوں میں گدگدیاں پیدا کرتی رہی۔ یہاں تک کہ اس کی مخالفت شروع ہو گئی اور لوگ سخن دشمن ایہام کے منکر ہوتے گئے۔ اس میں خاصا اختلاف ہے کہ ایہام گوئی کے داخلے کا دروازہ عہد اورنگ زیب کی برقعہ فارسی شاعری کے کوپے میں ہے یا بھاشا کی ظلم ہندی اور شبیدہ گری کی راہ میں کھلتا ہے۔ اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ فارسی غزل اور بھاشا کے دو ہرے اور کبت دونوں ہی اس عہد میں لغتی بازی گری اور صنعت آرائی کے گہنوں سے لدے پھندے تھے۔ عہد اورنگ زیب کی فارسی غزل گوئی کے بارے میں ڈاکٹر نور الحسن انصاری نے لکھا ہے کہ "اس دور کی خصوصیات میں سب سے پہلا درجہ تصنع کے غفر کا ہے۔ شاعر کا زور، بیان اور خیال دونوں کے تصنع پر تھا..... تمثیل اور ایہام کا جا بجا استعمال اس دور کی شاعری کا طرہ اختیار ہے۔"

مثال میں انھوں نے بیاہر کے ذوالفقار خاں اور تاقمر علی کا واقعہ بیان کیا ہے کہ جب تاقمر علی نے اس کی شان میں قصیدے کا مطلع پڑھا کہ :

ای شان حیدری جین لو آشکار نام تو در تبر کند کار ذوالفقار

تو وہ صنعت ایہام کے نظر فریب جلوں سے اس قدر روشن تھا کہ ذوالفقار خاں نے خوش ہو کر محض مطلع ہی پر اسے تیس ہزار روپے انعام دیے اور کہا کہ تاقمر علی اور شمر ہستاد، میں مزید انعام نہیں دے سکتا۔ دوسری طرف ہندی دوسرے اور بھاشانی شعرا کی صنعت آرائی اور خیال بندی کے سبب نادرک کے تیرہنے ہوئے تھے جو دیکھنے میں جموٹے لگتے مگر پورے جسم بید سے ڈال رہے تھے اور نعل شہزادے اعظم شاہ اور مظہر کھیلے دل سے اس روش کی بہت افزائی اور ان شعرا کی سرپرستی کر رہے تھے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے ہندی دوسرے ہی کو ایہام گوئی کا سبب قرار دیا ہے رام بابو مکسینہ بھی اس خیال کے موید ہیں ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی آزاد کی رائے کو وقیع مانتے کے باوجود عہد اور رنگ زیب کے فارسی گوشنرا کے زور اور ان کی صنعت آرائی کو اس کی وجہ بتاتے ہیں حالانکہ ہندی ادب کی تاریخ کے مصنف کے مطابق اس عہد میں بھارتی، بھوشن، دیوت، رس لکین اور عالم وغیرہ ہندی شعرا کی صف آرائیوں کا غلط زیادہ بلند تھا اور دیوت کی تصانیف اششٹ یام اور بھاد دلاس کی اعظم شاہ نے داد دی تھی اور بہت افزائی کی تھی جس سے اس کی شہرت میں اور اضافہ ہوا۔

اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اردو شاعری کے ابتدائی دور میں اس 'دھونی اور سنسکرت سے اپنائے ہوئے نظام اقدار کا چلن تو نہیں ہوا لیکن بک سبک، بھید اور شلیش کی صفت گری کا اثر ممکن ہے ان دوسروں سے بھی آیا ہو جو اس دور میں فارسی کے پہلو پہ پہلو مقبول ہونے لگے تھے لیکن ان کے نام ایک خط میں تانور حقوق قاضی عبد اللہ نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ایہام کا غلبہ ہندی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس عہد کی فارسی شاعری کی وجہ سے ہوا۔ دوسری طرف شیخ چاندروہ نے اپنے ایک مضمون میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اس عہد میں ایہام گوئی کا جہان ہندی عنصر کا رہا ہون منت تھا۔ مولوی عبداللہ بھی ایہام گوئی کے چلن کو ہندی شاعری ہی کا اثر بتاتے ہیں۔ اگر کم

۱۔ فارسی بھاد و گندیب میں ۸ آب حیات ۱۱۱۱ ۲۔ اششٹ یام ۱۱۱۱ ۳۔ دلی کا دبستان شاعری ص ۶۸-۶۹ ۴۔ ہندی ادب کی تاریخ از ڈاکٹر حسن ص ۱۳ ۵۔ دلی میں اردو شاعری کا نثری اور ہندی پس منظر ص ۲۸۰-۲۸۱ ۶۔ ایضاً ص ۲۷۸ ۷۔ شاہی ہندی ادب و شاعری کا بنیادی متن، مشورہ روزنامہ ۱۱۱۲ ص ۵۶۲ ۸۔ اردو شاعری میں ایہام گوئی مشعلہ ہم قلم کراچی جون ۱۹۶۱ ص ۹۔

اس جہد کے شعلہ سلاخوں کو کریں تو ایہام کے سلسلے میں جتنی بھی مشہور مثالیں ملتی ہیں ان میں سے بیشتر کلاب و لہجہ اور آہنگ ہندی نثر کا ہی معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فارسی اثر کی بھی مثالیں ملتی ہیں۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

خو یاں کو جاننا ستا گری کریں مجھ سے	دل سرد ہو گیا ہے جبکہ پڑا ہے پالا (آبرو)
نازک پنہ پر لپٹے کرتے ہو تم غردری	موسنی کمرے اپنے فرعون ہوئے ہیں (۰)
تم اپنی بات کے را جا ہو پیارے	کہنے سے تم کوں ہے ضد سوائی (۰)
یہ شعلہ عشق کا حسن ازل کا نور ہے گویا	جلا ہے جبکہ سیدنا جس کو وہ طور ہے گویا (۰)
وہ شمع غفلت دل کو جو کر گیا ہے لٹو	شاید کہ دم ہی پھر آئے رکھتا ہوں اس اسکی
ہنس ہاتھ کو پکڑنا کیا سحر ہے پیارے	پھونکا ہے تم نے منتر گویا کہ ہم کو چھو کر (آبرو)
خاصی سخن کا مٹا تین سکھ ہے عاشقوں کا	گاڑ سے رقیب سائے مرتے ہیں ہاتھ لٹل (حاکم)
دل رشک کی جن میں پیچھو لا ہوا پیسا	کیوں غیر سین بلا کے کہا تم میں آب لا (آبرو)
کیونکر نہ دو تھی کی خوشامد کے خلک	چرنے کا کام کیونکر چلے گرد ہوئے حال (۰)
پسیبہ کی طرح دارو کے شیشے	زبان حال سے کہتے ہیں پی پی (سعادت)

فنی سطح پر ایہام گوئی سے اردو شاعری کو نقصان بھی پہنچا اور اس میں بہت کچھ اضافہ بھی ہوا۔ شاید نقصان زیادہ ہوا۔ سہیے کھنڈت گری اور لفظی ظلم بندی اور آراستگی کے پکڑ میں شعری بے ساختگی اور جذباتی غفلت بے مروتی۔ شعری عمل ایک مشینی عمل بن گیا۔ نتیجے میں شعر تاثر سے محروم اور شاعر جذبے اور احساس کی شدت سے کام لینے کے بجائے رعایت لفظی اور اس کے درو بست کو سمجھانے میں محو ہوتا گیا۔ شعر میں بندی، فکر میں غفلت و جذبہ میں طہارت باقی نہ رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ایہام گوئی کی بہت جلد مخالفت شروع ہو گئی۔ مگر اس سے بھی ہوا کہ لفظوں کی صوری اور صوتی صورتوں میں تنوع اور مختلف الجہت مفہام کی ایک الگ روش نے جنم لیا۔ ایک لفظ کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک لفظ دوسرے الفاظ سے مربوط ہو کر کس طرح اپنے معنی تبدیل کر سکتا ہے، یہ پہلو بھی اجاگر ہوا۔ لفظوں کو محاوروں کا جزو بنا کر لطیف نکات اور نئے معنی پیدا کیے گئے۔ لفظیات ایک نیا ادراک پیدا ہوا۔ ان پہلوؤں میں اتنی کشش تھی کہ لوگ اس کی طرف کھینچے گئے ترتیب کلام اور مختلف تراکیب کے ذریعے پیکر تراشی کا بھی کام لیا گیا۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن، ہمیں ترتیب کلام کسی ایک لفظ کے

مناسبات سے عبارت ہے۔ کسی ایک شے یا تصور کو کسی چیز سے تشبیہ دی گئی ہے اور پھر اس تشبیہ کی مناسبت سے پوری تصویر مرتب کی گئی ہے۔ اس طرح تشبیہ در تشبیہ اور استعارہ سے وہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے جسے لکھنؤ کے شاعر نے رعایت عقلی کی شکل میں کمال تک پہنچایا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ ایہام گوئی کے اشعار محض نادارہ گوئی تھے۔ بعض میں درس عبرت کے بھی کئی پہلو تھے۔ چند شعر دیکھیے :

خداوند اٹھا مجھے دریاں میں بھر کے پرے ہمارے دام میں میاں کو لایا ہیں پرے (آبرو)
گور کا زور مت پکڑ کافر موت کے سیل میں گلبہرام (۔)
بنادواز سے گھڑیاں کہتے کہ اسے غافل کٹی ہے یہ گھڑی تجھ عمر سے اور تو نہیں جیتا۔ (ناجی)
بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن میں تاریخی شخصیات، لباس، ایسے ٹھیلے اور سماجی حوالے بھی ملتے ہیں۔ جن سے اس عہد کی معاشرت کے بہت سے پہلو سامنے آ جاتے ہیں۔ مثلاً

نہ پوچھ مجھ سے نعت خاں کی تہریف بیان کرنے کے رتبے میں ہے عالی (آبرو)
آواز میں چھڑی ہے سدا رنگ کی بہار ہے آبرو کے حق میں یہ انگی صدا بسنت (۔)
لگی چپ جس گھڑی سے پہر بیٹھے پھٹے یارب یہ محمودی کا جامہ (لاطم)
جامہ زیبوں سے ڈر میاں ہیں اس دور کے لے گئے دل گھر نیچے دامن ادنی چولیاں (ناجی)
عید ہوتی تھی جو کوئی انتظار کرتا جس کے گھر اب بتادیں طے کا روزہ دیکھ کر مہمان کو (۔)

یہی سبب کہ مخالفین کے بارہو و قریب قریب تمام اہل نقد و نظر اور شعرا نے ایہام گوئی کی اہمیت، اس سے دلچسپی اور ایہام گوئیوں کی تلاش مضمون تازہ کی کوششوں کو سراہا ہے۔ تیر، سودا، حسن اور دوسرے شعرا اس کی مخالفت بھی کر رہے تھے اور اپنے دل کے چور کو بھی دو چار شعر بطور ایہام کہہ کر ظاہر کر رہے تھے۔ نقی ہوئے جہاں ریمت کی مختلف اقسام گنوائی ہیں وہیں ایہام پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ فراتے ہیں کہ ”نجم ایہام است کہ در شانوان سلف این فن روان داشت۔ انکوں طبعاً معروف این صفت کم است مگر بسیار بستگی بہ شوق و بسیار بستگی کے پرے میں انھوں نے بھی بالواسطہ اس کی اثر پذیری کا اعتراف کیا ہے۔ ان کا یہ شعر بھی اسی کی چٹنی کھا رہا ہے۔ تذکرہ مصنفی میں، مصحفی لکھتے ہیں کہ

کیا جاؤں دل کو کھینچے ہیں کیوں شہر تیر کے کچھ ایسی طرز بھی نہیں، ایہام بھی نہیں

”انفیر اشعار ایہام رادوست ندارد“ گلوں طرح کے شعر بھی کہ جاتے ہیں سہ

گئے مدار کی چھڑیوں میں ساتھ غیر کے اور تمام سال یہ دار و مدار ہم سے رہا

دوسرے تذکرہ نگار بھی ایہام گو شعرا کی نادرہ گوئی اور تلاش معنوں تازہ کی مدد دیتے نظر آتے ہیں۔ خود تیرنے ابرو کے لیے ”شاعر نادرہ گوئے رعنہ“ کا فقرہ استعمال کیا ہے۔ معنوں کے ترنم میں نکلتے ہیں کہ ”ہر چند کم گو بود لیکن بسیار خوش فکر و تلاش فقط تازہ زیادہ“۔ اسی طرح میر حسن نے بھی تلاش لفظ تازہ کی داد دی ہے۔ شاہ ولی اللہ اشتیاق کے بارے میں لکھتے ہیں ”از جملہ استادان ایہام بند بود، الحق کہ بے خوش فکر و خوش تلاش“ قائم ایہام کی برائی کرنے کے باوجود معنوں کے ترنم میں نکلتے ہیں کہ ”شعر رعنہ را بہ تلاش الفاظ و معنی تازہ می گفت“ اس طرح ایہام کے شعروں سے دلوں میں جو گدگدیاں پیدا ہوتی تھیں۔ اور ان میں جو کشش تھی مخالفت کے باوجود لوگ اس کا اظہار کیے بغیر نہ سکے۔ اس سے اس رجمان کی قوت اور اس کی جڑیں کہاں تک پھیلی ہوئی تھیں اس کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ آخر یہ کیا چیز ہے۔ ذرا اس پر بھی غور کرتے چلیں۔

ایہام ایک عرفی لفظ ہے۔ جس کے لغوی معنی دہم میں ڈالنا ہیں۔ فارسی میں بھی اس کے یہی معنی ہیں۔ ”جمع الصنائع“ اور ”مختصر البدائع“ جیسی قدیم کتابوں میں بھی ”جگان دوہما مذاحق“ ہی معنی ہیں۔ اس کا ایک نام ”دو معنی“ یعنی ”دو معنی والی صفت“ کے بھی ہے۔ اصطلاحاً عائدہ صفت ہے جس میں قریب اور بعید کے دو معنی نکلتے ہیں اور شاعر کی مراد معنی بعید سے ہو۔ تیرنے بھی ”نکات الشعراء“ میں یہی معنی بیان کیے ہیں۔ ”معنی ایہام اس است کہ لفظی کہ بردہا بیت بود“ ان دو معنی داشتہ باشند۔ یکے قریب یکے بعید و بعید منظور شاعر باشد و قریب متروک“ اور ”یہ صفت عربی فارسی، سنسکرت، ہندی بھی زبانوں میں پائی جاتی ہے۔ ہندی میں یہ سنسکرت سے آئی۔ سنسکرت میں اس کو شلیش، (श्लेष) کہتے ہیں۔ یہی نام ہندی میں بھی۔ یہ اس کے انکاروں یعنی صفتوں میں ایک اہم انکار ہے۔ اس کے معنی یہ بتائے گئے ہیں کہ ”جہاں ایک شبد سے قوت فنکاری کے ذریعے دو یا دو سے زیادہ معنی ظاہر ہوں، وہاں شلیش کی صفت ہوتی ہے“۔ اس کے دو خاص بعید ہیں لفظی ایہام اور معنوی ایہام۔ لفظی ایہام کی بھی دو قسمیں ہیں۔ مکمل لفظ کا ایہام اور شکست لفظ کا ایہام۔ یعنی پورے لفظ کے ذریعے یا لفظ کو توڑ کر معنی بدل لیے جاتے ہیں۔ سنسکرت میں کویراج کی ”راگو پانڈوہ“ کے بارے میں مشہور ہے کہ اس میں رام چند راجی اور مہا بھارت کی کہانی کو ساتھ

۱ نکات الشعراء مرتبہ ڈاکٹر محمد انجمی ص ۲۰ ۲ ایضاً ص ۳۳ ۳ بحوالہ ڈاکٹر دبستان شاعری ”انڈیا کونرا الحسن ہاشمی ص ۵۰۔

۴ نکات الشعراء، مرتبہ ڈاکٹر محمد انجمی ص ۲۲ ۵ چند و بالا پر پروفیسر ڈاکٹر سار چندا میں پراکاشن نئی دہلی اگست ۱۹۷۸ء ص ۴۳

ماہم بیان کرنے کا کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح یہ وہ اہم صفت ہے جس نے کسی نہ کسی سبب سے ہر زبان میں دھو میں چھائی۔

اردو کا یہ حال ہے کہ دلی میں محمد شاہی عہد کا شاید ہی کوئی شاعر ہو جو اس سے متاثر نہ ہوا ہو۔ مگر سالاروں میں آبرو و مصلحت ناچی، اور عاتم کے نام سرفہرست ہیں۔ ان کے علاوہ اور دوسرے شعرا بھی اس صفت میں کاریگری کی کوششیں کر رہے تھے یہاں تک کہ بیشتر مخالفت کرنے والے شعرا بھی دو چار تغن طبع ہی کے طور پر ہی، کہنے سے نہیں جو گے۔ تذکرہ بالا چار بڑوں کے علاوہ اس رنگ کے شعرا میں مصطفیٰ خاں یکرنگ، محمد حسن حسن، میر کھن بکاز، محمد شرف اشرف، دلی اللہ اشتیاق، دلا درخاں بیرنگ، دہم رنگ، شرف الدین علی خاں پیام، سید عاتم علی خاں عاتم، شاہ فتح محمد دل، میاں فضل علی دانا، میر سادات علی سخاوت، میر سجاد، محمد عارف عارف، عبدالغنی قبول، شاہ کاکل، شاہ نرقل، عبد الوہاب بیکرد اور حیدر شاہ وغیرہ شامل ہیں ان کے علاوہ خاں آرزو اور ان کے ساتھی مثلاً ٹیک چند بہار، حسن علی شوق، شہاب الدین ثاقب، آئند رام خلیص، میر زین العابدین آشنا اور میر نادر ساماں (شاگرد مرزا مظہر) وغیرہ کے یہاں بھی بیشتر رعایت لفظی اور کم تر ایہام کی صورت میں بھی ملتی ہیں۔ تیسرے و مرتا کے دور میں بھی ایہام کی مخالفت کے باوجود اکا دکا شعر مل جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ شعرا کے کھنٹے یہاں بھی رعایت لفظی کی بہت زیادہ مگر ایہام کی بھی ایک آدھ صورتیں نظر آ جاتی ہیں۔

زمانہ ایہام گوئی اور اس کے باقی کے سلسلے میں بھی خامی بخشیں اور دعوے ملتے ہیں۔ ڈاکٹر فضل الحق صاحب نے دیوان شاکر ناجی کے دیباچے میں دعویٰ کیا ہے کہ "۱۱۲۰ھ یا اس کے قریب ایہام گوئی کی ابتدا ہوئی اور غالباً ۱۱۶۰ھ سے کچھ پہلے مخالفت شروع ہو گئی۔ تیسرا قائم، گردیزی اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے ایہام گو شعرا پر کڑی تنقید کی مگر اس دور اور اس کے کافی دنوں بعد تک کسی تذکرہ نگار یا تاریخ نویس نے ایہام گوئی کی ابتدا اور ارتقاء کے بنیادی عناصر کا پتہ لگانے کی کوشش نہیں کی"۔ اس سلسلے میں، میں چند حقائق پیش کر دوں گا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں یہ جو فرمایا ہے کہ "دلی نے اپنے کلام میں ایہام اور دو معنیوں سے اتنا کام نہیں لیا۔ خدا جلنے ان کے قریب العہد بزرگوں کو پھر اس قدر شوق اس کا کیوں کر ہو گیا۔ شاید دوسروں کا انداز جو ہندوستان کی زبان کا سب سے خود رو تھا اس بھگ جادیا" یہ خود اس بات کا اشارہ ہے کہ دلی

کے دیوان کے دلی آنے کے ساتھ ہی ایہام گوئی شروع ہو چکی تھی اور قریب العبد بزرگوں میں ایہام گوئی کے زیادہ شوق کی وجہ بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ دو ہر دوں کی مقبولیت کے سبب تھا۔ شیخ چاند مرحوم نے ایہام گوئی کے رواج کے سلسلے میں بحث کر کے نتیجہ نکالا ہے وہ یہ ہے کہ "دلی کا تقلید سے اس کے تقلیدین کے کلام میں ایک حد تک ہندی کا عنصر غالب تھا۔ اس ہندی عنصر نے اس قدر شدت اختیار کر لی تھی کہ ایہام کا رواج ہو گیا۔ ایہام کی بنیاد اس عنصر پر قائم ہوئی۔" ان کے پہلے جیسے سے اتفاق مشکل ہے اس لیے کہ دلی پہلی بار ۱۷۰۰ء میں دلی آئے مگر اس وقت نہ تو ان کی اور زمان کے کلام کی اتنی شہرت تھی کہ لوگ اس کی تقلید کرتے۔ درہندی یا بھاشانی عنصر جو کچھ بھی تھا وہ اسی وقت تھا۔ اصل شہرت اور تقلید تو ان کے دیوان کے ۱۷۱۹ء میں دلی پہنچنے کے بعد ہی ہوئی اور اس وقت وہ فارسیت کی تحریک کے طبردار تھے۔ ہندی یا بھاشانی عنصر بہت کم ہو گیا تھا۔ ایہام گوئی کی ابتدا اس کے آس پاس ہوئی۔ مگر بہر حال یہ تو ثابت ہو رہا ہے کہ ایہام گوئی کی ابتدا و ارتقاء کے بنیادی عناصر کا پتہ لگانے کی کوشش کی گئی۔ ایہام گوئی کی مدت حیات کے بارے میں بھی خاصی بحث ہوئی ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اپنے مضمون "ایہام اور دیگر شعرا" میں دیوان زادہ شاہ حاتم کے سن اشاعت ۵۶-۱۷۵۵ء کے ضمن میں اس مسئلے پر بھی بحث کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شاہ حاتم دیوان زادہ سے تقریباً ۱۲ سال پہلے "بزک ایہام" کہ چکے تھے اور اس کے ثبوت میں ۱۷۴۶ء کی ایک غزل کا یہ تقطیع پیش کیا ہے کہ

کہتا ہے صاف و شستہ سخن بسکہ بے تلاش حاتم کو اس سبب نہیں ایہام پر نگاہ
اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "ایہام گوئی کے قول عام کا زمانہ ۲۵-۱۷۴۳ء تک ختم ہو چکا تھا۔ اس کے بعد چند سال تک اس کا معمولی اثر رہا۔ پھر یہ بھی زائل ہو گیا۔ شاہ حاتم ۱۷۵۴ء کی ایک غزل کے مقطع میں کہتے ہیں کہ

ان دنوں سب کو چاہے صاف گوئی کی تلاش نام کو چرچا نہیں حاتم کہیں ایہام کا
اس لیے ایہام گوئی کے اس تاریخی رجحان کی مدت حیات تقریباً پچیس سال قرار دی جاسکتی ہے۔ "مرزا رفیع سودا" میں ڈاکٹر خلیق انجم کہتے ہیں۔ "تیس برس کے عرصے میں نہ صرف یہ کہ شاعروں نے ایہام گوئی سے توبہ کر لی بلکہ عوام کا مذاق بھی بدل گیا اور شعرا ایہام سے نفرت کرنے لگے۔ مرزا مظہر کی ریختہ گوئی کا زمانہ وہ ہے

۱۔ مضمون اردو شاعری کی ابتدا اور لغت شعرا اردو جولائی ۱۹۳۵ء ص ۵۶۲
۲۔ ایہام کا دوسرا شعرا رجحان ادبیات مسلمانان پاکستان دہندہ ساتویں جلد اردو ادب (دوم) طبع اقل ۱۹۸۱ء ص ۶۶-۶۷

جب تیر و سودا کی ذہنی نشوونما بھی نہیں ہوئی تھی اور حاتم، معقون، آبرو وغیرہ جیسے استادانِ فن کی شاعری شبابِ پرتھی۔ ان میں صرف حاتم ایسے شاعر ہیں جنہوں نے مرزا مظہر کی اصلاحات کا اثر قبول کیا اور اپنے کلیات میں سے وہاں میں کہے گئے اشعار کو نظری کر کے ایک انتخاب مرتب کیا۔ جن کا نام دیوانِ زادہ رکھا۔ اس قول کے مطابق 'دیوانِ زادہ' کے سنِ شاعت یعنی ۵۶-۱۷۵۵ء سے تیس سال قبل ایہام گوئی کی ابتدا کا زمانہ مانا جائے گا اور اس طرح اس کی ابتدا تقریباً ۲۶-۱۷۲۵ء کے قریب متعین ہوگی۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ عموماً تمام مورخوں کا خیال یہ ہے کہ عہدِ محمد شاہ ہی دراصل ایہام گوئی کی ابتدا کا زمانہ ہے اور شاہ کا عہد حکومت ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۹ء تک ہے۔ اور اس لحاظ سے بھی کہ دکن کا دیوان دکن میں ۱۷۱۹ء میں آیا۔ ایہام گوئی کی ابتدا ۱۷۱۹ء وچ ہی کے آس پاس ہوئی۔ جو ۳۵-۴۴ء تک تقریباً ختم یا کم ہو گئی اور ۵۶-۱۷۵۵ء تک آتے آتے بالکل بے اثر ہو گئی۔ اس لیے ایہام گوئی کی مدت شباب ۱۷۱۹ء سے ۴۵-۴۴ء تک یعنی تقریباً پچیس سال ہے۔ البتہ اس کے اثرات دس سال اور آگے تک موجود رہے۔

اب رہ گئی یہ بات کہ اس کی ابتدا کس نے کی۔ تو اس سلسلے میں معقون نے بانی ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔
 ہوا ہے جگ میں معقون شہر و تیرا طرح ایہام کی جب سین نکلی
 صاحبِ گمشدہ گفتمار نے بھی معقون کے متعلق لکھا ہے کہ "موجد ایہام ریختہ دوست، مگر ناجی کہتے ہیں۔"
 ریختہ ناجی کا ہے حکم اساس بات میری بانی ایہام ہے
 مولانا عبدالسلام لکھتے ہیں کہ "ان بزرگوں نے اس (ایہام) کو اپنا خاص فن بنالیا اور شاہ مبارک آبرو ان سب کے پیش رو قرار پائے۔" مذکورہ قدرت میں ہے کہ "بعد از طبقہ شاعرانِ دکن کہ معاصر دکنی بودند رواج ایہام بسیار شد، سردفتر و سرآمد ایہام گو، نجم الدین عرف شاہ مبارک متخلص بآبرو، اس میں شک نہیں کہ سرخیل اور آبرو آبرو ہی ہیں۔ اس لیے کہ ان کے یہاں ایہام کی جو کثرت ہے وہ دوسروں کے یہاں نہیں مگر میرے خیال سے بانی معقون ہی ہیں اس لیے کہ قریب ترین معاصر شہادت بھی موجود ہے اور معقون کے انداز میں شاعرانہ نقل کا لگان نہیں ہوتا۔"

ابھی ایہام گوئی کو تقریباً ایک راجِ صدی ہی ہوئے ہوں گے کہ فارسیت اور اثرِ فرینت کے حامی

طبوں کی طرف سے مخالفت شروع ہو گئی۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ جو لوگ اردو کو فارسی کے ہر تہہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے مگر یہ صنعت فارسی سے آئی ہوتی تو اس کی مخالفت کیوں کرتے اور مرزا مظہر جو اپنی اشعار اور نقاسط طبع کے سبب اردو کو دوں مرتبہ سمجھ کر اس کو فارسی سے قریب لٹانے کی کوشش کر رہے تھے اس رنگ کی مخالفت میں ہمیشہ پیش کیوں ہوتے۔ مرزا مظہر کے لیے 'طبقات الشعراء' میں ہے کہ:

”می گویند کہ اولیٰ کے کہ طرز ایہام گوئی ترک نمودہ درینہ راد زبان اردوئے معلیٰ
شاد جہاں آباد کہ الحال پسند خاطر عوام و خواص وقت گردیدہ مرفوع ساختہ، زبدۃ العارفین،
قدوۃ الواصلین و اذقت رموز ابکر کا شیعہ کنوز طریقہ، پیغمبر جان جاں مرزا، مظہر و مخلص بہ نظہر
فرستہ صفت“

طرز ایہام گوئی ترک نمودہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ایہام گوئی کر رہے تھے مگر اسے ترک کرنے میں پہل کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس وقت بھی اس سے مجتنب رہے جب کہ دوسرے شعرا اس میں دھو میں چارہے تھے۔ وہ اس وقت بھی رستہ کو اردو معلیٰ کے مطابق بنانے سوار نے میں کوشاں تھے۔ اس کا ثبوت ایک تو خود ان کا کلام ہے۔ دوسرے ان کے شاگردوں کی ایہام کی مخالفت اور تیسرے معنی کا یہ بیان کہ

”درا بدائے شوق شعر کہ سنوز از تیر در مرزا کے در عرصہ نیا مدہ بود و در ایہام گویاں
بود، اولیٰ کے کہ شعر بخیرہ بہ تیغ فارسی لفظہ اوست۔ نقاش اولیٰ زبان ریختہ با عفتاد
فیر مرزا است“

ڈاکٹر ذرا الحسن اشقی کا خیال ہے کہ ”اس ایہام گوئی کے خلاف تحریک کا آغاز دراصل ان شاعروں نے کیا، جو ایہام گویوں کے فوراً بعد آئے۔ ان میں مظہر، یقین اور ان کے ساتھ سودا، میر درد و دیگر خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔“ میں عرض کروں گا کہ مرزا مظہر خاں آرزو کے ہم عصر ہیں اور ایہام گو شعرا آبرو، معنون اور دیگر رنگ اور انہی کے ہم عصر اور خان آرزو کے شاگرد ہیں۔ میر درد اور سودا بعد کے شاعر ہیں۔ مگر یقین جو مرزا مظہر کے شاگرد ہیں، ان شعرا سے پیغمبر ہیں اور مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ان کے سامنے میر و سودا کے چراغ نہ جل سکے۔ اس لیے میر و سودا سے پہلے یقین و سامان ہی نے اس طرز کی مخالفت کی۔

طبقات الشعراء، مرتبہ تارا محمد خاں، ص ۶۱۔ ۱۲۱۔ ۱۲۲۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴۔ ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ ۱۲۷۔ ۱۲۸۔ ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ ۱۳۱۔ ۱۳۲۔ ۱۳۳۔ ۱۳۴۔ ۱۳۵۔ ۱۳۶۔ ۱۳۷۔ ۱۳۸۔ ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲۔ ۱۴۳۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ۱۴۶۔ ۱۴۷۔ ۱۴۸۔ ۱۴۹۔ ۱۵۰۔ ۱۵۱۔ ۱۵۲۔ ۱۵۳۔ ۱۵۴۔ ۱۵۵۔ ۱۵۶۔ ۱۵۷۔ ۱۵۸۔ ۱۵۹۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴۔ ۱۶۵۔ ۱۶۶۔ ۱۶۷۔ ۱۶۸۔ ۱۶۹۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱۔ ۱۷۲۔ ۱۷۳۔ ۱۷۴۔ ۱۷۵۔ ۱۷۶۔ ۱۷۷۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴۔ ۱۸۵۔ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ ۱۸۹۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ ۱۹۴۔ ۱۹۵۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ ۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۲۰۰۔ ۲۰۱۔ ۲۰۲۔ ۲۰۳۔ ۲۰۴۔ ۲۰۵۔ ۲۰۶۔ ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ ۲۳۳۔ ۲۳۴۔ ۲۳۵۔ ۲۳۶۔ ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ۲۳۹۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲۔ ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳۹۔ ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۲۔ ۵۴۳۔ ۵۴۴۔ ۵۴۵۔ ۵۴۶۔ ۵۴۷۔ ۵۴۸۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲۔ ۵۵۳۔ ۵۵۴۔ ۵۵۵۔ ۵۵۶۔ ۵۵۷۔ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ ۵۶۴۔ ۵۶۵۔ ۵۶۶۔ ۵۶۷۔ ۵۶۸۔ ۵۶۹۔ ۵۷۰۔ ۵۷۱۔ ۵۷۲۔ ۵۷۳۔ ۵۷۴۔ ۵۷۵۔ ۵۷۶۔ ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ ۵۷۹۔ ۵۸۰۔ ۵۸۱۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ ۵۸۴۔ ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ ۵۸۷۔ ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۵۹۰۔ ۵۹۱۔ ۵۹۲۔ ۵۹۳۔ ۵۹۴۔ ۵۹۵۔ ۵۹۶۔ ۵۹۷۔ ۵۹۸۔ ۵۹۹۔ ۶۰۰۔ ۶۰۱۔ ۶۰۲۔ ۶۰۳۔ ۶۰۴۔ ۶۰۵۔ ۶۰۶۔ ۶۰۷۔ ۶۰۸۔ ۶۰۹۔ ۶۱۰۔ ۶۱۱۔ ۶۱۲۔ ۶۱۳۔ ۶۱۴۔ ۶۱۵۔ ۶۱۶۔ ۶۱۷۔ ۶۱۸۔ ۶۱۹۔ ۶۲۰۔ ۶۲۱۔ ۶۲۲۔ ۶۲۳۔ ۶۲۴۔ ۶۲۵۔ ۶۲۶۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۲۹۔ ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳۔ ۶۳۴۔ ۶۳۵۔ ۶۳۶۔ ۶۳۷۔ ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ ۶۴۰۔ ۶۴۱۔ ۶۴۲۔ ۶۴۳۔ ۶۴۴۔ ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ ۶۴۷۔ ۶۴۸۔ ۶۴۹۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲۔ ۶۵۳۔ ۶۵۴۔ ۶۵۵۔ ۶۵۶۔ ۶۵۷۔ ۶۵۸۔ ۶۵۹۔ ۶۶۰۔ ۶۶۱۔ ۶۶۲۔ ۶۶۳۔ ۶۶۴۔ ۶۶۵۔ ۶۶۶۔ ۶۶۷۔ ۶۶۸۔ ۶۶۹۔ ۶۷۰۔ ۶۷۱۔ ۶۷۲۔ ۶۷۳۔ ۶۷۴۔ ۶۷۵۔ ۶۷۶۔ ۶۷۷۔ ۶۷۸۔ ۶۷۹۔ ۶۸۰۔ ۶۸۱۔ ۶۸۲۔ ۶۸۳۔ ۶۸۴۔ ۶۸۵۔ ۶۸۶۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔ ۶۸۹۔ ۶۹۰۔ ۶۹۱۔ ۶۹۲۔ ۶۹۳۔ ۶۹۴۔ ۶۹۵۔ ۶۹۶۔ ۶۹۷۔ ۶۹۸۔ ۶۹۹۔ ۷۰۰۔ ۷۰۱۔ ۷۰۲۔ ۷۰۳۔ ۷۰۴۔ ۷۰۵۔ ۷۰۶۔ ۷۰۷۔ ۷۰۸۔ ۷۰۹۔ ۷۱۰۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ ۷۱۵۔ ۷۱۶۔ ۷۱۷۔ ۷۱۸۔ ۷۱۹۔ ۷۲۰۔ ۷۲۱۔ ۷۲۲۔ ۷۲۳۔ ۷۲۴۔ ۷۲۵۔ ۷۲۶۔ ۷۲۷۔ ۷۲۸۔ ۷۲۹۔ ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ ۷۳۲۔ ۷۳۳۔ ۷۳۴۔ ۷۳۵۔ ۷۳۶۔ ۷۳۷۔ ۷۳۸۔ ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۴۲۔ ۷۴۳۔ ۷۴۴۔ ۷۴۵۔ ۷۴۶۔ ۷۴۷۔ ۷۴۸۔ ۷۴۹۔ ۷۵۰۔ ۷۵۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۳۔ ۷۵۴۔ ۷۵۵۔ ۷۵۶۔ ۷۵۷۔ ۷۵۸۔ ۷۵۹۔ ۷۶۰۔ ۷۶۱۔ ۷۶۲۔ ۷۶۳۔ ۷۶۴۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ ۷۶۷۔ ۷۶۸۔ ۷۶۹۔ ۷۷۰۔ ۷۷۱۔ ۷۷۲۔ ۷۷۳۔ ۷۷۴۔ ۷۷۵۔ ۷۷۶۔ ۷۷۷۔ ۷۷۸۔ ۷۷۹۔ ۷۸۰۔ ۷۸۱۔ ۷۸۲۔ ۷۸۳۔ ۷۸۴۔ ۷۸۵۔ ۷۸۶۔ ۷۸۷۔ ۷۸۸۔ ۷۸۹۔ ۷۹۰۔ ۷۹۱۔ ۷۹۲۔ ۷۹۳۔ ۷۹۴۔ ۷۹۵۔ ۷۹۶۔ ۷۹۷۔ ۷۹۸۔ ۷۹۹۔ ۸۰۰۔ ۸۰۱۔ ۸۰۲۔ ۸۰۳۔ ۸۰۴۔ ۸۰۵۔ ۸۰۶۔ ۸۰۷۔ ۸۰۸۔ ۸۰۹۔ ۸۱۰۔ ۸۱۱۔ ۸۱۲۔ ۸۱۳۔ ۸۱۴۔ ۸۱۵۔ ۸۱۶۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ ۸۲۰۔ ۸۲۱۔ ۸۲۲۔ ۸۲۳۔ ۸۲۴۔ ۸۲۵۔ ۸۲۶۔ ۸۲۷۔ ۸۲۸۔ ۸۲۹۔ ۸۳۰۔ ۸۳۱۔ ۸۳۲۔ ۸۳۳۔ ۸۳۴۔ ۸۳۵۔ ۸۳۶۔ ۸۳۷۔ ۸۳۸۔ ۸۳۹۔ ۸۴۰۔ ۸۴۱۔ ۸۴۲۔ ۸۴۳۔ ۸۴۴۔ ۸۴۵۔ ۸۴۶۔ ۸۴۷۔ ۸۴۸۔ ۸۴۹۔ ۸۵۰۔ ۸۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳۔ ۸۵۴۔ ۸۵۵۔ ۸۵۶۔ ۸۵۷۔ ۸۵۸۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰۔ ۸۶۱۔ ۸۶۲۔ ۸۶۳۔ ۸۶۴۔ ۸۶۵۔ ۸۶۶۔ ۸۶۷۔ ۸۶۸۔ ۸۶۹۔ ۸۷۰۔ ۸۷۱۔ ۸۷۲۔ ۸۷۳۔ ۸۷۴۔ ۸۷۵۔ ۸۷۶۔ ۸۷۷۔ ۸۷۸۔ ۸۷۹۔ ۸۸۰۔ ۸۸۱۔ ۸۸۲۔ ۸۸۳۔ ۸۸۴۔ ۸۸۵۔ ۸۸۶۔ ۸۸۷۔ ۸۸۸۔ ۸۸۹۔ ۸۹۰۔ ۸۹۱۔ ۸۹۲۔ ۸۹۳۔ ۸۹۴۔ ۸۹۵۔ ۸۹۶۔ ۸۹۷۔ ۸۹۸۔ ۸۹۹۔ ۹۰۰۔ ۹۰۱۔ ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ ۹۰۴۔ ۹۰۵۔ ۹۰۶۔ ۹۰۷۔ ۹۰۸۔ ۹۰۹۔ ۹۱۰۔ ۹۱۱۔ ۹۱۲۔ ۹۱۳۔ ۹۱۴۔ ۹۱۵۔ ۹۱۶۔ ۹۱۷۔ ۹۱۸۔ ۹۱۹۔ ۹۲۰۔ ۹۲۱۔ ۹۲۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴۔ ۹۲۵۔ ۹۲۶۔ ۹۲۷۔ ۹۲۸۔ ۹۲۹۔ ۹۳۰۔ ۹۳۱۔ ۹۳۲۔ ۹۳۳۔ ۹۳۴۔ ۹۳۵۔ ۹۳۶۔ ۹۳۷۔ ۹۳۸۔ ۹۳۹۔ ۹۴۰۔ ۹۴۱۔ ۹۴۲۔ ۹۴۳۔ ۹۴۴۔ ۹۴۵۔ ۹۴۶۔ ۹۴۷۔ ۹۴۸۔ ۹۴۹۔ ۹۵۰۔ ۹۵۱۔ ۹۵۲۔ ۹۵۳۔ ۹۵۴۔ ۹۵۵۔ ۹۵۶۔ ۹۵۷۔ ۹۵۸۔ ۹۵۹۔ ۹۶۰۔ ۹۶۱۔ ۹۶۲۔ ۹۶۳۔ ۹۶۴۔ ۹۶۵۔ ۹۶۶۔ ۹۶۷۔ ۹۶۸۔ ۹۶۹۔ ۹۷۰۔ ۹۷۱۔ ۹۷۲۔ ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ ۹۷۵۔ ۹۷۶۔ ۹۷۷۔ ۹۷۸۔ ۹۷۹۔ ۹۸۰۔ ۹۸۱۔ ۹۸۲۔ ۹۸۳۔ ۹۸۴۔ ۹۸۵۔ ۹۸۶۔ ۹۸۷۔ ۹۸۸۔ ۹۸۹۔ ۹۹۰۔ ۹۹۱۔ ۹۹۲۔ ۹۹۳۔ ۹۹۴۔ ۹۹۵۔ ۹۹۶۔ ۹۹۷۔ ۹۹۸۔ ۹۹۹۔ ۱۰۰۰۔ ۱۰۰۱۔ ۱۰۰۲۔ ۱۰۰۳۔ ۱۰۰۴۔ ۱۰۰۵۔ ۱۰۰۶۔ ۱۰۰۷۔ ۱۰۰۸۔ ۱۰۰۹۔ ۱۰۱۰۔ ۱۰۱۱۔ ۱۰۱۲۔ ۱۰۱۳۔ ۱۰۱۴۔ ۱۰۱۵۔ ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۷۔ ۱۰۱۸۔ ۱۰۱۹۔ ۱۰۲۰۔ ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۲۔ ۱۰۲۳۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۶۔ ۱۰۲۷۔ ۱۰۲۸۔ ۱۰۲۹۔ ۱۰۳۰۔ ۱۰۳۱۔ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳۔ ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۵۔ ۱۰۳۶۔ ۱۰۳۷۔ ۱۰۳۸۔ ۱۰۳۹۔ ۱۰۴۰۔ ۱۰۴۱۔ ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳۔ ۱۰۴۴۔ ۱۰۴۵۔ ۱۰۴۶۔ ۱۰۴۷۔ ۱۰۴۸۔ ۱۰۴۹۔ ۱۰۵۰۔ ۱۰۵۱۔ ۱۰۵۲۔ ۱۰۵۳۔ ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔ ۱۰۵۶۔ ۱۰۵۷۔ ۱۰۵۸۔ ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰۔ ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۲۔ ۱۰۶۳۔ ۱۰۶۴۔ ۱۰۶۵۔ ۱۰۶۶۔ ۱۰۶۷۔ ۱۰۶۸۔ ۱۰۶۹۔ ۱۰۷۰۔ ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۲۔ ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔ ۱۰۷۵۔ ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷۔ ۱۰۷۸۔ ۱۰۷۹۔ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱۔ ۱۰۸۲۔ ۱۰۸۳۔ ۱۰۸۴۔ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷۔ ۱۰۸۸۔ ۱۰۸۹۔ ۱۰۹۰۔ ۱۰۹۱۔ ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳۔ ۱۰۹۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۰۹۶۔ ۱۰۹۷۔ ۱۰۹۸۔ ۱۰۹۹۔ ۱۱۰۰۔ ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۲۔ ۱۱۰۳۔ ۱۱۰۴۔ ۱۱۰۵۔ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۸۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۱۔ ۱۱۱۲۔ ۱۱۱۳۔ ۱۱۱۴۔ ۱۱۱۵۔ ۱۱۱۶۔ ۱۱۱۷۔ ۱۱۱۸۔ ۱۱۱۹۔ ۱۱۲۰۔ ۱۱۲۱۔ ۱۱۲۲۔ ۱۱۲۳۔ ۱۱۲۴۔ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔ ۱۱۲۷۔ ۱۱۲۸۔ ۱۱۲۹۔ ۱۱۳۰۔ ۱۱۳۱۔ ۱۱۳۲۔ ۱۱۳۳۔ ۱۱۳۴۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۶۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۸۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۰۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۲۔ ۱۱۴۳۔ ۱۱۴۴۔ ۱۱۴۵۔ ۱۱۴۶۔ ۱۱۴۷۔ ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹۔ ۱۱۵۰۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳۔ ۱۱۵۴۔ ۱۱۵۵۔ ۱۱۵۶۔ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹۔ ۱۱۶۰۔ ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۲۔ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴۔ ۱۱۶۵۔ ۱۱۶۶۔ ۱۱۶۷۔ ۱۱۶۸۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۰۔ ۱۱۷۱۔ ۱۱۷۲۔ ۱۱۷۳۔ ۱۱۷۴۔ ۱۱۷۵۔ ۱۱۷۶۔ ۱۱۷۷۔ ۱۱۷۸۔ ۱۱۷۹۔ ۱۱۸۰۔ ۱۱۸۱۔ ۱۱۸۲۔ ۱۱۸۳۔ ۱۱۸۴۔ ۱۱۸۵۔ ۱۱۸۶۔ ۱۱۸۷۔ ۱۱۸۸۔ ۱۱۸۹۔ ۱۱۹۰۔ ۱۱۹۱۔ ۱۱۹۲۔ ۱۱۹۳۔ ۱۱۹۴۔ ۱۱۹۵۔ ۱۱۹۶۔ ۱۱۹۷۔ ۱۱۹۸۔ ۱۱۹۹۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۱۔ ۱۲۰۲۔ ۱۲۰۳۔ ۱۲۰۴۔ ۱۲۰۵۔ ۱۲۰۶۔ ۱۲۰۷۔ ۱۲۰۸۔ ۱۲۰۹۔ ۱۲۱۰۔ ۱۲۱۱۔ ۱۲۱۲۔ ۱۲۱۳۔ ۱۲۱۴۔ ۱۲۱۵۔ ۱۲۱۶۔ ۱۲۱۷۔ ۱۲۱۸۔ ۱۲۱۹۔ ۱۲۲۰۔ ۱۲۲۱۔ ۱۲۲۲۔ ۱۲۲۳۔ ۱۲۲۴۔ ۱۲۲۵۔ ۱۲۲۶۔ ۱۲۲۷۔ ۱۲۲۸۔ ۱۲۲۹۔ ۱۲۳۰۔ ۱۲۳۱۔ ۱۲۳۲۔ ۱۲۳۳۔ ۱۲۳۴۔ ۱۲۳۵۔ ۱۲۳۶۔ ۱۲۳۷۔ ۱۲۳۸۔ ۱۲۳۹۔ ۱۲۴۰۔ ۱۲۴۱۔ ۱۲۴۲۔ ۱۲۴۳۔ ۱۲۴۴۔ ۱۲۴۵۔ ۱۲۴۶۔ ۱۲۴۷۔ ۱۲۴۸۔ ۱۲۴۹۔ ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۱۔ ۱۲۵۲۔ ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔ ۱۲۵۵۔ ۱۲۵۶۔ ۱۲۵۷۔ ۱۲۵۸۔ ۱۲۵۹۔ ۱۲۶۰۔ ۱۲۶۱۔ ۱۲۶۲۔ ۱۲۶۳۔ ۱۲۶۴۔ ۱۲۶۵۔ ۱۲۶۶۔ ۱۲۶۷۔ ۱۲۶۸۔ ۱۲۶۹۔ ۱۲۷۰۔ ۱۲۷۱۔ ۱۲۷۲۔ ۱۲۷۳۔ ۱۲۷۴۔ ۱۲۷۵۔ ۱۲۷۶۔ ۱۲۷۷۔ ۱۲۷۸۔ ۱۲۷۹۔ ۱۲۸۰۔ ۱۲۸۱۔ ۱۲۸۲۔ ۱۲۸۳۔ ۱۲۸۴۔ ۱۲۸۵۔ ۱۲۸۶۔ ۱۲۸۷۔ ۱۲۸۸۔ ۱۲۸۹۔ ۱۲۹۰۔ ۱۲۹۱۔ ۱۲۹۲۔ ۱۲۹۳۔ ۱۲۹۴۔ ۱۲۹۵۔ ۱۲۹۶۔ ۱۲۹۷۔ ۱۲۹۸۔ ۱۲۹۹۔ ۱۳۰۰۔ ۱۳۰۱۔ ۱۳۰۲۔ ۱۳۰۳۔ ۱۳۰۴۔ ۱۳۰۵۔ ۱۳۰۶۔ ۱۳۰۷۔ ۱۳۰۸۔ ۱۳۰۹۔ ۱۳۱۰۔ ۱۳۱۱۔ ۱۳۱۲۔ ۱۳۱۳۔ ۱۳۱۴۔ ۱۳۱۵۔ ۱۳۱۶۔ ۱۳۱۷۔ ۱۳۱۸۔ ۱۳۱۹۔ ۱۳۲۰۔ ۱۳۲۱۔ ۱۳۲۲۔ ۱۳۲۳۔ ۱۳۲۴۔ ۱۳۲۵۔ ۱۳۲۶۔ ۱۳۲۷۔ ۱۳۲۸۔ ۱۳۲۹۔ ۱۳۳۰۔ ۱۳۳۱۔ ۱۳۳۲۔ ۱۳۳۳۔ ۱۳۳۴۔ ۱۳۳۵۔ ۱۳۳۶۔ ۱۳۳۷۔ ۱۳۳۸۔ ۱۳۳۹۔ ۱۳۴۰۔ ۱۳۴۱۔ ۱۳۴۲۔ ۱۳۴۳۔ ۱۳۴۴۔ ۱۳۴۵۔ ۱۳۴۶۔ ۱۳۴۷۔ ۱۳۴۸۔ ۱۳۴۹۔ ۱۳۵۰۔ ۱۳۵۱۔ ۱۳۵۲۔ ۱۳۵۳۔ ۱۳۵۴۔ ۱۳۵۵۔ ۱۳۵۶۔ ۱۳۵۷۔ ۱۳۵۸۔ ۱۳۵۹۔ ۱۳۶۰۔ ۱۳۶۱۔ ۱۳۶۲۔ ۱۳۶۳۔ ۱۳۶۴۔ ۱۳۶۵۔ ۱۳۶۶۔ ۱۳۶۷۔ ۱۳۶۸۔ ۱۳۶۹۔ ۱۳۷۰۔ ۱۳۷۱۔ ۱۳۷۲۔ ۱۳۷۳۔ ۱۳۷۴۔ ۱۳۷۵۔ ۱۳۷۶۔ ۱۳۷۷۔ ۱۳۷۸۔ ۱۳۷۹۔ ۱۳۸۰۔ ۱۳۸۱۔ ۱۳۸۲۔ ۱۳۸۳۔ ۱۳۸۴۔ ۱۳۸۵۔ ۱۳۸۶۔ ۱۳۸۷۔ ۱۳۸۸۔ ۱۳۸۹۔ ۱۳۹۰۔ ۱۳۹۱۔ ۱۳۹۲۔ ۱۳۹۳۔ ۱۳۹۴۔ ۱۳۹۵۔ ۱۳۹۶۔ ۱۳۹۷۔ ۱۳۹۸۔ ۱۳۹۹۔ ۱۴۰۰۔ ۱۴۰۱۔ ۱۴۰۲۔ ۱۴۰۳۔ ۱۴۰۴۔ ۱۴۰۵۔ ۱۴۰۶۔ ۱۴۰۷۔ ۱۴۰۸۔ ۱۴۰۹۔ ۱۴۱۰۔ ۱۴۱۱۔ ۱۴۱۲۔ ۱۴۱۳۔ ۱۴۱۴۔ ۱۴۱۵۔ ۱۴۱۶۔ ۱۴۱۷۔ ۱۴۱۸۔ ۱۴۱۹۔ ۱۴۲۰۔ ۱۴۲۱۔ ۱۴۲۲۔ ۱۴۲۳۔ ۱۴۲۴۔ ۱۴۲۵۔ ۱۴۲۶۔ ۱۴۲۷۔ ۱۴۲۸۔ ۱۴۲۹۔ ۱۴۳۰۔ ۱۴۳۱۔ ۱۴۳۲۔ ۱۴۳۳۔ ۱۴۳۴۔ ۱۴۳۵۔ ۱۴۳۶۔ ۱۴۳۷۔ ۱۴

شاعری ہے لفظ و معنی سے تری لیکن یقیناً
کون سمجھے یاں تب ہے یہام معقول کا تلاش
سلیقے کم ہیں سا ان گفتگو کے

یہاں یہ بات بھی کہتا ہوں کہ خان آرزو کے متاز شاگرد یعنی آبرو، معقول اور یحیٰی جی ایہام گوئی کے سرخیل تھے۔
مگر جب حزیں کے معارضے کے بعد انھیں بار دو کو فارسی کے ہم پلہ بنانے کا خیال پیدا ہوا تو انھوں نے اپنے دامن تربیت
سے دابتہ ان شریکیت افرا کی کی جو اردو کو بجا شائیت کی گرفت سے نکال کر اسے فارسی سے قریب تر لانے کی
کوشش کر رہے تھے۔ اسی لیے یہام گوئی کی مخالفت تیر و سودا نے بھی کی اور دوسرے شعرا نے بھی یہاں تک کہ حاتم نے بھی۔

بطور ہزل ہے حاتم یہ گفتگو درند
کتاہے صاف ڈستہ سخن بسکے بے تلاش
کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر تیر کے
اسلوب شعر کہنے کا تیرے نہیں ہے یہ
ہو شاد اس غزل سے روح آبرو کی سودا
یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش تھم کو دور بیگ

ایہام گوئی کی بے وقتی تیر صاحب کی اس رائے سے بھی ظاہر ہے جو انھوں نے حسن اللہ کے اشارے کے سلسلے میں ظاہر کی ہے۔
طبعش مال یہ ایہام پورا زین جہت شعرا بے رتبا اند

’مخزن نکات‘ میں قائم ہے ایہام گوئی کو مستحکم کرنا گفہ بہ گفہ تیر حسن نے اپنے تذکرے میں لکھا کہ اکثرے ازین
بجو گوہر شہر شہوار بردند و بیضے بر سبب تلاش لفظ حرف درینہ برکت آوردند، چار و نیاچار برائے یادگار علی می نماید۔
معذور باید داشت۔“ اس مخالفت کے اسباب میں جہاں ادبی سطح پر شعری بے کیفی اور تخلیق کے بجائے اس کا
عمل تھا جو شعر کو اثر اور سادگی سے محروم اور بے لطف دے کیف بنار ہا تھا وہیں یہ جذبہ بھی تھا کہ تہذیبی سطح
پر اردو کو اس کے گوارہ دین اور اس کے بھاشائی لب و لہجے اور دلکشتری سے دور کر کے فارسی سے قریب لایا جائے
اور اسے ایک شائری اور شہری زبان بنا دیا جائے۔ یہ کوششیں کامیاب ہوئیں مگر اردو کی ہندستانیت اور اس
کے فیر میں بجا شائیت کے جو عناصر ہیں وہ کبھی قسطوں اور گیتوں کی صورت میں اور کبھی دوہوں کی شکل میں ظاہر
ہوئے رہے۔

کمال حامدی۔ حیات انتخاب کلام

نام عبد الحمید خاں تخلص کمال۔ نسلاً مسلم راجپوت۔ تاریخ و مقام پیدائش یکم جنوری ۱۹۱۱ء۔ قصبہ کوچ صلیح جالون (لوہی) والد صاحب قبلہ آنجنابی حکیم محمد اسماعیل خان انصافخانی کے عالم اور حکیم ماذق تھے۔ قصبہ کے معزز زمیندار اور آنزیری جمسٹریٹ تھے۔ میری والدہ، فادی اور عربی کی تعلیم مقامی کتب میں ہوئی۔ بعدہ جہانسی میں ۱۹۲۷ء میں ہائی اسکول اور ۱۹۲۹ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ مشغلہ شعر گوئی دوران ابتدائی تعلیم شروع ہو گیا تھا۔ کچھ دنوں ناموشی سے جلدی رہا۔ معین آسن جذبی کا بھی اندون جہانسی میں قیام تھا۔ میرے کالج نیکل اور بہت ہی ترقی عزیز دوستوں میں تھے۔ ہم دونوں چونکہ ہم مذاق بھی تھے۔ اس لیے زیادہ تر وقت ہم دونوں کا ساتھ ہی گزرتا تھا۔ اور شعر و شاعری ہوتی رہتی تھی جب دیکھا یہ آگ دبلے نہ دیگی تو ہم دونوں نے حضرت حامد شاہ جہاں پوری جن کا قیام اندون بسلسلہ ملازمت ریلوے فٹارمنٹ جہانسی میں تھا، اصلاح لینا شروع کر دیا اور اسی نسبت سے تخلص کے ساتھ (حامدی) لفظ کا اضافہ ہوا۔ اب مقامی طرحی مشاعروں میں شرکت ہونے لگی۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں سبک پلا آل انڈیا مشاعرہ جس میں میں نے شرکت کی اور جو قابل ذکر ہے مسلم پوٹل الہ آباد یونیورسٹی کا تھا اس میں اس دور کے قریب قریب تمام مشاہیر و اساتذہ یعنی حضرت بگڑ مراد آبادی، حضرت صفی لکھنوی، حضرت فتح تلموہی، حضرت وصل بلگرامی وغیرہ شریک تھے اور سر جسٹس سلیمان صدارت فرما رہے تھے۔ مصحح طرح تھا کہ ”برقی سی اک چمک گئی آج سر نیاز میں“

اس مشاعرہ میں میری اساتذہ مذکورہ سامعین نے بڑی حوصلہ افزائی فرمائی۔ اس مشاعرہ نے مجھے دنیا کے ادب میں کافی نمایاں کر دیا اور خاص طور سے الہ آباد میں تو میری سلگ جگم گئی اور میری الہ آباد کے مشاعروں میں برابر باہر شرکت کرائی گئی۔ ۱۹۲۹ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد بسلسلہ مزید تعلیم لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ وہاں بیسنگھ میں دیئے شعر و شاعری میں ایسا محو ہوا کہ تعلیم کو تعلیم نہ ہو کر محو گیا۔ ہر ہفتہ ہر ماہ مشاعروں میں شرکت۔ ہر دم

ہنگوی وہاں کے ممتاز شعرا اور اساتذہ کی صحبت اور وہ بھی کوفہ حضرت وصال بگرامی حضرت ریاض خیر آبادی حضرت جوگی علی آبادی، حضرت نیاز چمپوری، حضرت سراج لکھنوی، حضرت قدیر لکھنوی، حکیم آشتیہ، شوکت تھانی، منظر لکھنوی آکا الدینی، نسیم انہونی، امین سلوئی و فیروز خیر اس ناز میں ماہ نامہ رسالہ انکشاف، زیر اہدیت نسیم انہونی صاحب شائع ہوا تھا اور ملا نامہ ندوی اخضرہ کے لیڈر تھے۔ ان دونوں رسالوں میں میرا کلام شائع ہوتا رہتا تھا۔ بعد از ان دونوں نشستیں ہوتی رہتی تھیں اور تقریباً ہر مشاعرہ میں میری شرکت لازمی ہوتی تھی۔ مگر صاحب جس درجہ محبت فرماتے تھے وہ تو آپ نے اپنی آنکھوں سے دوران قیام ادبی دیکھی ہے۔ اُس زمانہ میں مگر صاحب لامبی قیام زیادہ تر بمپال ہاؤس لکھنؤ میں رہتا تھا۔ خدا انہیں مغرب رحمت کرے۔ وہ تو سراپا خلوص و محبت تھے۔ زیادہ تر مجھے اپنے ساتھ ہی رکھتے تھے اور میری بہت جھل افرطی فرماتے تھے۔ مجھے لوگ مگر صاحب کے کلام کا محافظ کہا کرتے تھے اور وہ اس بنا پر کہ جب مگر صاحب بوجہ زیادتی سرور غزل نہ پڑھ سکتے تھے تو مجھے اپنی غزل کا پہلا مصرع بتا کر پڑھنے کو کہتے تھے۔ میں انکی غزل انہیں کے لیجو میں پڑھا کرتا تھا۔ شوکت صاحب چونکہ مہر تھے ایسے بہت ہی مخلص اور بے تکلف دوست تھے۔ انھوں نے اکثر اپنے مضامین میں میرا تذکرہ بھی کیا ہے۔ وہ اس بات پر مجھے مشتاقہ منتقلی ظاہر کیا کرتے تھے کہ میں مشاعرے میں پہلے پڑھتا تھا اور وہ میرے فوری بعد۔

اقرام سے تم مشاعرہ لوٹ لیا کرتے ہو اور میں خالی ہاتھ رہ جاتا ہوں۔ المختصر اس ماحول میں تعلیم جاری نہ رہ سکی۔ اور چونکہ والد صاحب قبلہ کا سایہ سر سے اداں غری میں اٹھ چکا تھا۔ برادر محترم نے میری اس زندگی کو اپنے ذوق کے مطابق ناپسند فرمایا۔ اور مجھے میری مرضی کے خلاف مجبور کر کے ادبی میں لازم کر دیا۔ قہر و رویش بر جان و رویش بہ تعمیل ارشاد بھائی صاحب بادل ناخواستہ لکھنؤ کو غیر آباؤ کہہ کر ادبی آگیا۔ وہاں کی ادبی زندگی سے تو آپ خوبی واقف ہی ہیں۔ اس میں شک نہیں سید عبدالسبحان قلی کی موجودگی تک ادبی فضا و رنگیں جیتیں قائم رہیں۔ مگر ان کے بعد باوجود موجودگی شہر صاحب و تاج صاحب وہ بات نصیب نہ ہوئی اور روز بروز فضا مکرر ہوتی گئی۔ رفتہ رفتہ ملازمت کی گرفت مضبوط ہوتی گئی اور ناگہی مصروفیات جمع ہو گئیں۔ فوجت بہ اس جا رسید کہ ادبی دنیا سے کوسوں دور ہو گیا اور یہ عالم ہا کہ خود کہتا تھا اور خود ہی سنتا تھا۔ اب رہتا نہ ہونے کے بعد احباب کے اصرار پر نرم ادب ادبی کو جو مردہ پڑی تھی پھر زندہ کیلے اور اسکی سرپرستی کا بار میرے سر رکھا گیا ہے۔ ملحد مٹری مشاعرے ہونے لگے ہیں۔ دو تین مشاعرے سلسلہ (نشر وے) بیاؤ گا کہ انہی

حضرت نقشبندی بڑے چیلنے پر ہو گئے جن میں عالم فقیر پوری شہر کی بھوپالی۔ منظر شاہ جہاں پوری نے بھی شرکت فرمائی ہے۔ بایں ہمہ طبیعت اس درجہ پرمردہ ہو گئی ہے کہ :

رباعی

جب یاد کبھی آتا ہے عہد ماضی پی لیتا ہوں دو گونٹ زیادہ ساقی
ہر سانس ہے یاں وقفہ غم و ہر کمال اب زریست ہے نہ زریست کی حسرت باقی
وہ تو یہ کہنے کہ آپ کی یاد آوری نے ذوق مردہ میں جان ڈال دی اور مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ ابھی کچھ
ادبی سانس باقی ہیں۔ بہت ممکن ہے آپ ہی میرے لیے مسیح ابن ماریس۔ معین احسن جذبی تو ایسے بھگے کہ
انہوں نے کبھی یاد ہی نہ کیا اور کرتے ہی کیسے ؟ خدا جب حسن و قبح کے نزاکت آہی جاتی ہے۔ ادھر میری خود ارذلت
نے بھی گوارہ نہ کیا کہ اس کا دروازہ کھٹکھاؤں۔ کیا کروں اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔

۴ ستم کی گود میں پائی ہے پردر شہم نے کرم کے ناز اٹھاتے ہوئے بی ڈرتا ہے
یہ ہے منتشر الفاظ میں میری مختصر داستان زندگی۔ اب اگر آپ اس کو اپنے دل آویز لہجے اور مزین لفظ
میں با ترتیب بیان کریں تو شاید کسی قائل ہو جائے جیسا کہ میں نے اپنے ایک مطلع میں کہا ہے۔

۵ آپ کے حسن بیان نے رکھ لی افسانے کی بات ورنہ ہنس دیتے تھے منکر لوگ دیوانے کی بات
بھائی اب تو یاد بھی نہیں کتنے آل انڈیا مشاعروں میں شرکت کی۔ جو ذہن میں ہیں وہ لکھ دیتا ہوں۔
۱۹۷۸ء آل انڈیا مشاعرہ مسلم ہوسٹل الدہ آباد یونیورسٹی زیر صدارت سر جسٹس سلیمان۔ زیر طرح :

۶ برق سی اک چمک گئی آج سر نیاز میں

۱۹۷۸ء آل انڈیا مشاعرہ گورنمنٹ انسٹرکالج الدہ آباد، زیر طرح :

۷ ہر روز اک نیا دل لائے کوئی کہاں سے

۱۹۷۹ء آل انڈیا مشاعرہ کانپور زیر صدارت حضرت صفی لکھنوی، زیر طرح :

۸ شاعر جو فطرت ہے قدرت کا ازداں ہے

اس میں لکھنؤ کے جملہ اساتذہ و قلم بلگرامی، سراج، قدیر، شوکت وغیرہ شریک تھے۔

۱۹۷۹ء آل انڈیا مشاعرہ معین الادب لکھنؤ زیر صدارت حضرت صفی لکھنوی زیر طرح :

۹ قداے خاطر احباب ہے رخصی کیلئے

جملہ اساتذہ لکھنؤ کے شریک تھے۔

۱۹۲۹ء مشاعرہ زم ادب لکھنؤ زیر صدارت نواب طاہر صاحب بھوپال ہاؤس لکھنؤ زیر طرچہ :
 ۱۔ بھگو بھگواناز سے دیکھا نہ کیجئے

سبھی لکھنوی اساتذہ شریک تھے۔

۱۹۳۰ء آل انڈیا مشاعرہ مسلم ہوشل الہ آباد یونیورسٹی زیر طرچہ :

۱۔ فلک کو یا اس سے منزل بہ منزل نہ کیجئے والے

اس میں حضرت متقی لکھنوی، نور احمدی، جگر مراد آبادی، وصال بگلرامی وغیرہ شریک تھے۔

۱۹۳۰ء آل انڈیا مشاعرہ چرچ مشن ہائی اسکول لکھنؤ، زیر صدارت حضرت جگر مراد آبادی جس

میں لکھنؤ کے جملہ اساتذہ کے علاوہ حضرت سیما بکبر آبادی، سائر نظامی شریک تھے۔ زیر طرچہ :

۱۔ مجھے نہ سُن کر بہت دور کی صداہیں میں

۱۹۳۰ء آل انڈیا مشاعرہ لکھنؤ یونیورسٹی۔ اس میں بھی لکھنؤ کے جملہ اساتذہ کے علاوہ حضرت

جگر مراد آبادی، وصال بگلرامی، حضرت سیما بکبر آبادی، سائر نظامی موجود تھے۔

۱۹۳۰ء آل انڈیا مشاعرہ معین الادب لکھنؤ زیر طرچہ :

کشتِ قرب کسی دور کی آواز میں ہے

اس میں جگر صاحب و مجذوب صاحب کی شرکت خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

۱۹۳۰ء آل انڈیا مشاعرہ جہانسی معصر عطرچہ یاد نہیں میرا مطلع ہے ۱۔

شریک غم نہ بھی غم کی راز دار تو ہے جھائے دوست کے صفقے وفا سنا تو ہے

اس مشاعرے میں شرکت کی خاطر ہم اور شوکت تھانوی صاحب، مولانا حامد مدوی صاحب

لکھنؤ سے جہانسی آئے تھے۔ شوکت صاحب نے اس سفر کا نقشہ اپنے ایک مضمون "بس بمانسی ہمک" میں

کھینچا ہے اور یہ ابھی تذکرہ کیا ہے۔ اس مشاعرے میں معین آسن جذبی، صادق دہلوی، حامد شاہ، بہا پوری

بھی شریک تھے۔

۱۹۳۰ء آل انڈیا مشاعرہ گلیم پور زیر صدارت حضرت جگر مراد آبادی زیر طرچہ :

۱۔ اب کہتی ہیں وہ نظریں رحم کے قابل مجھے

۱۹۳۰ء سالانہ مشاعرہ معین الادب لکھنؤ، زیر طرچہ :

سہ ازل سے جو اب تک کام آیا وہ مراد ل تھا

بجز صاحب اس مشاعرہ میں بھی شریک تھے۔

اب رہا الکتاب تو ظاہر ہے کہ فنی اصلاح ابتدا میں حلد شاہراہاں پوری سے لی اور ذہنی و قلبی

صلاح حضرت جگر مراد آبادی کی صحبتوں سے ہوئی۔

فطرتاً طبیعت اقتصاد پسند واقع ہوئی ہے اس لیے غزل و رباعی ہی کو اپنے قلبی تاثرات و دماغی

نیلات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ دیگر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی کوشش ہی نہیں کی۔ فکر و فلسفہ کا پابند

میں ہوا۔ جذبات و تاثرات کو مقدم سمجھا۔ چاہے وہ افکار حسن و عشق ہوں یا مسائل تمدنی و معاشرتی بہر حال

یاد کی تنگ نظری و بے وفائی سے اکثر وہ شعر متاثر ہوا ہوں۔

رباعیات کمال

①

جام ستم دہر پیئے بیٹھے ہیں
در پر ترے اے خالق ہر دو عالم
خاموش ہیں ہونٹوں کو پیئے بیٹھیں
ہم رحم کی درخواست لیے بیٹھیں

②

بے معنی طلسمات بیانی کب تک
تعلیم عمل قوم کو دے بہر خدا
اسلاف کی فرسودہ کہانی کب تک
واعظ تری یہ مرثیہ خوانی کب تک

③

جب یاد میں کرتا ہوں اہنیر پہ پہر
موتی سے بکھر جاتے ہیں ہر سمت کمال
دیکھ کوئی تاریک فضا کا منظر
ہر شے میں وہی وہ مجھے آتے ہیں نظر

④

زخموں کو تو سی لیتے ہیں اکثر اب بھی
وہ بات مگر عہدِ محبت کی کہاں
اشکوں کو بھی پی لیتے ہیں اکثر اب بھی
جینے کو تو جی لیتے ہیں اکثر اب بھی

⑤ سائز کو لیے بیٹھے ہیں کب سے خالی
منعم کے لیے روم بھی ہے و سکی بھی ہے
منتہای نہیں کوئی جناب عالی
مُفلس کا ہے اس دور میں اُکھڑ والی

④ کچھ اور ابھی جو رستم سہنے دو
دل جس کی ضرورت ہے ہمیں حاضر
افسانہ تسلیم و رضا کہنے دو
غم دل کی امانت ہے اے رہنے دو

③ یہ سچ ہے کہ پہلی سی طبیعت نہ رہی
یہ ناز۔ یہ غمزہ۔ یہ شرارت توبہ
وہ چشم مروت وہ عنایت نہ رہی
اب تم سے مجھے کوئی شکایت نہ رہی

② صہبانہ سہمی اشک ہی پی لینے دو
انسان ہیں دل رکھتے ہیں آخر ہم بھی
رستے ہوئے زخموں کو تو سی لینے دو
دو دن تو ہمیں چین سے جی لینے دو

① اللہ رے دم نزع نگاہیں میری
محسوس کچھ ایسا ہوا اس وقت کمال
وہ بھول گئے ساری خطائیں میری
جیسے کوئی لیتا ہو بلائیں میری

⑩ حکم دل ناشاد کی تعمیل تو ہو
تم اور رستم کرلو۔ خدا حافظ ہے
روشن نگہ رناز کی قندیل تو ہو
رواد و غم عشق کی تکمیل تو ہو

⑪ رسوائی عزت بھی نہ ہونے پائی
بے وقت کیا یاد کر کسی نے مجھ کو
گنہامی شہرت بھی نہ ہونے پائی
تکمیل محبت بھی نہ ہونے پائی

⑫ مانوس دعاؤں سے اثر ہے کہ نہیں
دل ڈوبتا جا لکے بصد حسرت دیاس
شب ہائے مصیبت کی سحر ہے کہ نہیں
کیا جانے! نہیں میری خبر ہے کہ نہیں

(۱۳)

بارِ غمِ الفت کو اٹھالیا ہم نے
سکے گئے کوئی آدابِ محبت ہم سے
انہوں کے عوض خون بہایا ہم نے
انسان کو انسان بنایا ہم نے

(۱۴)

ہر ذرے میں عکسِ رخِ زیادہ کیا
اس عالم فانی میں خدا شاہ ہے
ہر قطرے میں بہتا ہوا دریا دیکھا
ہم نے تو حقیقت کا تماشا دیکھا

(۱۵)

بیمارِ الم فکرِ دوا بھی کر لے
تارِ حمتِ باری نہ ہوش کی تجھ سے
طاعت تو بہت کی ہے خطا بھی کر لے
اٹھ سنتِ آدم کو ادا بھی کر لے

(۱۶)

بیمارِ محبت کی دوا بھی نہ ہوئی
انجامِ غنیمِ عشقِ الہی تو بہ
وہ بیٹھے رہے اور شفا بھی نہ ہوئی
دل ٹوٹ گیا اور صدا بھی نہ ہوئی

(۱۷)

جب یاد کبھی آتا ہے عہدِ ماضی
ہر سانس ہے یاں وقفِ غمِ دہرِ کمال
پی لیتا ہوں دو گونٹ زیادہ ساقی
اب ذلیلت ہے نہ ذلیت کی کھرت باقی

(۱۸)

بر بادِ غنیمِ عشق کو برباد نہ کر
جو چاہے ستم کر۔ تری مرضی صیاد
رہنے دے قفس میں مجھے آزاد نہ کر
لے لے مگر یہ ستم ایسا برباد نہ کر

(۱۹)

ساقی ہے نہ مہیا ہے نہ پیمانہ ہے
دُنیا کی حقیقت کہیں کیا تم سے کمال
نظروں میں بظاہر یہ پریِ عمانہ ہے
سچ پوچھو تو افسانہ ہی افسانہ ہے

(۲۰)

وہ عہد وہ پیمانِ وفا بھول گئے
یہ نشہ بے کیفِ حکومت پہ نہیں
وہ نعرِ تسلیم و رضا بھول گئے
وہ دن ہی میں باپ کی سدا بھول گئے

نوائے کمال

①

بکھڑ دل نے کی باپنی سی کچھانگہ نے حرّات کی
دیکھے کوئی غم کوئی پروردہ کلفت کی
کیوں خاک اڑاتا ہے مٹتی ہوئی تربت کی
تم اور ستم کرو۔ میں اور ستم بہ لوں
رہتے ہیں الم اس میں بستی ہیں تنائیں
میں اور کروں توبہ عصیاں سے معاذ اللہ
اک بات ہے پر مٹی ایک راز ہے سر بہتہ
وارفتہ الفت کو معنی کا خطر ہی کس
دنیا میں نہیں کوئی افسوس کمال اپنا
اب کس کو کٹناؤں میں رودادِ محبت کی

②

خود کو چھپا لیا ہی تم نے جہانِ راز میں
لطف ہی کیا جو سن لیا تم نے فناءِ شوق کا
رزم کے رنگ میں خدا رزم کے دھنگ ہلنگ
دندرا زل سننے تھے جو مطلبِ جاں نواز سے
دیکھتے والو ہوشت اور طرد سا ماجرا نہ ہو
پوک سی دیں دل مانتی ہے دردِ سادہ کی گنا
کون پر مسکرا دیا جھانک کے پردے سے کمال
کھل گئی ایک اک کلی گلکدہ بجحاز میں

(۲)

برقی شرفشاں سے موجوں کے کاواں سے
دل سے نکل کے نالے نکلے آسماں سے
تقدیر کو قہر چشمک تعمیر آستیاں سے
افسانہ دو عالم ہر طرح دیکھ ڈالا
وحشی کا تیرے اب تو یہ حال ہو گیا ہے
آئین عشق دیکھو تالون حسن دیکھو
دنیا سمجھ رہی تھی جس کو شہاب ثاقب
جب سے یہ سن لیا ہے وہ آسماں نہیں ہیں

اُو کمال کہیں اُن سے الم کا قصہ
معلوم ہو ہے میں کچھ آج مہرباں سے

(۳)

آرزوے وصال کون کرے
ان سے شرحِ طلال کون کرے
اب نگاہیں بھی دسے مچی ہیں جواب
حشر ہونا ہے حشر ہو جائے
محوِ نظارہ ہے دل حسیران
یوں تو کہنے کو ہے زباں منہ میں
ساقیا یہ گستاخ یہ فصل بہار
آج تک صحت سکون نہ ہوئی

زندگی کو وبال کون کرے
یعنی سہی محال کون کرے
جراتِ عرضِ حال کون کرے
روزِ ضبطِ طلال کون کرے
شرحِ حسن و جمال کون کرے
اُن سے انہارِ حال کون کرے
آج فکرِ مال کون کرے
اور مشقِ خیال کون کرے

یہ مضمنا میں یہ رفعتِ تنہا
ہمسرئی کمال کون کرے

(۵)

سہمی خوش منزل ک سی راگیاں ہے
میر داغ ہے شگفتہ ہر زخمِ خوبیاں ہے
میرے مذاقِ غم کی اتنی سی داستاں ہے
جاں سے قریب تر ہے نظروں کی گہلاں ہے
محبور کر دیا ہے آئینِ ماستمعی نے
نامِ دوئی مٹا دیں آؤ اسے اُٹھا دیں
میں دل سے بدگماں ہوں ل مجھ سے بدگماں
یہ وہ ہمارے جو ناواقفِ خزاں
وہ جتنا بدگماں ہو اتنا ہی ہر بات
تیری یہ بے نشانی میرے لیے نشان
ورنہ زبان میری فطرت کی راز داغ
اک پردہ محکف باقی جو دریاغ
دل دیکے کہ رہے ہیں جا اے کمالِ خستہ
وہ غم دیا ہے جس سے اک عیشِ جاوداغ

(۶)

اجلِ ہلاکِ محبت کو دیکھتی کیا ہے
کلی خوش ہے کیوں بچوں کی ہنسی کیا ہے
مرے گناہ بھی حدِ کمال تک پہنچے
کمالِ رنج و المِ زندگی کا نام سہی
اجل کا خوف بھی ہے مبتلائے درد بھی ہیں
ہماری عمر میں کتنے ہی انقلاب آئے
قریبِ جلوۂ جاناں کی اصلیت نہ سہی
فضولِ چینِ چین ہو سنا ہی کیا تم نے
نصیبِ قرب ہو اُس کا تو زندگی کیا ہے
چمنِ حرم تو ہے لیکن یہ دل لگی کیا ہے
ترے خزانہ رحمت میں اب کی کیا ہے
یہ سوچتا ہوں کہ پھر کھٹک زندگی کیا ہے
یہی ہے زینت کا سامانِ زندگی کیا ہے
مگر کھلانے یہ منشا ئے زندگی کیا ہے
کلیم یہ تو کہیں وجہِ بخود کی کیا ہے
زبانِ مکی ہے کہاں بات میں غم کی کیا ہے
کمالِ سب یہ کرتے اُس اک نگاہ کے ہیں
ہم عاشقوں کی بھلا موت و زندگی کیا ہے

(۷)

نہ دیدیں جاں اپنی حیرتِ دل دیکھنے والے
تصور میں زمین کوئے قاتل دیکھنے والے
تری نظروں میں بھی میری طرح حیرت کی دیتا ہے
نگوں سرِ سرخ ہے شمشیرِ غم ہے وہ ہیں شرمندہ
ذرا سی چھپر موقوف ہیں آبادیاں اُسکی
خدا کی شان محتاجِ نگاہِ نازِ ٹھیرے ہیں
لگا ہوں سے یہ سستی جو تحصیلِ حاصل ہے
غنیمت ہے یہی موجِ فنا دیا لے الفت ہیں
ترا شوقِ تماشہ دہرِ رسوائی نہ ہو جائے
یہ جوشِ آرزو تاکے یہ سستی جو کب تک
کمالِ خستہ جاں یوں کہتی ہے ہر ذرہ کی وسعت
رہے بیگانہ منسلِ ہی منزل دیکھنے والے

(۸)

شرکیہ غم نہ ہی غم کی رازہ دار تو ہے
گلہ طرازِ تغافل نہ ہو گا تو گرِ غم
اب اور چاہیے کیا تم کو اے نگاہِ کرم
حقیقتِ غم ہستیِ سراب ہے مانا
بس اک غش پہ دار و مدارِ زیست اگر
دفائے وعدہ فردا کا یاں سوال نہیں
ردا ہے عشق میں ہر قدم پہ اک فنِ شش
سکونِ دل نہ ہی اضطرابِ دل ہی ہی
ہنوز نگلہ عشقِ ویا س ہے باقی
دلی جواب بھی تو پھر کب پہنچے آپ کمال

جھائے دوست کے صدقے و فاشعار تو ہے
ہنوز دل کے لیے شغلِ انظار تو ہے
گناہگارِ محبت گناہگار تو ہے
نظر کے سامنے اک بحرِ بے کنار تو ہے
نہیں ہے دل تو نہ ہو جاں بے قرار تو ہے
وہ روزِ حشر ہی باعثِ قرار تو ہے
گناہگارِ سہمی کوئی پردہ دار تو ہے
کوئی فریبِ محبت کی یادگار تو ہے
خیالِ یارِ تصور سے ہمکنار تو ہے
وداعِ فصلِ خزاں آہِ ہمار تو ہے

(۹)

ہو چکا اب امتیازِ ناقص و کامل مجھے
جستجو کی شان یہ جو جذبِ دل آتا تو ہو
جادوِ صبر و رضا میں ڈگمگاتے ہیں قدم
آرزو سے دل سلامت ہے تو کچھ مشکل نہیں
اللہ اللہ کیا کرشمے ہیں نگاہِ شوق کے
رحمِ کرباںِ رحمِ کراسے یادِ جاناںِ رحمِ کرم
بنوادی عشق اب تو ہی کہیں سے ڈھونڈا
ہر قدم پر آج دھوکے دے رہا ہے دل مجھے
میں ادھر منزل کو ڈھونڈتا ہوں اُدھر منزل مجھے
جانے کیا کھجا رہا ہے آج میرا دل مجھے
مل ہی جائے گا کوئی قاتل برائے دل مجھے
ذرہ - ذرہ میں نظر آتی چاب منزل مجھے
کر چکا ہاں کر چکا ہر بادِ میرا دل مجھے
اور اک دل کی ضرورت برائے دل مجھے

میں اگر چاہوں تو اب بھی پھونک دوں دنیا کمال
لوگ سمجھے ہیں چراغِ کشتہ محفل مجھے

(۱۰)

ہلا دے عرش کی زنجیر وہ صدا ہوں میں
جوابِ ضبط میں فریادِ نارِ سا ہوں میں
امیدوارِ کرم - ناومِ خطا ہوں میں
یہ سچ سہی کہ سزاوارِ ہر سزا ہوں میں
جو خیر چاہے تو بھگو نہ پھیر لے ناصح
کچھ ادھر گی تو کہو لہلہ نیاں کب تک
بے عیب شوقِ ستم ہے عجب مذاقِ الم
کہاں یہ آنکھ تری وہ نظر کہاں زاہد
دُورِ شوق میں سرگرمی تلاش تو دیکھ
قبول ہو کے رہے جو وہ التجا ہوں میں
ہزار چپ ہوں مگر ایک ماجرا ہوں میں
فلکاتِ حسن و محبت سمجھ گیا ہوں میں
تمہاری شانِ کرم سے بھی آشنا ہوں میں
نوائے سازِ محبت کا ہمنوا ہوں میں
ہزار بار یہی قصے سن چکا ہوں میں
پھر آج رشتہ اُمید تو ٹٹا ہوں میں
نہ دیکھ مجھ کو بہت دور دیکھتا ہوں میں
حدودِ دیروِ حرم سے گزر گیا ہوں میں

نہ بوجھ مجھ سے مری وارداتِ قلبِ کمال
کہ بنوادی کے سوا سب بھلا چکا ہوں میں

(۱۱)

ہستی کل کا راز ہیں ہم لوگ
 عشق کا سوز و ساز ہیں ہم لوگ
 عشق کی خود پرستیاں توبہ
 باز کر۔ باز تیرا شیوہ ہے
 واغطا فرق کفر و دین نہ بتا
 ہم میں اور تجھ میں فرق اتنا ہے
 ہم حقیقت بھی ہیں بجا رہی ہیں
 شرح تار و نیان ہیں ہم لوگ
 بندہ بندہ ساز ہیں ہم لوگ
 فغز نے نوازیں ہم لوگ
 حسن سے بے نیاز ہیں ہم لوگ
 آج محو نیازیں ہم لوگ
 بے خود امتیاز ہیں ہم لوگ
 تو حقیقت مجاز ہیں ہم لوگ
 شرح تار و نیان ہیں ہم لوگ

ہم سے پوچھو کمال لطف فراق
 عاشقِ غمناز ہیں ہم لوگ

(۱۲)

میری الفت کی کہانی ختم ہے
 اشکِ حسرت کی روانی ختم ہے
 سامنے آن کے نہ جانے کیا ہوا
 عشق کی خاموشیوں کے سامنے
 کیا کسی نے پھر ٹکا ہیں پھر لیں
 دل کو میزے سکوں سا ہو چلا
 حسرتوں نے دل یہ قبضہ کر لیا
 عشق کی رعنائیوں کے سامنے
 اب حیاتِ جاویدانی ختم ہے
 تشنگی باقی ہے پانی ختم ہے
 بے کسے دل کی کہانی ختم ہے
 حسن کی جاویدانی ختم ہے
 یا ہم ساری زندگانی ختم ہے
 کیا بلائے ناگہانی ختم ہے
 عشق کی اب راجہ صافی ختم ہے
 حسن کا حسنِ جوانی ختم ہے

آج کیوں خاموش بیٹھے ہیں کمال
 کیا طبیعت کی روانی ختم ہے

(۱۲)

دل کو تلاش تیری میں دل کی جستجو میں
 کیا کہ دیا ہے تم نے دورانِ گنگو میں
 کہ وہ جہاں وہ چاہیں اب چمکے نہ جائیں
 حسنِ خیال ہے کیا صورتِ گری پر مائل
 لاکھوں ہی بُت تراشے اور پیر بگاڑ ڈالے
 حیرت سے دونوں عالم ہٹکے ہیں میل
 سو سوطرے ہم نے اُن کو کمال دیکھا
 سو سوطرے چپے وہ دینے رنگِ دلوں میں

(۱۳)

بلا تھاتھ تھا کیا تھادہ اندازِ فغاں میرا
 خدا جانے لیے جالتے جذبِ دل کہاں میرا
 سکون دردِ دل ایسے جس میری لاق رکھ لینا
 خرابِ جستجو کی دیکھئے تو نشانِ خود داری
 نہ دنیا میرے لائق ہے نہ میں معنی کے کا بلین
 ٹھہر جا تو ہم گلِ چادرِ کھوں کی ضرورت ہے
 کمالِ خستہ جاں گمنام تھا محرومِ شہرت تھا
 محبت نے تری روشن کیا نام و نشان میرا

(۱۴)

چلو اک محبت کی دنیا بسائیں
 وہاں مٹھیں گھٹائیں وہ ہیکیں فضائیں
 جہاں تم ہیں ہم تمہیں بھول جئائیں
 کہیں آج ایسے میں وہ آئے جئائیں
 وہی پوچھو بیٹھیں تو پھر کیا بتائیں
 محبت ہے اک رازِ سرِ بستہ لیکن

جدمر دیکھئے وہ ہی وہ جلوہ گر ہیں کہاں تک کسی سے ٹکائیں چلائیں
 تمہاری ٹکائوں کو الزام کیا دیں خطاوار ہیں خود ہمارے ٹکائیں
 محبت کو پھر نیستی آپ ملی ہے ذرا آپ پھر سو زخم گنگنائیں
 کمال اپنی فطرت سے مجبور ہیں ہم
 محبت کے نئے سنو تو سنائیں

(۱۴)

جگر کے دل دکھاتے ہوئے جی ڈرتا ہے ستم کی یاد دلاتے ہوئے جی ڈرتا ہے
 لبوں پہ آہ بھی لاتے ہوئے جی ڈرتا ہے متاعِ زیست گوانے ہوئے جی ڈرتا ہے
 ستم کی گود میں پائی ہے پرورش ہونے کرم کے ناز اٹھاتے ہوئے جی ڈرتا ہے
 فریبِ خوروہ ہستی بہک نہ جائے کہیں نقابِ زیست اٹھاتے ہوئے جی ڈرتا ہے
 غمِ فراق سے کچھ اس قدر ہوں میں مانوس ترے حضور بھی آتے ہوئے جی ڈرتا ہے
 کمال یہ بھی کوئی زندگی ہے سچ کہنا
 خود اپنے گیت بھی گاتے ہوئے جی ڈرتا ہے

(۱۵)

خودی پرست خدا آگہی کو ترسیں گے جو آج خوش ہیں وہی کل خوشی کو ترسیں گے
 خلوصِ عشق کی نعمتِ جہنم نصیب نہیں ہزار سجدے کریں بندگی کو ترسیں گے
 کسے خبر تھی کہ یہ دن بھی دیکھنا ہوں گے ہسم اپنی گزری ہوئی زندگی کو ترسیں گے
 چراغِ دیدہ و دل جو نہ کر سکے روشن جلائیں لاکھ دیئے روشنی کو ترسیں گے
 جہنم تری نگاہ ناز سے نہیں نسبت حیاتِ عشق کی زندہ دلی کو ترسیں گے

جہنمیں حمد ہے تری شاعری سے آج کمال
 خدا گواہ وہ کل شاعری کو ترسیں گے

(۱۸)

زمیں ہوگی خاک ہوگا، سماں ہوئے مکین ہو گئے
 بروزِ شتر پوشِ داوڑِ محشر، ہمیں ہو گئے
 خبر کیا تھی یہ دن بھی دیکھنا اے ہمیش ہو گئے
 غیبت ہے ہی عیدِ خزاں گلزارِ الفت میں
 تماشا دیکھنا ہے تو ہمارے دل میں آئینو
 ہمارا فیصلہ جو کچھ بھی کرنا ہے ہمیں کیسے
 لبو پٹی کے رنگی ہے بناے یکدم ہمنے
 گر وہ دن بھی آئے گا کہ جب ہم تم نہیں ہو گئے
 نہ جانے حضرت زائد کیا گوشہ لٹیں ہو گئے
 جنہیں اپنا سمجھے تھے وہ مارا ستیں ہو گئے
 بہار آتے ہی تم ہو گے کہیں ہم کہیں ہو گئے
 جہاں کے سارے ہنگامے نقیل ہو گئے
 قیامت میں ہزاروں نزاروں کتہ ہیں ہو گئے
 نہ جانے کس کس ہاتھوں میں جا آئیں ہو گئے
 درِ محبوب سے اٹھ کر کمالِ آخر کہاں جائیں
 اسی در پر انہیں ہاتھوں سے ہم زیر زمیں ہو گئے

(۱۹)

جس نے دیا ہے درد وہ خود ہی دوا کرے
 اُس دل سے کیا کہے کوئی اُس دل کا کیا کرے
 ممکن نہیں کہ شکوہ جو رجفا کرے
 دیکھو حریمِ ناز کے پردے سنبھال لو
 ہر پھول شعلہ رو ہے ہر اک خار جنگجو
 زائد خدا کے واسطے عورتی سی پی بی لے
 فکرِ غم حیات ہماری بلا کرے
 انجمِ عشق دیکھ کے جو ابتدا کرے
 دیوانہ گھر کی بات سرِ شریک کرے
 دیوانہ ہوشِ کس ہے خدا جانے کیس کرے
 گلشن پہ اپنے اپنے آئے خدا کرے
 ایسا نہ ہو کہ رحمتِ باری گلا کرے
 احساسِ زندگی جسے کچھ بھی نہ ہو کمال
 کب تک غریبِ موت کے بل پر جیا کرے

(۲۰)

سمندرِ عمر گریزاں ہے تم نہ ساتھ چلو
 حیات بے سرو سامان ہے تم نہ ساتھ چلو
 فیدِ شہرِ غمِ شاں ہے تم نہ ساتھ چلو
 دلِ غریبِ پشیاں ہے تم نہ ساتھ چلو

نظر فریب گلستاں ہے تم نہ ساتھ چلو خواں برنگ بہاراں ہے تم نہ ساتھ چلو
 دجلے کون کی کروٹ بدل کے سوجائے قیادت دلِ ناداں ہے تم نہ ساتھ چلو
 تمہارے دل میں خدا جانے کیا سا جائے
 کمال آج غزنخواں ہے تم نہ ساتھ چلو

(۲۱)

حریف گردشِ دورانِ تیر کی کچھ بھی نہیں وطن پرست مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں
 جنوں نواز گلستاں نہیں تو کچھ بھی نہیں گلوں کا چاک گریباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
 خدا کا گھر تو بسائے ہوئے ہیں شیخِ منکر نصیب قریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
 نوید وصل نہ دے اے خیالِ یار مجھے سرورِ بادہ بھجراں نہیں تو کچھ بھی نہیں
 جلائیں لاکھ دیئے بامِ دور پہ آبِ کمال
 چہرا بخارِ زیستِ فروزاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(۲۲)

مل گئے انجم و غورِ شید بہم تم نہ ملے آنکھوں ہی آنکھوں میں کائی شبِ غم تم نہ ملے
 جام و مینا ملے بھی میخانے میں جا کر پوچھا اپنی ڈوٹی ہوئی توبہ کی قسم تم نہ ملے
 دار پہ چڑھ کے بھی عیسیٰ نے پکارا تم کو پاکدامانیِ مریم کی قسم تم نہ ملے
 ایسے میں تم بھی جو ہوتے تو بہار آجاتی جام و مینا گل و بلبل ملے ہم تم نہ ملے
 ہو کے یا اوس رہِ شوق میں بیٹھے ہیں کمال
 زندگی جو گئی پابندِ الم تم نہ ملے

سید محمود حسن فیض احمدی
علی گڑھ

نسیم احمدی اور ان کی مرثیہ گوئی

مولوی سید قائم رضا نسیم احمدی سے پہلی مرثیہ انعام ۱۹۳۵ء میں ہوا۔ اُس وقت میری عمر سولہ سال کی تھی اور سید لدارس محلہ شاعت پور احمدیہ میں فنی کے درجہ میں زیر تعلیم تھا۔ یہ وہ دور تھا جب احمدیہ معزز اور اہل علم سادات کچھ کچھ بھرہوا تھا اور ہر طرف علمی و ادبی چرچے تھے۔ اسی کے متوازی سنی، شیعہ مناظرہ کا بھی دور تھا بلکہ طرف اہل سنت میں مولوی عبدالغفور فاروقی پتہ کی جامع مسجد میں ردِ ضعیف پر تقریر کرنے لگے تھے دوسری طرف جہلم کے آخری عشرہ میں، شیعہ ذاکرین خالص مناظرہ پڑھتے تھے۔ ان ذاکرین میں مولوی محمد بشیر خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ مقامی طور پر بھی اس قسم کی نوک جھونک رہتی تھی۔ چنانچہ مولوی نسیم حسن لال اور علی متقی خان میں مصدق تحریری مناظرہ رہا۔ لیکن اس سے صرف وہی حلقہ متاثر تھا جو کفر مذہبی تھا، شعروادب کے ماحول میں سب مل جل کر حصہ لیتے تھے۔ میری دلچسپی دونوں طرف کھینچا تھی، خصوصاً سید لدارس میں داخل ہونے کے بعد شعروادب کے ساتھ مجھے مذہبی ماحول بھی ملا۔ انجی اس دور ہی دلچسپی کے تحت میں ہر ادبی اور مذہبی جلسہ میں شرکت کرتا۔ اس سے مجھے بنیادی طور پر یہ فائدہ پہنچا کہ شعرو سخن کے ساتھ ساتھ میری مذہبی معلومات میں بھی اضافہ ہوا۔ اس زمانہ میں مولوی نسیم حسن لال اور ابوالقاروق سید محمد عسکری (محلہ جمعہ) مذہبی معلومات میں یدِ طولی رکھتے تھے۔ ان میں آخر الذکر کے پاس ایک کتب خانہ بھی تھا۔ ان کا واحد مشغلہ کتب بینی اور تبلیغ مذہب تھا۔ میرے لیے ان کی ذات میں کشش کا واحد سبب ان کی معلوماتی کمینیں اور کتب خانہ تھا۔ غرض کہ ان کی صحبتوں کی وجہ سے میں ادبی اور مذہبی حلقوں سے کافی قریب ہو گیا۔

مولانا محمد عبادت کلیم احمدی کو پہلی مرثیہ میں نے سید لدارس ہی میں دیکھا تھا۔ اس وقت آپ جوان العمر تھے موصوف کے وہ دلکش خدو خال ابھی تک میرے تصور میں محفوظ ہیں۔ چوڑا اور پرکشش چہرہ، اُبھرا ہوا ماتھا، جلد میں تازگی، تابناک آنکھیں، سیاہ دائرہ صحرے جو زیادہ لمبی نہ زیادہ چھوٹی بلکہ شمشیر سے کچھ زیادہ سر پر دوپٹی ٹوٹی، ڈھیلی شیریانی، چوڑی مورتی کا چادر۔ غرض کہ سر سے پاؤں تک آپ ایک جوان رضا معلوم ہوتے تھے، اس پر علم اور تقدس کا نور مزید۔ بلا قیامت آپ

اس وقت بھی تھے اور اب بھی۔ غم کو کا انداز وہی تھا جو آج بھی ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس وقت نماز میں کوڑکے اور بیل
تھے، اب فقہات ہیں۔ اور وہ بیل کے مقابلہ میں اب کھڑی سنان کے قصبہ سے ہیں۔ شمار میں بڑا زور دیتا تھا اس پر
آپ کے بڑے بھائی کا خصوصی انداز شرمیں اور نہ دیر لگتا تھا۔ اس زمانہ کے کچھ استاد ابھی تک میرے ذہن میں ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ
علامہ مکی اور وہ بھی ایک محفلِ محاضرات میں، جو حضرت امام عسکریؑ کے قریب ولایت پر مشغول تھا، آپ نے قصبہ پڑھا
کا ایک شعر لکھ پڑھا

قسم خلقِ اللہ کی دین میں ہیں ہمیں تو ہے ہے میری روح جلی میں جو رہی گشتِ تو ہے
ایک اور شعر سنئے اسے

دلِ بیکش ابھی سے مائل بدوئے ہے ساقی تو پیرِ انجمن کیا ہو گا، جو یہ آغاز ہے ساقی

اور وہ کایہ بڑا نشاط آفری دیتا تھا، جو بہت جلد ختم ہو گیا۔ اس زمانہ میں حافلِ محاضرات کا اخص معروف مقامی شہر ہے ہوتا تھا۔
ہر وہی ان کی کامیابی کے قائل ہوتے تھے۔ یہ شہر، دو گروپ میں تھے۔ ایک گروپ مولوی نسیم حسن ہلال کا دوسرا مولوی شفیق حسن
ایلیا کا۔ ہلال اور ہی کے گروہ میں شفیق بکنا مولوی اور شفیق حسن گروہ میں رکش اور وہی قابل ذکر ہیں یہ دونوں ایک دوسرے
کے رفیق تھے۔ اور پوری کوشش کے ساتھ قصبہ کہتے تھے۔ شفیق بکنا مولوی کے کام میں ملائی دولتی اور سلاست ہوتی تھی۔
بڑے کا انداز بھی بڑا اچھا تھا۔ ان کا ہر قصبہ محفل میں کامیاب ہوتا تھا۔ رکش اور وہی کے یہاں تھے، نئے، الفاظ، مضون
آزادی اور جدت ہوتی تھی۔ مگر حکم یہ دونوں شاعر خوب خوب دلوں میں عامل کرتے تھے۔ مصحف حسین نجم اور وہی اور حیات
اور وہی وغیرہ کا تعلق کسی گروہ سے نہ تھا، بلکہ خود وہ اپنی ایک منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں نجم اور وہی سحرانی، غلامی
کے اچھے فاضل، شاعر اور ادیب تھے۔ نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ تقریباً بڑی دلاویز ہوتی تھے، کاشاک
مرد کی زندگی و فکارتی توجہ ان کا شمار ہندوستان کی بلند پایہ شخصیتوں میں ہوتا۔ ان کے کچھ اشار جو میں نے مشاعروں اور نجی
نشستوں میں سنئے ہیں، اب تک یاد ہیں، لاحظہ پورے

راہی ملک عدم رہو کمال ہوتا	نجم گمبوت پہ اقام مراحل ہوتا
آرزو ہوتی کہ سر سجاد ہوتا	دل اگر حسن کے اسرار کا حال ہوتا
ضبط بھی کاشش بقدر انغم مل ہوتا	نغم و اندوہ کو پایا ہے بقدر الفت

ایک طری مشاعرہ کے دو شعر سنئے اسے

خدا نے لفظ کن کہا کرتاے دوجہاں لکھی نہ ہے حسن یہاں ہر حرف میں یک خطا لکھی

مکتبہ بن محبت کے حوالہ کی یہ حالت ہے جدھر تکلی کا رخ دیکھا جائے آئینہ مکدی
 ٹھکے لگتی ہیں ۱۲۔ جب تک محض مقاصد میں جو تفسید آپ نے بڑھاتا تھا اس کا ایک ٹھونسٹے نہ
 واہ لے دیوار کعبہ تیری شان معرفت لے لی اور بخت کو ہر کے در آغوش میں
 اسی زمانہ میں، میں نے فارسی میں ایک منزل کہی تھی جس کا مطلع ہے نہ

معا یا بچو باخود میہاں سازم ترا بگندم از دو جہاں دو جہاں سازم ترا
 یہ منزل میں کہم کے پاس بغرض اصلاح لے کر گیا، مرحوم نے چند مقامات پر یہ اصلاح دی اور مقطع کو بالکل بدل کر از سر نو لکھا
 وہ مقطع یہ ہے نہ

محمد تو محمود گر دانید مدد نہ از ازل حامداً واللہ محمود جہاں سازم ترا

میری عمر اگر یہ اس وقت بہت کم تھی مگر اپنے ہم سنوں کی بجائے میری تمام تر دلچسپیاں اسی حلقہ سے وابستہ تھیں اور یہ زیادہ
 وقت ان ہی لوگوں کی صحبت میں گزرتا تھا۔ مولوی نسیم حسن لال اور ابوالقاسم محمد مسکری علاء جعفری کو میری علمی مذاہب
 اور ادبی زندگی کی تعریفیں بہت بڑا دخل ہے۔ میری شاعرانہ صلاحیتیں اگر چہ اسی وقت سے بیدار ہو گئی تھیں جب میں مکتب میں
 پڑھتا تھا۔ مگر سید لدار میں آنے کے بعد جب میں اس حلقہ سے متعارف ہوا تو میری شاعری میں بھی لکھا ہوا پیدا ہو گیا اور
 اپنے آبائی عقاید سے بھی خوف ہو گیا جس کے نتیجے میں مجھے بڑے بڑے مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔

نسیم امر وہو کا نام ملنے بہت بچپن میں اپنے والد مرحوم مولوی سید مقبول حسن سے سنا تھا۔ یہ ان ہی کی
 روایت ہے کہ شیمیک قدرت انعم اور بدیر گوئی کا یہ عالم تھا کہ خلف اصناف سخن پر بیک وقت لوگوں کی فرمائش کے مطابق
 اشعار لاکر دیا کرتے تھے۔ مثلاً بڑیری "راہبدر میں شیم کے ہزلیات اور خوشیات پر مشکل کئی مخطوطہ جلدیں ہیں، جن
 میں شیم نے اس خاص رنگ میں خوب خوب داد بخشی دی ہے۔ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحی نے جب ان کو دیکھا تو بیت
 مخطوط ہوئے، اور عرض صاحب ناظم کتب خانہ سے فرمایا کہ ان کو بہت محفوظ رکھا جائے، اس لئے کہ اردو کی جب کوئی جامع
 لغت لکھی جائے گی تو اس کے لیے یہ ایک ماتخذ ہوگا۔ نسیم امر وہو اس وقت ایک نوجوان شاعر تھے۔ وہ اگرچہ گھنٹہ بجا بکے
 تھے تاہم امر وہو سے ان کا برابر تعلق رہتا تھا اس وقت تک میں نے عرفیتیم امر وہو کا نام نہیں سنا تھا اتفاق سے ایک دن مجھے معلوم
 ہوا کہ آج علامہ داغ غندیاں امر وہو میں نسیم اپنا مدرسہ سناٹیں گے۔ یہ آج سے اکیاون سال پہلے کی بات ہے۔ مدرسہ میں نے
 بڑی دلچسپی سے سمجھی وہ مدرسہ تھا جو بعد میں "برقی دارالان" کے نام سے چھاپا۔ اس کی ایک بیت اسی زمانہ کی تھی جو
 میرے ذہن میں محفوظ ہے نہ

زمانہ کے کچھ کا رخانے عجب ہیں ستاروں سے جگنو بہانہ طلب ہیں
 نعم جیسے کے بعد کسی بزرگ نے ان سے میرا تعارف کرایا میری عمر اس وقت اگرچہ سترہ سال سے زائد نہ تھی لیکن
 مرحوم نے مجھے اپنی خاصی تو میرے نواسہ پسر پر اب میری ان سے ملاقات ہوئی یہی میرے ادبی اور شعری ذوق سے وہ اسی وقت
 سے متاثر تھے۔ میں اگرچہ عمر میں ۱۱ سال ان سے چھوٹا تھا مگر سیدہ فحج سے دوستانہ سطح پر ملتے تھے۔ چند سال بعد یعنی ۱۹۲۹ء میں
 بزمِ حصولِ علم میں لکھنؤ چلا گیا اور شمس العلماء مولانا سید نجم الحسن کی سرپرستی میں مدرسہ تاملیہ میں داخلہ لیا۔ نیم امرہ بڑی
 اس وقت چرچہ مشہور ہائی اسکول میں فارسی کے استاد تھے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے پرانے انداز سے ہٹ کر نئے رنگ میں
 ایک مرثیہ کہا جس کا مطلع یہ ہے۔

اے انقلاب! مژدہ عزم و عمل ہے تو رنگینِ حیات کے گلشن کا پھل ہے تو
 تعمیرِ کائنات نہ صرف آج کل ہے تو آدم کو باغِ خلد کا نعم البدل ہے تو

گردشِ تبار بھی ہے یہ سیل و بہار کی

تو ہے دلیلِ ہستی پر درنگار کی

اس بند میں میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ انقلاب سے ان کی مراد کیا ہے؟ کیا صرف اس لفظ ہی کا استعمال مقصود
 ہے یا پرانی اقدار کو مٹا کر نئی اقدار کو پھیلانا یا حالات کی تبدیلی۔ سب سے پہلے تو اس میں غل نظر یہ امر ہے کہ انقلاب کسی طرح بھی
 عزم و عمل کا انقلاب کا نتیجہ سمجھا جائے تو پھر انقلاب کا محرک کیا ہوگا؟ تیسرے معرعہ میں انھوں نے انقلاب کو ”تعمیرِ کائنات“
 کہا ہے اور اس کا سلسلہ حضرت ابوالبرکات کے کر گئے ہیں۔ غالباً انھوں نے یہ معرعہ کہتے وقت یہ نہیں سوچا کہ انقلاب
 کا تعلق صرف رجبِ مسکون سے ہوتا ہے نہ کہ پوری کائنات سے، اس لئے کہ کائنات میں رُبعِ مسکون، تمام وہ عوالم بھی
 شامل ہیں، جن کی ابھی تحقیق بھی نہیں ہو سکی۔ رہا حضرت آدم کا جنت سے زمین پر آنا۔ یہ ایک قصہ ہے جو قرآن مجید اور دیگر
 کتب مقدسہ میں وارد ہوا ہے۔ اس کا تعلق بھی انقلاب سے نہیں۔ بیت میں انھوں نے گردشِ میل و بہار کو بھی انقلاب سے
 تعبیر کیا ہے اور اس کو سچی پروردگار کی دلیل بتایا ہے، لیکن انھوں نے اس حرفِ غور نہیں کیا کہ گردشِ میل و بہار یعنی سورج
 کا مشرق سے نکلنا اور مغرب میں ڈوبنا، یہ ایک سنتِ الہیہ ہے جس میں بارشِ خداوندی کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی
 ”لن تجد لسنة الله تبديلاً“ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے فرود کے مقابلہ میں ذاتِ باری پر یہی دلیل دی ہے، جس کی
 حکایت قرآن مجید نے ان الفاظ میں کی ہے ”إِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ“ (اللہ سورج کو مشرق سے
 نکالتا ہے، تو اگر خدا ہے، اس کو مغرب سے نکال کر دکھا)۔ اس سے ان کی مراد صرف یہ سمجھا کہ یہ ایک سنتِ الہیہ ہے۔

جس میں تبدیلی ناممکن ہے۔ نہ ضرور ایسا کر سکتا ہے۔

میں نے پرتھویان کی زبان سے ۱۹۳۹ء میں ناظم صاحب لکھنؤ کے ام باڑے میں سنا تھا۔ اس سے کچھ قبل جوڑی پڑاؤ اپنا مسدس "حسین اور انقلاب" اسی ام باڑے میں سنا چکے تھے۔ مدثر تالیف سے ان کا گھر اگر جگانی قاضی صاحب پڑھا کر میں برابر ان کے گھر ہمارا رہتا تھا اور کبھی کبھی ان سے مشورہ کرتا بھی رہا ہے۔ اس زمانہ میں میں نے احمد شہان کی تعویب میں ایک قصیدہ کہا ہے، جس کا مطلع ہے:

دل اگر جام خراب الفت حیدر بنے پھر جہاں ہم جھوم کر بیٹھیں وہیں کوثر بنے

اس کا دوسرا مصرعہ اصل میں کیا تھا یہ مجھے یاد نہیں، لیکن وہ نہ مجھے پسند تھا نہ نسیم کو۔ معروف قاضیوں نے طنز کر دیا۔ لیکن اس کی جگہ دوسرا مصرعہ نہیں ہو سکا تھا۔ کافی دیر تک سوچتے رہے۔ . . . بالاخر کسی فردرت سے اندر گئے، انھوں نے دیر بعد جب جاہلی آئے تو یہ مصرعہ کر گئے، "پھر جہاں ہم جھوم کر بیٹھیں وہیں کوثر بنے۔"

لکھنؤ میں قیام ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۲ء تک رہا۔ اس پانچ سال کے عرصہ میں میں نے نسیم کی زبان سے متعدد مرثیہ سے، جو وہ ناظم صاحب کے ام باڑے میں ہر سال پڑھا کرتے تھے۔ ایک مجلس میں مجھے یاد ہے کہ حضرت نجم اللہ بھی تشریف فرم تھے اور بڑی دلچسپی سے مرثیہ سن رہے تھے، کبھی کبھی ماشاء اللہ بھی کہہ دیا کرتے تھے جس پر نسیم ان کو بڑے جھک کر ادب سے آداب کرتے تھے۔

لکھنؤ کے دوران قیام نسیم نے ہر مذہبی تحریک میں بر جوش حصہ لیا۔ چنانچہ سیریزہ صد سالہ یادگار مصیبت کے موقع پر مولانا علی نقی صاحب نے جو کتاب "شہیدانِ انسانیت" تالیف فرمائی تھی۔ اس کے قابلِ ملاحظہ مقامات کی نشاندہی سب سے پہلے نسیم ہی نے کی۔ پھر کیا تھا ان کے حریفوں کے ہاتھ ایک بہانہ ہاتھ آگیا اور اس کو اتنی ہوا دی کہ ایک محدود طبقہ کے علاوہ وہ تمام شیعہ عوام میں مولانا کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ پیشہ ور ڈاکرین اور تمام ہندو اعلیٰ نے اتنی خندت سے اس کی مخالفت کی کہ عراق و ایران کے علماء رنگ سے ان پر کفر لاف قوی لگائے۔ شہیدانِ انسانیت کی اس بر جوش مخالفت نے نسیم کو نام اللہ گردہ میں بہت عزیز کر دیا جو ان کی ترقی اور شہرت میں بہت حد تک محدود موافقت ہو رہا تھا۔ اسی کے کچھ دن بعد لکھنؤ میں مدح صحابہ کی تحریک بڑی شد و غصہ اٹھی۔ سرکار برطانیہ نے شاہ ابوہریرہ جلوس مدح صحابہ نکالنے کی اجازت دے دی، اس کے خلاف شیعوں نے احتجاج کے طور پر نام اللہ اور نجم اللہ کی قیادت میں تہذیبی جلسہ شریعت کر دیا۔ یہ بھی جیسا کہ جوش کے ساتھ شروع ہوا کہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے شیعہ حضرات مدح لکھنؤ کی سرزمین پر وارد ہو گئے اور جو تہذیبی جلوس میں بھرنا شروع ہو گئے، حسینہ صاحبہ اس کام کو نہ تھا۔

وہیں سے شیعہ اپنی گرفتاری پیش کرتے تھے۔ ہم نے بھی اس موقع پر اپنے جوش اور دلول کا ثبوت دیا۔ اور اپنے کو جیل کے حوالہ کر دیا۔ لکھنؤ جیل میں قومی رہی ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ لیکن قیدیوں کا یہ قافلہ جب بنارس بھی گیا ہے تو وہاں نیزم سے میری ملاقات ہوئی۔ بنارس جیل میں ایک مشاعرہ بھی ہوا تھا، جس کا مصرعہ تھا: ”وہیں جہ کے آئی ہمارا تیرا“۔

اس پر نسیم احمد دہوی نے بھی طنز پر مبنی جوابت کا مایاب رہی۔ اس کا صرف مطلع مجھے یاد ہے۔

زباں جب ہوئی شعلہ بار تیرا بنے دونوں لب ذوالفقار تیرا

یہ ابھی پیش نتیجہ کا مایاب ہوا، اور حکومت برطانیہ کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا، اور تمام شیوخ جیلوں سے رہا کر دیے گئے۔ یہ رجب الاول کی دسویں تاریخ تھی اور سنہ ۱۳۶۰ھ۔ اس موقع پر میں نے حسب ذیل قطعہ تاریخ کہا تھا، جو اتفاق سے میرے ذہن میں محفوظ رہ گیا۔

لعل الحمد فتح شد حق را در نشاط خودی ست ہر یک گم

سال تاریخ گفت یافت غیب عید ثانی ست بعد عید نہم ۱۳۶۰ھ

اس مصرعہ سے سنہ، ہجرت اور تاریخ تفہم نکلتے ہیں۔

۱۹۴۳ء میں میں نے لکھنؤ چھوڑ دیا، اور امامیہ قیم خانہ پٹنہ ریلوڈ دہلی میں تانم دیشیت کی حیثیت سے آگیا۔ اس وقت آغا خاں احمد دہلی کلکٹر، احسن مرزا، آغا سلطان مرزا ریٹائرڈ جج مولف ”ابلاغ المبین“ وہاں کے ارباب صل و عقد میں تھے اور مولوی صغیر حسن جامع مسجد کے پیش امام۔ ڈیڑھ سال وہاں رہنے کے بعد دسمبر ۱۹۴۴ء میں میرا تقرر روضہ لاہور لائبریری راجپور میں ہو گیا، جس کا نام اُس وقت اسٹیفٹ لائبریری تھا۔ یہ نواب رضا علی خاں لاہور تھا، اور کرنل سید بشیر حسین زیدی پرائم فیسٹر تھے۔ ان کی علمی دلچسپی نے بہت سے بالکام اور اہل علم کو راجپور میں جمع کر لیا تھا۔ چنانچہ مولانا سید محمد داؤد زندگی پوری، مولانا السید محمد دہلوی، حافظ کفایت حسین، ڈاکٹر اعجاز حسین، مولانا محمد رفیع زندگی پوری اسی دور کے اعیان میں ہیں۔ میرے راجپور پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد زیدی صاحب نے نسیم احمد دہوی کو بھی مدرسہ عالیہ راجپور کے پرنسپل کی حیثیت سے بلایا۔ یہاں ان کی مرثیہ گوئی کو بہت فروغ ہوا۔ نواب رضا علی خاں اور ہرنائی نس دونوں ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ عثرہ عزم اور دیگر مختلف موقعوں پر وہ اپنے مرثیے سناتے تھے۔ راجپور میں ان کا گھر میرے گھر سے قریب ہی تھا۔ میں برابر ان کے یہاں جا کر تاکتا تھا۔ وہ بھی اکثر میرے گھر آتے رہیں، اور نجی محبتوں میں بھی انھوں نے مجھے اپنے مرثیے سناتے ہیں۔ وہ جب بھی کوئی نیا مرثیہ کہتے تھے تو میرے بڑھنے سے قبل مجھ کو مزید بتا دیا کرتے تھے۔ ان کی محبت کا اثر تھا کہ میں نے بھی رام لہر کے دور کو قیام دور مرثیے کہے۔ ان میں پہلے مرثیہ کا مطلع یہ ہے۔

اس وقت چاہے کوئی پھر تانہ انقلاب ساری ہے ذرہ ذرہ میں کثرتِ اضطراب
ہے چیزِ نغمہ ہر عامر میں تیغ و تاب برہم ہے طبعِ آتش و خاک ہو د آد آب

کرب الم سے زرد ہے چہرِ حیات کا

دھارا رواں ہے پھر کی خونیں فرات کا

غزفہ کا مچھور میں کئی سال میرا اور ان کا ساتھ رہا۔ ۱۹۵۱ء میں ریاست کے خاتمہ نے وہ بساطِ لطیف دی
اور یہ سب ہستیاں متفرق ہو گئیں۔ نسیم کچھ ناگزیر حالات کی بنا پر پاکستان چلے گئے۔ اس کے بعد گزشتہ سال، ۱۹۵۱ء
کے عزم میں فیروز پوری صاحب کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ نسیم آمد ہوئی اور وہ لائے ہوئے ہیں تو میں اسی روز علی گڑھ سے
آمد ہوئے کے لیے روانہ ہو گیا اور کئی روز وہاں رہا۔ ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴ کو مجھے علی گڑھ پہنچنا ضروری تھا۔ اس لیے ان کا
آخری مریض نہ سن سکا۔ نسیم سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔ ان کی صحت کو دیکھتے ہوئے میں یہ سوچا بھی نہیں سکتا تھا
کہ میری ان سے یہ آخری ملاقات ہے۔ کچھ ہی عرصے نہ گزرے تھے کہ ان کے انتقال کی خبر سن لی۔ خداوندِ عالم رسول اور
اہل بیت کے صلہ میں ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

یوں اجڑی احباب کی محفل کس سے پوچھیں کون کہاں ہے
نسیم کی مرثیہ گوئی :-

نسیم کی مرثیہ گوئی کا آغاز اس وقت ہوا جب یہ نغمہ معرضِ انحطاط میں تھی۔ میرا خیال تھا اور مرزا دبیر نے اس
صنفِ سخن کو جس درجہ پر پہنچا یا تھا، ان کے اخلاف نے اپنے امکان بھراس کو برقرار رکھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب
نہ ہو سکے۔ انیسویں صدی کے بعد صرف قشتق کے یہاں انیس کا زورِ کلام تھا ہے۔ ان کے بارے میں ادبا کی یہ رائے
بالکل صحیح ہے کہ میر قشتق کھنڈ کے علاوہ اگر کہیں اور پیدا ہوتے تو وہ ان دونوں بزرگوں کے مقامی قرار دیئے جاتے۔ ان
کے عین بند میں اس مقام پر پیش کرتا ہوں، جو کو پڑھ کر قشتق کی سلاستِ زبان اور زورِ کلام کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

حضرت علی اکبرؑ کے مقابلے کے لیے جو پہلوان نکلا ہے، اس کی تصویر قشتق اس طرح کھینچے ہیں :-

صورتِ ہیبت ہے سم آرد کی اس قدر دی جانگی میں کو دیکھ کے جنگل کے جولوڑ
زیرِ آفتاب ہے باندھے ہوئے مکر پیچیدہ ہے پہاڑ پہ اک اژدھا مگر

آدھے رو سیاہ کی میدان میں اس طرح

آدھی سیاہ آتی ہے جنگل میں جس طرح

ہیم اٹھ کے گرزگراں بار دیکھتا دے کرتان گرزگراں بار دیکھتا
گہ ڈاب سے نلال کے عوار دیکھتا تن تنی کے پنے سدا کوہر بار دیکھتا
اگلے بڑھا رہی ہے فضا بد شعار کو
لاستے ہیں جیسے گھیر کے زور پر شمار کو

عالموش تھے ملا جن وقت را کو س دوت ہٹ کر گئے ادھر کے پے اور ادھر کھن
اٹھتے تھے فوج میں تنق گرد ہر طرف گرا کے کشکس میں ہزاروں ہونے تلف
دیتے کسی طرف کسی جانب تبر گئے
لو کر ہم کشانوں کے شلے اتر گئے

میر تقی کے معاصرین میں ایک قابل ذکر تمام شاد عظیم آبادی کا حصہ ہے، جو ایک ہر جہت شاعر، قاضی، ادیب، اہل قلم اور نقاد ہیں۔ کے ساتھ ساتھ ایک عظیم مرثیہ گو بھی تھے۔ ان کی ولادت ۱۸۸۶ء میں ہوئی۔ اس لحاظ سے انھوں نے میر تقی اور مرزا ادیب کا آخری دور بھی دیکھا تھا اور اسی وقت سے ان کی شاعرانہ صلاحیتیں بیدار تھیں۔ چنانچہ ان کے ایک مرثیہ پر مرزا ادیب کی اصلاح بھی ہے، یا البتہ ان کے مرثیوں میں کسی مقام پر ان بزرگوں کے کلام اور ان کے مخصوص رنگ کی کوئی چھاپ نظر نہیں آتی۔ وہ اپنے طرز کے خود ہی موجد ہیں اور خود ہی خاتم ہیں، بلکہ حق یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے مرثیہ کو جس نقطہ پر لا کر چھوڑا تھا، شاد نے ان کے رنگ سے ہٹ کر اپنا ایک الگ مقام پیدا کیا۔ اس اعتبار سے وہ اپنے فن میں ایک منفرد شخصیت کے مالک ہیں۔ میرادل چاہتا تھا کہ اس عظیم مرثیہ گو کے کام کے کچھ نمونے پیش کرتا لیکن علالت کے لحاظ سے میں صرف ان کے چند بند پیش کرتا ہوں۔

صبح کے بیان میں میر تقی صرف آخر کی حیثیت رکھتے ہیں جس کی مثال اردو میں تو کیا فارسی شاعری میں بھی نہیں مل سکتی، لیکن شاد نے اس مقام کو کتنے موثر انداز میں نظم کیا ہے۔

اثر نعرہ تکبیر تھا یا باغلب غموش ہو گئے سادے پہلے تھے سلاخ غاموش
سرخ پر آ کے ہوئے مردم آبی مدہوش یک ایک تم گیا بیتے ہوئے سدا یا بھیوش

حق پرستی کا اثر چاروں طرف طاری تھا

لب پہ ہر اک کے حوالہ امد جاری تھا

ایک موقع پر فروغ محاف کے ایک پہلوان کی تصویر شاد نے کتنے دلکش انداز میں کھینچی ہے :

کم نعت آدمی ہے کہ جھگ کی اک بل سر ہے خم شراب سے بھی قطر میں بڑا
سر مست و بد قماش و بد آئین و بد جفا مندیل ہے کہ سر پہ لپیٹا ہے اڑو ہا
آہن کا خود فرق پہ خود سر ملے ہے

عزیزت اپنے سر پہ پہاڑی اٹھائے ہے

میدان جنگ میں امام حسین کی آمد کا منظر دکھاتے ہوئے کہتے ہیں :

وہ شور آمد آمد سلطان کجکلاہ اٹھ اٹھ کے زلزلات تھے درے پیاراہ

نیزے کرن کے لے کے بڑھی نذر کی سپاہ حیرا پکار کر ہوا رخصت نقیب ماہ

پھیلی ہوئی تھی بن کی ضیا کوہ نور تک

تھی چاندنی بھی ہوئی میدان میں دور تک

بہت عرصہ ہوا میں نے حبیب گنج کلکشن (مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ) کے مطبوعات میں شاعر عظیم آبادی کا ایک مثنوی دیکھا تھا، جس میں فلسفہ توحید کے فواعمق و مسائل کو اتنے دلکش اور شاعرانہ پیرایہ میں نظم کیا تھا جس کو پڑھ کر میرے اندر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اب دوبارہ میمانے پڑھنا اس کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن فہرست اتھی ناقص ہے کہ پھر کچھ کو نہ مل سکا۔

شاعر عظیم آبادی کے بعد جس کچھ مثنوی گوئیوں کے نام ملتے ہیں، مثلاً علی محمد عارف، دو بہا صاحب عروسیا اور مرزا طاہر رفیع وغیرہ، جن کے یہاں نہ زندگی کا ماحول ہے، نہ کوئی مبادی، نہ رزم نہ بزم صرف ایک مدایت کو بنا ہوا گیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ لکھنؤ میں کچھ ایسے فضلا بھی موجود تھے جو ایک عالم، خطیب، محقق اور حکم ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجہ کے شاعر اور ادیب بھی تھے، ان کے لیے عربی، فارسی، اردو و ہندو زبانوں میں شعر کہنا کوئی کمال کی بات نہ تھی۔ ان فضلا میں مفتی محمد عباس شہرستری، مولانا السید تاج محمد حسین مولف طبقات الانوار، خطیب عظیم مولانا السید سبط حسن جالوسی، مولانا محمد داؤد ننگی پوری، یہ سب وہ لوگ تھے، جن کی نظر میں شاعری ان کی علمی تربیت اور منصب کے لحاظ سے ایک ہست و حیات کی چیز تھی اور اسی لئے وہ شاعر کی حیثیت سے سامنے نہیں آئے۔ بلکہ دوروں کو شاعر بنا دیا۔ ان میں ایک مولانا السید سبط حسین وہ مہتری تھے کہ اگر کہیں وہ شاعر کی حیثیت سے سامنے آگئے ہوتے تو ہندوستان کے بڑے بڑے شعرا کا چراغ گل ہو جاتا۔ ہر سر نہا گیا لکھنؤ میں میری غالب علمی کے زمانہ تک ان کے اشعار لوگوں کو مقبول نہ تھے۔ مگر ان کے اشعار کا کوئی مجموعہ اب تک سامنے نہیں آیا۔

اسی زمانہ میں جو شائع آبادی نے اپنی نظم ”ذکر سے خطاب“ لکھی، جس کے مخاطب صرف خطیب اعظم تھے
 فوں نے سندس ہم کی شکل میں اس کا جواب بھی دیا تھا۔ مگر جو شائع کی نظم آج ہر ایک کی زبان پر ہے، ان کے جواب سے
 ناواقف نہیں۔ میر تقی میر نے وہ ”نیر میر“ لکھوئی، جو کچھ زمانہ کے لیے مرثیہ گوئی کی حیثیت سے ابھرے تھے اور لکھنؤ کی دہلی
 بھاپہ چھانگے، خطیب اعظم ہم کی دیکھا تھے، چنانچہ ان کے انتقال کے بعد ہر زندگیا بھران کا نام نہیں آیا۔ ان کے مرثیہ
 ایک بندہ سستے :-

وہ لاں بھھو کا سے ارغوانی پھول نظر کا زور بڑھاتے ہیں آسانی پھول
 ہنسائے دیتے ہیں مخبوز کو زعفرانی پھول سفید ہو گیا سبزہ کھلے جو دھانی پھول
 نظر اٹھا کے جو دیکھا تو نشہ چھا جائے
 نسیم پاس سے گزرے تو لکھ جائے

اس موقع پر یہ تاہن صافی ہو گا کہ میں مہدی نظمی کے والد بزرگوار مولانا سید املا حسین شاعر لکھنؤی کا ذکر نہ
 کروں۔ آپ عربی فارسی کے ایک جید فاضل اور اردو کے ایک بہترین انشا پرداز تھے۔ اسلامی تاریخ اور عربی ادب
 پر کمال بصیرت تھی۔ آپ ایک عرصہ تک نواب رضا علی خاں آف رامپور کے صاحب خاص رہے ہیں اور
 ریاست کے امور میں پوری طرح دخیل تھے۔ آخر میں ملازمت سے استعفیٰ ہو کر محلہ لال مسجد رامپور میں اقامت گز
 ہو گئے تھے بعد میں پھر لکھنؤ چلے گئے اور وہاں سے ہفت روزہ ”سحاب“ جاری کیا۔ اس کے کسی شمارے میں میرا
 فولاد و فقر حالات زندگی بھی شائع ہوئے تھے۔ مجھے ان کی محبت کا کافی عرصہ تک شرف حاصل رہا ہے۔ میرا یہ
 چشم دید واقعہ ہے کہ اپنے فرزند قسمی نظمی کو وہ ایک نشست میں پورا پورا مرثیہ اعلیٰ کر دیا کرتے تھے۔ یہ بندائے مکمل اور
 برتے ہوئے تھے کہ ان پر نظریاتی کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ میں نے وہ مرثیے سنے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ ان کا علمی
 و ادبی معیار کتنا بلند تھا۔ ان کے وہ مرثیے اب کہاں ہیں؟ چھپے یا نہیں؟ مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ کاش
 کہ وہ چھپ جاتے تو اردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہوتا۔

ان کی نظموں کا ایک مجموعہ ”سید گل“ کے نام سے چھپا تھا جس کا ایک نسخہ رضا لاہوری رامپور میں محفوظ
 ہے۔ میں نے رام پور کے دوران قیام اس کی ایک ایک نظم کو بڑی دلچسپی سے پڑھا ہے، اور ان کے فن شعریے پر
 حائر ہوا۔ اس کی ایک نظم سلطنت مغلیہ کے تہذیب و تمدن کے بیان میں تھی، جس کے حروف ابتدائی چار اکر مجھے یاد ہیں
 ابر قریب سیاح ہے، قصہ کوئی اس سال کہ ذکر عہد ہند کہ حالات ملک و مال کہ

تو نے چشم تر سے دیکھا ہے وہ احوال کہ
 لئے ہوائے سرد ٹھنڈی سانس میں کچھ حال کہ
 اتنی قدرت نظم اندھیر پور شاعرانہ صلاحیتوں کے باوجود وہ شاعر کی حیثیت سے متعارف نہیں ہوئے۔ نسیم احمد پوری
 کی یہ خوش قسمت تھی کہ ان فنکارانہ شاعری کا میدان چھوڑ دیا۔ اس طرح جب نسیم کی مرثیہ گوئی کی ابتدا ہوئی تو اس
 میدان میں ان کا حلیف نہ تھا۔ انھوں نے پہلا مرثیہ ۱۹۲۲ء میں نور الحسن محلہ دانشمندان اور وہیں
 پڑھا تھا۔ اس وقت ان کی عمر تاریخ فداوت کے حساب سے صرف پندرہ سال کی تھی۔ اس کے کچھ بند نمونہ کے
 طور پر پیش کرتا ہوں۔

تجہ میں لئے پانچ جہاں اب گل خوش رنگ نہیں کس روشا پر گل و بلبل میدہاں بنگ نہیں
 تن پہ کس ٹپو کے سہی کی قبائنگ نہیں طپنے ہیں دہی مٹھی کے وہ اورنگ نہیں
 آنکھ ہار صف مکتدہ بدر اٹھ جاتی ہے
 فقر کی شاہی بے ملک نظر آتی ہے

ہائے کیسی یہ ہوا میرے گلستاں میں جلی کوئی بے داغ خلونہ ہے نہ گل ہے نہ کلی
 ہر طرف بے علی، بے علی سبے علی دھوپ بھی سرد زراعی کے ہے ساپنیں و جلی
 تھا جو سراپہ اسلاف وہ سب کا آیا
 آفتاب آج ریاست کا لب بام آیا

میں ہوں یا اور جو اتان نسیم و عاتل علم و فن کے ہیں نہ طالب نہ تہرور مایل
 سب کے سب کسبِ عیشت کی حرکت کے خالق ہیں نقطہ ایک فن بے ہنری میں کا مسل

جو رگروں کے ساتھ ہوئے نر واد میں ہیں

یہ وہ مظلوم ہیں جو عدل کی اولاد میں ہیں

از رو نام و نسب ہیں تقویٰ اور تقویٰ ماشا اللہ کوئی ان میں غبی ہے نہ غوی
 جو دہت فکر کو ذہنوں سے ہے وہ ریل تقویٰ قافیہ کے لئے جس طرح ضروری ہے ریزی

کسبِ روزی کا مگر نام نہیں لینے ہیں

چیز موجود ہے اور کام نہیں لینے ہیں

قرقرات ہیں قدامت کے فلک پر سس ملں گھر کے آئے ہیں تہذیب کے بیاں ملک بادل

سجیل نے رہبر و گم گشتہ اوہم سجیل ہر قدم ایک نئی آفت ہے ذرا دیکھ کے چل

چھپ کے بیٹھا ہے حسی گتات میں غمت ترا

کہیں کانٹوں میں الجھ جائے نہ داس کا تیرا

اس سعادت کا یہ حصہ حق لا شریع قابل تسلیم ہے کہ نسیم نے یہ مرقیہ ۱۱ سال کی عمر میں منبر پر پڑھا۔ رہا یہ امر کہ یہ خود ان ہی کی فکر کی کاوش ہے یا دوسروں کی کوشش کو بھی اس میں دخل ہے۔ اس پر بحث ہو سکتی ہے، اس لیے کہ ہندو سال کی عمر ایسی عمر ہے جب کہ ابتدائی تعلیم کے مراحل بھی پوری طرح طے نہیں ہو پاتے۔ اس عمر کا لڑکا منبر پر مرقیہ کی ادائیگی تو صحیح طور پر کر سکتا ہے اور اپنی بساط کے بقدر شریعہ کر سکتا ہے لیکن اتنے چختہ اور مدہم کلام کی امید اس سے نہیں کی جاسکتی۔ اس مرقیہ کا جب ہم بغور مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں اتنی پختگی، سلاست اور روانی، نئے نئے الفاظ اور ترکیبوں کا دروبست ملتا ہے جو کسی استاد سخن ہی کے کلام میں ممکن ہے۔ ایک نو آموز لڑکا ایسا مسلح مرقیہ نہیں کر سکتا۔ اس کے پاس اگر الفاظ کا اتنا خزانہ بھی مان لیا جائے تو ان کا صحیح استعمال ادب اردو پر کمال دسترس کے بغیر ناممکن ہے۔ مذکورہ بالا چند بندوں میں آپ دیکھیں گے کہ روشنی کا استعمال، ہستی کی قبا، طے، اونٹنگ، باوصف، ٹکدر، دھوپ بھی سردرا سجدی کے ساتھ ہی ڈھلی، غوی، فلک بوس، تجدد وغیرہ۔ جتنے الفاظ ہیں اور جس سلیقہ سے ان کو نظم کیا گیا ہے۔ اس کی امید ایک ۱۱ سالہ لڑکے سے کسی طرح نہیں کی جاسکتی۔ جس نے پہلی مرتبہ اپنے آندنی کی ہو۔ خاص طور پر اس میں ”روی“ کا استعمال جاتا ہے کہ نسیم کو۔ اگر یہ ان ہی کا کہا ہوا مرقیہ ہے۔ اس عمر میں علم عروضی پر بھی دسترس حاصل تھی۔ پھر بھی اگر اس کو نسیم ہی کا نتیجہ فکرانا جائے تو پچاس سالہ شوقی کئی کے بعد ان کا مقام اس سے بہت بلند ہونا چاہیے تھا، جواب ان کو حاصل ہوا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ زیر بحث مرقیہ اور شوقی کے زمانہ کے مرقیوں میں کوئی ایسا فرق نہیں محسوس ہوتا جہاں ہم خط کھینچ کر علوہ کر سکیں۔

یہ اس خیال کی ترجمانی ہے جو نسیم کے ہاں سے کچھ ادبا میں ملتا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر نسیم نے ہندو سال کی عمر میں ایسا مرقیہ کہا تو موجب حیرت نہیں ہے، اس لیے کہ انھوں نے جب آگے کھڑی تو گھر کے باہر طرف شوقی کا حوالہ پایا۔ ان کے سامنے اپنے دادا شمیم امر جو ہی کا کلام بھی تھا اور اپنے والد کا سرمایہ سخن بھی، جس کو ہم ان کا باپ دانتہ کہہ سکتے ہیں۔ نسیم نے ۱۹۱۱ء میں قرآن ختم کیا۔ اس کے بعد ان کی اردو فارسی کی تعلیم شروع ہو گئی۔ ایک دینی پوچھتین چار سال میں اردو و فارسی میں اتنی استعداد پیدا کر سکتا ہے کہ مرقیہ کو صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے، تو کہنے کی بھی کوشش کرے گا، اور اپنی اس کوشش میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہو سکتا ہے، اس لیے میں ممکن ہے کہ یہ مرقیہ کئی سال پہلے

کی ترمیم و اصلاح کے بعد نسیم کی تخلیق ہو، خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ اس کے خلاف کوئی شہادت بھی موجود نہ ہو۔
اس مرثیہ پر میں کچھ اظہارِ خیال کرتا لیکن یہ چونکہ ان کے یوہن کا کہا ہوا ہے، اس لیے جیسا بھی ہے قابلِ داد ہے اور
شاعر کا لہذا علم ہے کہیں زیادہ ہے۔ البتہ اس کے ایک معروفِ خونِ اودام سے بربت ہے جامِ ہستی سے لہجہ افغانِ تہن
شاعر کا اور اس سے بہت کہ زندگی کے ہر شے میں اودام مسلط ہیں اور حقیقت گہ ہے، لیکن خونِ اودام کے لفظ سے اس کا غور
خاموشی کے خلفِ لفظ ہے اس لیے کہ کسی چیز کے خون ہونے کے معنی اس کے فنا ہونے کے ہیں، جیسے خونِ آرد ز خونِ تہن
و غیرہ اس معروف کو اگر اس طرح کہتے تو زیادہ مانع ہو تا۔ ”سے ہندار سے بربت ہے جامِ ہستی“
اس وقت میسور ملنے نسیم کا عرف ایک مرثیہ عقدِ حضرتِ فاطمہ بنتِ کے حال میں ہے جو -
اُن کے مرثیہ میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مرثیہ میں نے اولاً لکھنو میں اور دہلی میں خود نسیم کی زبان سے سنا ہے۔
اس میں ملک نہیں کہ یہ مرثیہ پانچ جودت، سلامت و مدانی، شکوہ الفاظ، رعایتِ فطری اور پیرایہ بیان ہر لحاظ سے ایک
ادبی تحفہ ہے۔ اس کی کچھ نمونہ بطور نمونہ حاضر خدمت کرتا ہوں :

خوہرِ فہرستِ معر، تو بیٹہ ذبحِ ہیں _____ مریم کے ایک آپ کے گیب رکھتے ہیں
زہر نے اپنی گود میں کیا لال پالے ہیں _____ منزل میں بولتے ہوئے قرآن اُتے ہیں
اہلِ فغانِ رخک سے بے موت مر گئے _____ چوہے لگی براتِ قہر سے اتر گئے
سہرا لے بہشت سے رضوان آیا ہے _____ صورت کے اشتیاق میں قرآن آیا ہے
گھر تک گئی غمی کے جوانِ باجود کی صدا _____ پردہ سے دیکھنے لگیں ازواجِ مصطفیٰ
فرحت سے بھروسے لگے اصحابِ بانفا _____ خوش آمدید کہنے لگی رحمتِ خدا

قرآن ساتھ ساتھ عقائدِ سرائی کو

خود پیشوائے خلقِ بڑھا پیشوائی کو

ان کے علاوہ اور بھی ایسے چند ہیں جن کو شاعری کا ایک اچھا نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ اس پورے مرثیہ میں نسیم
نے ہندوستانی رسوم کے مطابق جتنی عذری کی تصویر کشی کی ہے، جیسا کہ وہ کافی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اس میں وہ اپنا
دہن کے فضائل بھی ہیں، ان کے سہرے بھی، زیور بھی، جہیز کا بھی بیان، رخصتی کی تصویر، برات کی دعوت بھی، انجنازی
بھی، غرض کہ کوئی چیز اس میں ایسی نہیں جھوٹی جس کی وجہ سے مرثیہ کو نامکمل کہا جاسکے۔ ساتھ ہی نسیم کے سامنے یہ نزاکت بھی
ہے کہ یہ نہ تو کسی امیر اور رئیس کی بیوی کی نہیں ہے۔ بلکہ ایک رسولِ زادہ کی شادی ہے جس کا مسلک تھا ”افقر قریٰ“

اس لیے اسی کے الفاظ سے نریلا، جہیز مورترک و احتشام بھی دکھایا ہے جس کا مذاقہ ہے مرثیہ کو پڑھنے سے ہو سکتا ہے۔
 اس کو صوفیہ پر سب سے پہلے فریہ مرزا دیر کا ہے جو اسی کو جس ہے جس کو جس نے کہا ہے۔ دوقلم میں فرق صرف اتنا
 ہے کہ مرثیہ عروسی سے متعلق کچھ کو لازم، مرزا دیر سے چھوٹ گئے ہیں، کچھ نیم سے۔ اس کو صرف زلفی فاضل کا تھا کہ کہا جاسکتا ہے۔
 لیکن انداز دونوں کا ایک ہے، کہیں کہیں معروضوں میں بھی تو ارد ہے۔ لیکن ایسے تمام مقامات پر مرزا دیر فوقیت سے
 گئے ہیں۔ ذیل میں ان دونوں شاعروں کے کچھ ایسے مقامات پیش کرتا ہوں، جہاں انھوں نے ایک ہی مضمون کو اپنے اپنے
 قصید میں انداز میں بیان کیا ہے۔لاحظہ ہو :

مرزا دیر:

بہر فروغ سار معہ و نور بامرہ پڑھتا ہوں اور رکھتا ہوں القاب خانہ
 زہرا، بتول، فاطمہ، معصومہ، طاہرہ ام الایمہ، اشاعت، مظلومہ، صابرہ
 صدیقہ و مبارکہ و زاکیہ ہے یہ
 مرضیہ و محمدہ و راضیہ ہے یہ

نسیم:

صدیقہ و زکیہ ہے یہ فخر آسیا مرضیہ و مرضیہ و زہرا و راضیہ
 ہے مصحف حجاب و حیا نفس زاکیہ آیا ہے جن کا سورہ مريم سا حاشیہ
 معبد میں یہ صفت نہ رسول مجاز میں
 نسیم ہے بتول کی مثال نماز میں

اہل نظر سمجھ سکتے ہیں کہ مرزا دیر کے یہاں القاب کا کتنا اچھا ترادف و تقاب ہے۔ اس میں کسی مقام پر
 نقل نہیں آیا۔ بر خلاف نسیم کے کہ ان کے یہاں ایسی آمد نہیں۔ خاص طور سے نسیم کی بیت :

معبد میں یہ صفت نہ رسول مجاز میں نسیم ہے بتول کی مثال نماز میں

اس میں اولاً تو نسیم کے ساتھ بتول کا لفظ مناسب نہیں اس لیے کہ اس کی شہرت نسیم فاطمہ کے نام سے ہے نہ کہ نسیم
 بتول سے۔ یہ شعر عجیبی آسانی سے اس طرح بھی ہو سکتا تھا "نسیم فاطمہ کی ہے مثال نماز میں" اس کے علاوہ نسیم
 فاطمہ رسول اللہ کی تعلیم کردہ ایک نسیم ہے جو آپ نے اپنا بیٹا کو تعلیم کی تھی، جس کو حضرت فاطمہ کی صفت کہنا صحیح
 نہیں خصوصاً ایسی صفت جو نہ حمید میں ہے نہ رسول مجاز میں۔ دوسری بات یہ کہ نسیم فاطمہ نماز میں کسی طرح مثال نہیں

بلکہ نزلہ جہاں اور تعقیبات ہیں وہ ہیں یہ ہیں ایک تعقیب ہے۔ ہر حال اس قسم کے تسامح سے نیم کے گٹھ جوڑ دیتے ہیں۔

مرزا دبیر :-

سحاب نقشہا سے زمیں ہو جو سرفراز جھک جھک کے آسمان کریں سجدہ نیاز
گرد قدم سے روئے نیم کو فروز ہزار دامن وہ پاک جس پر حیدر چڑھیں نماز
عصمت پہ جو کہ چار گواہ بتول ہیں
وہ مصحف و حدیث و خدا و رسول ہیں

نسیم :-

حیدر کا جاننا زرد اسے بتول ہے حق کا سیفر آس پاسے بتول ہے
ام الکتاب محمد شائے بتول ہے قرآن کے شروع میں باسے بتول ہے
حیدر رسمیت فاطمہ راس الکتاب ہیں
باہیں بتول نقطہ با بوترا ب ہیں

مذکورہ بالا دونوں بندوں کے تھائی مطالعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مرزا دبیر کا پورا بند کس قدر جربہ اور حسرت ہے جس میں قلم نہیں لگایا جاسکتا۔ نسیم کے بند کا پہلا مصرعہ معنوی حیثیت سے درست نہیں۔ انھوں نے دوائے بتول کو حیدر کا جاننا کہا ہے۔ حالانکہ جاننا زرد لبوس ہوتا ہے جو صرف نماز کے لیے ایک مخصوص سائز کا تیار کیا جاتا ہے۔ برغلاف دوائے اس لئے کہ اس کا صحیح استعمال صرف اور بھنے کے لیے ہے اور عند الضرورۃ اس پر کبھی کبھی نماز بھی پڑھی جاسکتی ہے۔ لیکن اس کو جاننا نہیں کہا جاسکتا۔ مرزا دبیر نے اس کا خاص لحاظ رکھا ہے۔ انھوں نے صرف دائیں پاکی کو دکھایا ہے، اسے جاننا نہیں کہا۔

کسی خوشی خصوصاً شادی یا ہجرت کے موقعوں پر فطری طور پر ان مردہ اعزہ کی یاد آتی ہے جملہ سے خون کا لگاؤ ہوتا ہے نسیم کے مثنوی میں یہ کمی بہت نمایاں نظر آتی ہے، لیکن مرزا دبیر نے اس امر کا خاص لحاظ رکھا ہے۔ ملاحظہ ہو :

داد و پیر تو روح خدیجہ کی تھی نثار عمراں کی روح گرد ہو کے تھی بازو دار
دوہا دہن کو دیکھ کے شادان تھا کو نگار تارے اتارے جبرجہ نے حدتہ میں ایک بار

مشرق سے روحانی کی صحبت میں آئی صبح

دست نیاز میں زرد غور رشید لائی صبح

نیم کے یہاں عقل، جھوٹ اور عجز و غیور سب کا ذکر ہے لیکن حضرت ام سلمہ زوجہ رسول کو جو اس وقت بقیہ حیات تھیں، اور حضرت فاطمہؓ والدہ تھیں ان کو لگاؤ تھا، انکار انداز کر دیا ہے۔ دوسرے اس مقام سے کسی قدر کاٹنا گڑبہ ہے:

تا کہ سوار ہونے لگیں بنت شاہ دیں اٹھ اٹھ کے غافلہ کی بھونٹے لڑائی لیں

تب ام سلمہ آئیں ید اللہ کے قرین رو کر کہا کہ اے مرے والی کے ہانشیں

ہر دو غا د عدل کا تجھ پر ہے غامہ

دلوئی کیسی ہو کہ ہے بن ماں کی غافلہ

ہے ہے خدیجہ مرگئیں، دیکھا اس کا بیاہ میں ماں نہیں کینز ہوں، اس کی خدا گواہ

نادار ہوں، غریب ہوں کچھ ہو سکا نہ آہ کیسی نہ کم بہتری نہ ہر پہ تم نگاہ

بولے تجی مسلی مری آنکھوں کا نور ہے

نہ ہر اسے بھی سفارش حیدر مرزو ہے

مرزا دوسرے کا آخر الذکر بند بلاغت کلام کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ جناب ام سلمہ جن کو حضرت فاطمہ سے دارِ زہد تعلق تھا، اس موقع پر ان کے جذبات کیا ہو سکتے ہیں، جبکہ ان کی کوئی اپنی اولاد نہیں ہے اور ان کی تمام تر امیدیں اسی بیٹی سے وابستہ ہیں۔ مرزا دوسرے نے ان چار مصرعوں میں کتنی بچھاؤں کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

دوسرے مصرعہ ”میں ماں نہیں کینز ہوں اس کی خدا گواہ“ میں حضرت سیدہ کی مذہبی عظمت کو کس حد تک نمودار رکھا گیا ہے۔ یہ وہ جزئیات ہیں جن پر عام نگاہیں نہیں پہنچتیں۔ خاص طور پر بیت کے اندر جو بلاغت ہے اس کے بیان کے لیے صفحے کے صفحے درکار ہیں۔ اس میں جناب رسول خداؐ اور حضرت علیؓ کے خصوصی تعلقات کا پورا پورا موقع کھینچ دیا ہے۔ آنحضرتؐ نے ان کو باپ کی طرح پرورش کیا تھا۔ اسی اس موقع پر یہ نزاکت ان کے پیش نظر ہے، اور فرما رہے ہیں کہ اعلیٰ کا بپا زندہ نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ علیؓ کا دل ٹوٹ جائے۔ اس لیے آنحضرتؐ خود باپ کی غائبنگی کہتے ہیں، اور فرما رہے ہیں ”نہ ہر اسے بھی سفارش حیدر مرزو ہے۔“

چیز کا ذکر ان دونوں خاموشیوں نے حرف ایک ایک بند میں کیا ہے۔

مرزا دوسرے:-

دیکھو جہیز دختر سلطان انبیا پانی کے پینے کے لئے ایک مس کا بادریہ

بستر کو گنہگار پوستان اور بوریا مشکینہ پانی بھرے کو، محنت کو آسیا

ہم کا یہ چین لاکھوں کو نہ مٹا سکے

مسئلہ چیز غلط خوشی حاصل کے

نسیم :-

دیکھو ہمیں دُعا و غم سدا رہا نہیں
کل ایک مِس کا جام اور ایک پوریا

دو چادریں ہیں تاریں نظر سے جنہیں سیا
اک مشک، ایک کاسہ چوبی، اک آسیا

سب میں وہ رنگ ڈھنگ جو حق کو پسند ہیں

زیور میں صرف چاندی کے دو بازو بند ہیں

ان دو فرقہ بندی کے تقابلی مطالعہ سے اہل نظر کچھ کہتے ہیں کہ مہر عوں میں قوار د کے علاوہ حزن و دیر کے یہاں جو

سلاست اور سادگی ہے، وہ نسیم کے یہاں نہیں۔ انھوں نے اس کی میت غمزدہ بچا کر کہی ہے۔ لیکن پہلے چار مہر عوں سے

ان کا کوئی تہیں معلوم ہوتا۔ دوسرے ”رنگ ڈھنگ“ کے لفظ کا استعمال بھی اس موقع پر درست نہیں۔ اہل زبان

جانتے ہیں کہ ”رنگ ڈھنگ“ کا استعمال اردو محاورہ میں کبھی اچھے معنی میں نہیں ہوتا۔ رنگ ڈھنگ تو ایک عام

معاشرہ میں بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا سچہ جائیکہ وہ حق کو پسند ہو۔ میری رائے میں نسیم کے مرزا دیر کے بند میں جو معمولی سا

تعارف کیا ہے۔ اس سے بہتر یہ تھا کہ پورا بند ہی مجسمہ رکھ دیتے۔

ایک مقام پر ساقی نامہ میں بھی انھوں نے اس لفظ کا استعمال کیا ہے لیکن وہاں بھی اس کا عمل نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو:

ایمان کا رنگ ڈھنگ شریعت کا طور ہو
قرآن بھی شریک ہو جس میں وہ دور ہو

دبیر :- جعفر، عقیل و حمزہ کے تینوں کو علم
حاضر ہے سواری خالون محترم

چاؤمیش مفت جگر شافع ام
کہتے تھا دو بپاش فلک کو ہر اک قدم

اتنا اچھا تھا چرخ ادب سے کہ ڈر گئے

نزدیک تھا کہ چلنے میں انسان کا سر گئے

نسیم :- میکال و جبریل تھے معروف اہتمام
اک سو عقیل و حمزہ و جعفر بہ اشتہار

مسند پہ جلوہ گر تھے رسول فلک مقام
بیٹھا ہوا تھا بزم میں دلہا بستا امام

باندھا جو ہر چند درم کا رسول نے

وہ سب علی کے شیعوں کو بخشا بتول نے

اس بند میں بھی مرزا دیر نسیم سے فوقیت ملے، ہیں خاص طور سے نسیم کا بیت کا دوسرا معرکہ:

”وہ سب علی کے شعیوں کو بخفا بتولے“

ہدایت عالمیانا ہے۔ یہ بات اگر مرزا دیر یا میر غلامی کہتے تو قابل معافی تھے، لیکن نسیم کو۔ جو اردو کے نفاذ کاغذ کے دور کے شاعر ہیں، انہیں بخفا جاسکتا۔ یہ بات اگر نسیم نے کسی بنیاد پر کہی ہے تو میرا سوال یہ ہے کہ خفیہ ہونے کی حیثیت سے اس میں میرا حقد کہہ لیں۔

ترغیبی کا بیان نسیم نے کئی بندوں میں کیا ہے، مگر اس کی موثر تصویر انکھوں کے سامنے نہیں آتی، اس سلسلہ میں وہ ایک بند کہہ کر سلائی پر آجاتے ہیں، بر خلاف مرزا دیر کے، انھوں نے اس موقع کی اتنی دلکش تصویر کھینچی ہے کہ اس کی مثال میرا نسیم جیسے خدا سے سخن کہ بہاں بھی نہیں ملتی۔ ملاحظہ ہو:

پایا و دایع فاطمہ کا صبح سے پیام بیٹی سے لے کے روئے لگے سید اہام

رخصت کا فاطمہ نے کیا باپ کو سلام پھر تو جہیز گھر سے نکلنے لگا ستام

اسباب سب جہیز کا باہر دھوا گیا

رو تا ہر ایک صامعہ و خضر کو آگیا

القصد سن کے گوش اطاعت سے یہ کلام در تک جو سرو باغ نے گر کیا خرام

آکر ملا لنگہ ہوئے سرگرم اہتمام حوروں نے بندہ بست کیا ہر طرف تلام

راہ سپہر حشمت زہرا نے روک لی

آکر قنات مریم و حوائے روک لی

ستر ہزارے کے ملک جبرئیل آئے تاقہ پہ سوار سی بنت رسول لائے

در سے ہوئی بتول برآمد جو سوتھلائے دامن کے گزشتے آسمانے آئی کر ٹھلائے

سامہ زن فلیل کا دل باغ ہانے تھا

پہلوانہ یہ تھی جلوہ زہرا چراغ تھا

قدرت تھی سر پہ چتر لگائے آب و تاب ظلمت تھی فرشتہ مقدم ہاموس یو تراب

حاصل تھی ذرہ ذرہ کو معراج آفتاب تاخروں کا دور تھا کوسوں خیال و خواب

رحمت کا لمحہ لمحہ فلک سے نزول تھا

آفاق ایک نقطہ نور بتول تھا

انفرد وہ قدورہ ہو ذوق حب جس دم ہوئی سوار کب تھنہ مریجا
 سلمان کو ہمار کشی کا شرف لا تھے راس و چپ کو مور و لاکھ ہزار
 گھنٹی تھی راہ اور شرف بڑے جلتے تھے
 نسیم اور بعد اہل شرف پڑھتے جلتے تھے

میں اس مقام پر نسیم کے بند بھائی پیش کرتا، مگر اولاً تو وہ آپ حضرات کے لئے ہوئے ہیں۔ دوسرے شاعرانہ اعتبار سے بھی کوئی بند ہی نہیں، صرف غفل کو گرما سکتے ہیں۔
 بہر حال میں نے اولاً لکھنؤ اور پھر رام پور کے دو زبان قیام نسیم کے جس قدر مرتبے سنے ہیں۔ ان کو سامنے رکھ کر میر کا ایک عمومی ارادہ یہ ہے :-

۱۔ نسیم کے مرثیوں میں کہیں کہیں بڑی آمادہ سلاست، روانی اور گفتگوئی ہوتی ہے۔ مگر اس آمد میں وہ اس قدر بہ جاتے ہیں کہ شری منوی حیثیت مجروح کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا حسب ذیل بند :
 مریم بھی ان سے کم ہیں مسیم سے پوچھ لو آدھا بھی مرتبہ نہیں سارا سے پوچھ لو
 اپنوں کا ذکر کیا ہے یا اھلا سے پوچھ لو جاؤ مباہلہ میں نصاریٰ سے پوچھ لو
 زہرا سنی عورتیں ہیں زحید سے مرد ہیں
 ختم الرسل کے بعد یہ زوجین فرد ہیں

یہ بند حضرت خاتون جنت صلوٰۃ اللہ علیہا کی منقبت میں ہے۔ ان کی فضیلت اور سیدہ نسار عالمین ہونے میں کسی کو شک نہیں۔ مگر جناب مریم کا شمار بھی ان برگزیدہ خواتین میں ہے، جن کے بارے میں قرآن کی یہ نص وارد ہوئی ہے۔ "یا مریم ان الله اصطفاکہ و طہرک و اصطفاکہ علی نساء العالمین" (اے مریم اللہ نے تم کو برگزیدہ بنالیا، اور تم کو پاک و پاکیزہ بنا دیا اور تم کو عالموں کی عورتوں پر تم کو چن لیا)۔ ایسی کھلی ہوئی اور واضح نص کی موجودگی میں ان کے بارے میں یہ کہنا "مریم بھی ان سے کم ہیں مسیم سے پوچھ لو" یقیناً ایک جرات ہے پھر اسی پر وہ بس نہیں کرتے، بلکہ دوسرے معروف میں پیدائش کر کے بھی بتاتے ہیں کہ "آدھا بھی مرتبہ نہیں سارا سے پوچھ لو" یہ معروضہ نسیم نے صرف آدھا اور سارا کی رعایت لفظی کے چکر میں کھڈال اور اس کی منوی حیثیت کو نظر انداز کر بیٹھے۔

میں اس بات کو نہ شاعر کے لئے جائز سمجھتا ہوں، نہ خاک کے لئے کہ کسی کی منقبت میں اس کے منہ سے پہلو کو کیا جلتے اور ایک کو دوسرے کے مقابل میں کم یا زیادہ کہا جائے۔ کسی کی حیثیت اور اس کے مرتبہ کو تو ہمارا کام نہیں بلکہ

یہ کام صرف اللہ کا ہے۔ رسول اللہ نے حضرت علیؓ کے بیشتر فضائل بیان فرمائے ہیں۔ مگر کوئی حدیث ایسی نہیں ملے گی جس میں آپؐ نے کسی اور کو العزم یا غیر اولو العزم یا غیر کے مقابلہ میں علیؓ کو افضل قرار دیا ہے۔ حدیث قشیرہ میں بھی آپؐ نے کسی کو اثباتی پہلو سے علیؓ کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ یعنی جو چاہے کہ آدم کو ان کے علم میں، نوحؑ کو ان کے فکر میں، موسیٰؑ کو ان کی بیعت میں، عیسیٰؑ کو ان کے زہد میں دیکھے تو وہ علیؓ بن ابی طالب کے چہرہ کی طرف دیکھ لے۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ دیگر بزرگان دین کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ خود اہل بیت رسول کو ان کی بعض نہی خصوصیت کا بنا پر رسولؐ سے افضل کہا جاتا ہے مثلاً فاطمہؑ کے باپ خاتم الانبیاءؑ تھے اور رسولؐ کے باپ خاتم الانبیاء نہیں تھے۔ مجھے تسلیم ہے کہ رسول اللہؐ کے پدر گرامی خاتم النبیینؐ کے باپ فرزند تھے۔ ان کی ذات وہ منبع شرف تھی جن کے صلب سے رسولؐ پیدا ہوئے۔ اس قسم کے عناصر ہمارے ذاکرین اور علیؓ قسم کے علماء کی دین ہیں، جن کو سن کر عوام وجد کرتے ہیں۔

بہی تیر محتاط طریقہ شمس العلماء ڈیپٹی تذییر احمد کے یہاں ملتا ہے، جو کہ اشعار پر دازوں میں ایک بڑا اہم مقام رکھتے ہیں اور ایک عالم بھی ہیں، مگر محاورہ بندی کے چکر میں وہ بسا اوقات بالکل غیر محتاط ہو جاتے ہیں، اندر یہ بھول جاتے ہیں کہ کونسا محاورہ کہاں استعمال کیا جاسکتا ہے، مثلاً ”ائمہات الامہ“ میں وہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت فاطمہؑ کے اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”عائشہ اگر سیر بھر کی تھیں تو فاطمہ سوا سیر کی کہ مرتے مر گئیں اور ابو بکرؓ کیے بات تک کرنا گوارا نہ کی“ یہ محاورہ جاہل اور غیر مہذب مرد اور مورتوں کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے نہ کہ ایسے بزرگوں کے لیے جن میں ایک ماں ہے اور ایک رسولؐ نادی، یہ محاورہ صرف جاوہی ہی نہیں، بلکہ اردو ادب پر بھی ایک ظلم ہے۔

۲۔ کہیں کہیں نسیمؒ نے اپنے مخصوص عقائد کو شاعرانہ پیرایہ میں نظم کیا ہے اور خطاب دلیلوں سے ان کی حقانیت کو ثابت کیا ہے، مثلاً غیبت امام عصرؑ، حروف مقطعات کی طبع زاد تشریح، قرآنی آیات کی خطابیاتی انداز میں تشریح وغیرہ۔ دراصل یہ شاعر کا منصب نہیں ہے، بلکہ ایک متکلم اور مفسر کا منصب ہے۔ نسیمؒ کی یہ کوشش جگہ جگہ ان کے شعری محاسن میں داخل ہوئی ہے۔

۳۔ بیشتر مقامات پر نسیمؒ سے لسانی اور ادبی تسامحات بھی ہوتے ہیں۔ مثالی کے طور پر اسی مرتبہ میں ایک مقام پر وہ کہتے ہیں: ”داؤد وجد کرتے ہیں لہجہ کا ہے یہ حال“ یہاں انھوں نے توجہ اور محال کی رعایت نظر کی کو تو دیکھ لیا، لیکن دوسری طرف یہ غور نہیں کیا کہ ”لہجہ کا ہے یہ حال“ اچھے معنی میں استعمال نہیں ہوتا گویا مراد شاعر کے خلاف یہ معنی دے رہا ہے۔

اسی طرح دوسرے مقام پر وہ کہتے ہیں :

بزم طرب میں عالم بے شریک ہے وہ بھی شریک حال ہے جو لا شریک ہے
 آپ حضرات اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ "شریک حال" کا لفظ شادی اور خوشی کے موقع پر نہیں بولا جاتا، بلکہ مصیبت
 کے موقع پر یہ کہا جاتا ہے۔ میں نے نسیم کو اس وقت متوجہ کیا تھا، لیکن بزم طرب چونکہ پہلے معروف میں آچکا تھا، اس لیے
 دوسرے معروف میں بزم کا مرادف اور ہونہ لفظ وہ نہیں لاسکے، لیکن اگر اس کی تاگواری کا وہ کوئی فنڈ محسوس کرتے تو
 بیت اس طرح ہو سکتی تھی:

جشن طرب میں عالم بالا شریک ہے وہ بھی شریک بزم ہے جو لا شریک ہے
 ۲۔ نسیم کے مرافی میں رعایت لفظی اور صنعت قنص کا بہت زیادہ استعمال ملتا ہے۔ اس میں کہیں کہیں
 قرآمد ہوتی ہے، جو خوشی کی جان پیدا کر دیتی ہے، لیکن یہ رعایت لفظی، جہاں آؤر دہوتی ہے، شکر کو اس کے معیار سے
 گرا دیتی ہے، لیکن رعایت لفظی کے آگے وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے، مثلاً "تقی تانہ" میں ان کا یہ مصرعہ: "ظ
 "باغی بھی دیکھ لے تو نہ آنکھوں میں غدبو"

اس مقام پر "اولاد" تو باغی کے استعمال کا کوئی عمل ہی نہیں ہے۔ اور اگر عمل فرض بھی کر لیا جائے تو "آنکھوں میں
 خار" بالکل بے معنی ہے۔

۳۔ نسیم کسی منظر کی تصویر کشی میں عموماً ناکامیاب ہوتے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لیے نہ
 مناسب الفاظ ان کا ساتھ دیتے ہیں، نہ فکر۔ ان کی زیادہ تر کوشش رعایت لفظی تجنیس کی طرف رہتی ہے، جس سے
 عوام متاثر ہوں، اور داد زیادہ سے زیادہ ملے۔ مثال کے طور پر اس مرثیہ میں برات کی روانگی کا ایسا موقع تھا جہاں
 وہ بوسے دلکش پیرایہ میں اس کی تصویر کھینچ سکتے تھے، لیکن پہلے ہی بند میں وہ ناکام نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

لو دھوم سے جلی اسد اللہ کی برات شمعیں پکارتی تھیں یہ شب ہے شب برات
 بچے براتیوں کو جہنم سے ہے بجات ناکام حاسدوں کے لیے سوئے برات

اہل نفاق رشک سے بے موت مر گئے

چڑھنے لگی برات تو چہرے اتر گئے

اس بند میں نسیم نے خیال خود برات کے قافیہ کو چار مختلف معنی میں استعمال کیا ہے، اور نہ قافیہ کی تکرار
 لازم آتی، لیکن دراصل ایسا نہیں ہے۔ تیسرے اور چوتھے معروف میں برات بمعنی براتۃ ایک ہی معنی میں استعمال ہوا

۴۔ جہاں لفظ "برات" کی تکرار ہے یہ لفظ قافیہ نہیں رہا، بلکہ ردیف بن گیا، پھر اس طرح کی تکرار دوسرے میں جاتی نہیں۔

ہے۔ اس شخص کا نتیجہ ہوا کہ ہر اہل بند میاں فصاحت و بلاغت سے مرگیا اور حاصل تصویر بھی ابھر کر سامنے نہیں آسکی۔

اس سلسلہ کا حسب ذیل بند یقیناً قابل ستائش ہے :

والتجر چاندنی کا ہے آنکھ لے ہوئے والتین ڈالی دیے کو ہے پھل لے ہوئے

والکلیل بہر چشم ہے کا جل لے ہوئے والطور آگے آگے ہے شعل لے ہوئے

والفتح کا حضور کے بازو پہ ہاتھ ہے

والشمس پیچھے پیچھے ہے، والجم ساتھ ہے

اب میں اپنے تخلص و درست نسیم اور وہی کے لئے دعا ہے مسخورت پر اس مقالہ کو ختم کرتا ہوں۔

ڈاکٹر محمد رضوان احمد خان

ایس۔ کے۔ آر۔ کالج، بریجنگ (موئیر)

انجم شیخپوری۔ شاگرد غالب

غالبیات پر تحقیق کرنے والوں تک انجم شیخپوری سے متعلق جو اطلاعات پہنچ سکی ہیں وہ محض اتنی کہ محمد علی خان انجم ضلع موئیر قصبر شیخ پور کے رہنے والے تھے۔ ۱۲۰۸ھ میں انتقال ہوا۔ ”آہ غروب انجم“ مادہ تاریخ ہے۔ علاوہ ازیں انجم کے نمونہ کلام میں دو مختصر قطعات تاریخ دستیاب ہیں۔ جو تفتہ کی وفات پر کہے گئے تھے اور شاید ”اودھ اخبار“ میں شائع ہوئے تھے۔ مزید یہ کہ مذکورہ قطعات جہاں شائع ہوئے تھے۔ وہاں ان کے عنوان سے انجم کا شاگرد غالب ہونا ثابت نہیں ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر حنیف نقوی ریڈر شجرہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی کو الگ ”لام کی کتاب“ ”تلاذہ غالب“ (مجلع ثانی) پر تبصرہ کرتے ہوئے انجم شیخپوری سے متعلق یہ لکھنا چڑا کر :

”انجم کو غالباً بیاض“ عابر خان کے حوالے سے غالب کے شاگردوں میں شامل کیا گیا ہے اُن کے نمونہ کلام میں راقم السطور کے مضمون سے فارسی کے جو دو قطعات تاریخ نقل کئے گئے ہیں ”اودھ اخبار“ میں ان کے عنوان سے انجم کا شاگرد غالب ہونا ثابت نہیں ہوتا ہے آگے لکھتے ہیں کہ :

”محترم مصنف کے بقول انجم، ضلع موئیر (ہمارے) قصبر شیخ پور کے رہنے والے تھے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ مکلفہ محمد علی خان انجم اور محمد علی خان آجی موئیری جو بقول مصنف موئیر کے رؤساء میں سے تھے، شخص واحد ہیں۔“

لے تلاذہ غالب (مجلع ثانی) از ناک رام، ۱۹۷۳ء، سہ و سہ رسالہ دہلی اکادمی لکھنؤ شمارہ جولائی اگست ۱۹۷۳ء ص ۲۲

اول یہ عرض کر دیں کہ ایک رسالے "مقبضہ شیخ نور" نہیں "قبضہ شیخ پورہ" لکھا ہے اور یہی صحیح ہے۔ دیگر یہ کہ انجم اور
 تاجی شخص واحد نہیں ہیں کہ کوئی انجم کا تاجی بھی ممکن کرنا، کہیں سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ یہ مفروضہ ہے کہ انجم بھی رسالہ
 میں سے تھے۔ تیسری یہ بات کہ بقول حنیف نقوی "اور دعا خاں میں انجم کا شاگرد غالب ہونا ثابت نہیں ہوتا مگر
 میرے پیش نظر انجم چٹھوی کے دو منظوم رسالے ہیں جن میں سے ایک انہیں شاگرد غالب ثابت کرتا ہے یہ رسالہ "انجم
 بہ مطلع الشمس" ہے۔ جو ۱۳۸۱ھ میں "مطلع شہر لکھنؤ" سے طبع ہوا تھا۔ اس کے صفحہ ۳۴ پر غالب کا ایک قطعہ
 ہے۔ جو بطور تقریر پیش کیا ہے۔ اور جس کے ساتھ میں غالب کو "استاذی" لکھا گیا ہے۔ قطعہ سے پہلے کی پوری
 عبارت یوں ہے :

"پکیہ قلم فیض رقم وزادہ حامیہ مریم شیم جناب معلیٰ القاب الاجل الابرار والا فضل الاماک
 سلطان الشعراء ملک البلاغ قبلہ و کعبہ استاذی لوب مستطاب نجم الدولہ ویر الملک
 مرزا اسد اللہ خاں بیلار غالب جنگ مظاہر العالی کا از دست مبارک خود زیب ایں اوراق خود رو"

قطعہ یہ ہے :

زہی فسرخ و دلکش ہفت بند	کہ گزشت از ہفت چہر رخ بلند
بنائی کہ عرش است ایوان او	بنائی کہ خلد است میدان او
فرزندہ این بنائے عجب	محمد علی خان انجم لقب
بدرح علی کان بود دین من	بود ہنر بان و ہم آئین من
رک ملک او باد سیارہ بار	ہم از فائش آفریں بار بار

یہ رسالہ جہاں انجم کو شاگرد غالب ثابت کرتا ہے وہیں ان کے نمونہ کلام کا ایک معتد بہ مواد بھی فراہم کرتا ہے
 جس سے انجم کی صلاحیت شعری کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ انجم نے اس رسالے میں لا محمد کاشی کے ہفت بند
 کا نسخہ کیا ہے۔ یہ رسالہ ۱۵۵ × ۲۵ سنی میٹر کی تقطیع کے چھتیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اور مکمل ہے۔
 پہلا صفحہ سرور قلم ہے۔ دوسرے صفحہ پر غمخس کے ابتدائی تین بند ہیں۔ بعدہ صفحہ ۳ تا صفحہ ۳۳ ہر صفحہ پر پانچ پانچ بند
 ہیں۔ اس طرح بندوں کی مجموعی تعداد ایک سو اٹھاون ہے۔ صفحہ ۳۴ اور صفحہ ۳۵ پر قطعات ہیں۔ صفحہ ۳۶ پر خاتمہ
 از جانب کارگرداران مطلع ہے۔ اور یہی آخری صفحہ ہے۔

انجم نے لا محمد کاشی کے قاضی (۸۹) اشعار کو غمخس کیا ہے۔ اس حساب سے بندوں کی تعداد بھی قاضی

ہی ہونی تھی مگر ایسا ایسے نہیں ہے کہ بعض اشعار کی ایک سے زیادہ تفسیریں کی گئی ہیں۔ جن سے شاعر کی ہمت طبع اتفاقاً نکلائی کا پتہ چلتا ہے۔ ہفت بند لاکاشی کے اولین بند کا مطلع ہے۔

اسلام ای سایات خورشید بامعالمین آسمان عز و تمکین آفتاب داد و دین
انجم نے اس ایک مطلع پر محسوس کے سات بند نظم کیے ہیں۔ ابتداء کے دو بند یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔
اسلام ای مطلع اجماز را ماہ مبین اسلام ای از تو نجم شرع را نور یقین
اسلام اے پایہ ات بر تر ز جہم، یقین اسلام ای سایات خورشید بامعالمین
آسمان عز و تمکین آفتاب داد و دین

اسلام ای ظلم ایحباد را در تمین اسلام ای خاتم علم امامت را ز تمین
اسلام ای صفوا اجماز را نقش مبین اسلام ای سایات خورشید بامعالمین

آسمان عز و تمکین آفتاب داد و دین

کسی شعر کو محسوس کی شکل دینے میں عموماً یہ التزام رکھا جاتا ہے کہ اس شعر کے مصرعہ اول کے لفظ آخر کو پیش نظر رکھ کر محسوس کے تین مصرعے اسی کے ہم قافیہ موزوں کیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کے بندوں سے ظاہر ہے۔ مطلع کے مصرعہ اول کے لفظ آخر، عالمین، کی مناسبت سے اول تین مصرعوں کے قوافی مبین، یقین، تمین، تمکین وغیرہ لائے گئے ہیں۔ یوں خود لاکاشی نے بھی اپنے اس مطلع کے دوڑوں مصرعوں میں صرف قوافی ہی کے التزام پر اکتفا کیا ہے۔ مگر انجم کی جولانی طبع نہ صرف یہ کہ ایک ایک شعر پر محسوس کے کئی کئی بند نظم کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی قافیہ دردیف دونوں کی پابندیوں کے ساتھ کئی کئی بند مسلسل نظم کر جاتے کا، مفتواں بھی خاص سبب قافی سے طے کرتی نظر آتی ہے۔ لاکاشی کے بند اول ہی کا ایک شعر ہے۔

از عطائی دست فیاض تو دریا مستفیض وز دیاض نزہت طبع تو زواں خوشہ چین

انجم نے اس شعر کے مصرعہ اول کے لفظ، دریا، کو قافیہ اور لفظ، مستفیض، کو ردیف کی حیثیت دے کر بارہ مصرعے موزوں کئے ہیں۔ اس طرح اس ایک شعر پر قافیہ و ردیف کی پابندیوں کے ساتھ محسوس کے چار بند نظم کیے گئے ہیں۔ معاملہ صرف کثرت ہی کا نہیں کیفیت کا بھی ہے۔ کیفیت میں کمی ہو تو کثرت اپنا وزن کھودیتی ہے۔ انجم نے اس نکتے کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ ذیل کے بند ملاحظہ ہوں۔

از لب جان بخش تو نطق میجا مستفیض وز کف پائی منور دست موسیٰ مستفیض

خضر از سرچرخہ لطف تو شاہ مستفیض از عطای دست خیانت تو دریا مستفیض

و دریا ضیافت نرہت طبع تو ضوآن خوشتریں

ای ز خراب دست نطق خضر مستفیض کعبہ از قیوس زحی عرش معلی مستفیض

در صدف گوہرہ از فیض تو نہا مستفیض از عطای دست فیاض تو دریا مستفیض

و دریا ضیافت نرہت طبع تو ضوآن خوشتریں

آفتاب از ہر روی تو چو حباب مستفیض و ز عباد روضہ تو چشم جوڑا مستفیض

ای ز فیض عام تو ہر پست و بالا مستفیض از عطای دست فیاض تو دریا مستفیض

و دریا ضیافت نرہت طبع تو ضوآن خوشتریں

مقل کل از رای تو براوج طوبی مستفیض بوستان نیرب از تو سبز و باطن مستفیض

والم شک و تر از فیض تو شاہ مستفیض از عطای دست فیاض تو دریا مستفیض

و دریا ضیافت نرہت طبع تو ضوآن خوشتریں

ہفت بند لاکاشی کے چوتھے بند کا ایک شعر ہے ۔

گرچہ در عالم باقبال تو شاہا کردہ ام انچہ حستال کرو روزے در زمان مصطفیٰ

اس شعر کی تفسیر میں بھی قوافی و ردیف کی پابندی ملحوظ رکھی گئی ہے ۔ اور غزل کے تین بند نظم کیے گئے ہیں ۔

یہاں شاعر کی تعلی طالب توجہ ہے ۔ یہ بند دیکھئے ۔

ای باحیای مضامین کار سنی کردہ ام سرمدہ آلود زبان غامہ گویا کردہ ام

غازہ بر خضارہ سلمای معنی کردہ ام گرچہ در عالم باقبال تو شاہا کردہ ام

انچہ حستال کرو روزے در زمان مصطفیٰ

خامہ در خون مگر ترک کردہ انشا کردہ ام بس نفسہا سوختہ این شمش بیدا کردہ ام

مرفد رحمت دودہ داغ سوید اکردہ ام بسکہ در عالم باقبال تو شاہا کردہ ام

انچہ حستال کرو روزے در زمان مصطفیٰ

نکر را ضوآن طبع غلہ مانا کردہ ام کلک خود را ہضم فیض مرغ طوبی کردہ ام

صفیرہ را گیس بگلندی انشا کردہ ام گرچہ در عالم باقبال تو شاہا کردہ ام

انچہ حستال کرو روزے در زمان مصطفیٰ

غالب نے کہا تھا۔

ملتی جو نہیں راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور
انجم شاگرد غالب نے اس کا ملکی مظاہرہ یوں کیا کہ قوافی و ردیف دونوں کی قید جہاں لگائی وہاں طبیعت کو
اور بھی "دعاں" پایا۔ ملاکشی کے چہ بن کا مطلع ہے ۔

ایکہ فرمان قضا موقوف فرمان شماست دور دوران فلک دوری ز دوران شماست
اس مطلع پر تلافیہ ردیف کی پابندیوں کے ساتھ انجم نے غمخس کے پانچ بند نظم کیے ہیں۔ ہر باتین
معروضوں کے بعد مطلع کے دونوں مصرعے دوہرائے جلتے ہیں۔ مگر تازی میں فزق نہیں آتا۔ ذیل کے بند دیکھئے۔
ایک از عرش بریں بالاتر ایوان شماست عقل کا جاوید کش می کال دہان شماست
حرف زان ہر روز ز ودیوار در شان شماست ایک فرمان قضا موقوف فرمان شماست
دور دوران فلک دوری ز دوران شماست

مہر انور مجرہ گردوں قلمدان شماست ماہ مہر کہکشاں فلک ز دانشان شماست
لوح اعظم تختہ مشق دبستان شماست ایک فرمان قضا موقوف فرمان شماست
دور دوران فلک دوری ز دوران شماست

مصطفیٰ جان شہادتی نگہبان شماست ہر چہ ناممکن بود ممکن باسکان شماست
جملہ احکام قدر جاری ز دیوان شماست ایک فرمان قضا موقوف فرمان شماست
دور دوران فلک دوری ز دوران شماست

ایک حل مشکلات خلق از شان شماست مامن طفل و جوان و پیر ایوان شماست
روز مقرر دست ہر شیعہ بدایان شماست ایک فرمان قضا موقوف فرمان شماست
دور دوران فلک دوری ز دوران شماست

ایک روشن آفتاب از شمع ایوان شماست واژگوار پشت سپہر از بار احسان شماست
ماہ تاملی بایں مطلع ثناخوان شماست ایک فرمان قضا موقوف فرمان شماست
دور دوران فلک دوری ز دوران شماست

یہاں یہ ظاہر اس کی ضرورت نہیں تھی کہ انجم کے کلام سے اتنے سارے بند نو نے کے طور پر نقل کیے جاتے۔

مگر کلامِ نجم حکمِ محققین کی ہدایت کے پیش نظر اس کی ضرورت محسوس کی گئی۔ یوں بھی اس کی حیثیت اب غلطیوں سے
کی ہے۔ مقلع کا بند عام ہدایت کے خلاف ترتیب میں آخری نہیں ہے بلکہ آخری بند سے پہلے وضع کیا گیا ہے
اور یوں ہے۔

انجم بد اخستہ بد بخت بد کردار آہ دار از اعمال بد دست خود فرسایہ
چند باشی داخل از مابند گن غنواہ بندہ بیچارہ کا شمی از دل و جان کل ماہ
روز شب در خطہ اکل غنا و خان شامت

اس بند کے بعد جس کے مزید کسی بند وضع ہوئے ہیں وہ یہاں سے کیسے ہاں بند ہی اس سلسلے
کی آخری کڑی ہے۔ بند یہ ہے۔

مرزا طوبی ہم آخسریں صد آخسریں کا شمنیم با شتم از زوار تولے شاہ دین
مصل با قضا موت روز واپسین زائران رو ضرات را برد و غلہ بریں

میر سدا آواز طبعتم فا ظلوا با ف الدین

یہ رسالہ انجم سے متعلق ہماری معلومات میں یہ اضافہ بھی کرنا چاہیے کہ ان کے والد کا نام مصاحب حسین خاں تھا، وہ
بھی شاعر تھے۔ عدلِ مخلص کرتے تھے۔ اور اس رسالے کی طباعت کے وقت بقید حیات نہیں تھے۔ نیز یہ کہ
انجم ۱۲۸۱ھ میں ساکن قزوین آباد تھے یعنی اس وقت تک وہ شیخو رومی نہیں حسین آبادی تھے۔ یہ اطلاعات
ہمیں سرورق کی عبارت سے ملتی ہیں۔ پوری عبارت حسب ذیل ہے :

بافضالِ ربِّ الشَّرقین امدادِ صالح القمرین : نسخہ ہفت بندہ محمد کا شمی من تضمین سرورقِ مصاحب
فصاحت و سادہ ارباب بلاغت محمد علی خان صاحب انجم ابن المرحوم المبرور جناب مصاحب خان صاحب حضور
مخلص بعد ساکن قزوین آباد مخلص موکبر موسوم بہ مطلع الشمسین در ۱۲۸۱ھ بمغایت صحت و نہایت لطافت
و ترتیب الفاظ و تزیین اوراق حسن کی کشف و کفایت حق و علی مرزا لطف علی عرف قاضی صاحب سلمہ اندک
در مطلع شہر نکھو زویر طبع پرشید۔

علاوہ ازیں صفحہ ۱۱۷ پر جو قطعات ہیں ان سے بھی بعض دلچسپ اور اہم معلومات سامنے
آتی ہیں ان قطعات میں اول غالب کا وہ قطعہ ہے جس کا ذکر کیا جا چکا ہے اس کے بعد دو قطعات مرزا

لے حسین آبادی شیخو سے دیکھ کر ایک نسل کے قطعہ پر آباد ہے (روزنامہ)

ذریعہ تعلیم کے ہیں۔ چوتھا اور آخری قطعہ مرزا دبیر کے شاگرد صاحب شیخ بہادر حسین دہلوی کا ہے۔ قدیم کا ایک قطعہ تاریخ طباعت سے تعلق رکھتا ہے، اور دوسرا تاریخ تصنیف سے۔ اول الذکر سنہ ہجری بتاتا ہے۔ اور آخری الذکر سنہ مسوی و عمید کا قطعہ تاریخ طباعت سے تعلق رکھتا ہے اور سنہ ہجری بتاتا ہے۔ تحقیق کے نقطہ نظر سے چونکہ یہ قطعات بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ لہذا انہیں یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ قدیم کے قطعات سے پہلے یہ عبارت ہے۔

• قطعہ تاریخ از المصنف لوزی سخن فہم معنی شناس جناب مولوی مرزا دیر علی صاحب مخلص

بقدم پہلا قطعہ مرزا دبیر مشتمل ہے۔ اور یہ ہے :

جناب محمد علی خان انجم	کر زری فلک نیست ہتائے او کس
چنان شمسہ بفت بند او نمود	کر شد شور شاہ اش تاج رخ اطلس
قدیم از پئی سال چوں گشتہ جو یا	قلم ز در قسم ہفت بند مخمس
دوسرا قطعہ چار اشعار پر مشتمل ہے۔ اور یہ ہے :	

محمد علی خان انجم لقب	خردمند اقبال مندار جہند
نمودند تضمینیں اس ہفت بند	کہ لڑائی کا شش رقم کردہ اند
چوتھا شیخ از سالہائے مسیح	بس از ختم از شاہراں خواستند
بطرح یک ارشاد کردہ قدیم	کہ نادر شد اس شمسہ ہفت بند

اس قطعہ میں مصرعہ تاریخ کے کل اعداد ۱۸۹۱ء ہوتے ہیں۔ جن میں لفظ "یک" کے ۲۰ عدد گنٹانے سے سنہ تصنیف ۱۸۹۱ء برآمد ہوتا ہے۔ اس سنہ عیسوی کی مطابقت ۷۷۷-۱۲۶۷ سنہ ہجری سے ہوتی ہے۔ گویا یہ رسالہ طباعت سے چار پانچ سال پہلے تصنیف ہوا تھا۔ وحید کے قطعہ سے پہلے یہ عبارت ہے :

• قطعہ تاریخ از نتائج افکار فصاحت آثار بیری عن کل الشیخ مولوی شیخ بہادر حسین مصنف

بصفات جمید تلخیص ماس جناب مرزا دبیر سید الشہداء القدریہ۔

قطعہ چہ اشعار پر مشتمل ہے۔ اور یہ ہے :

محمد علی خان انجم مخلص	چو خورشید نامی امیر زمن شد
سندان ستور سخن سچ کامل	یز فکر رسا آسمان سخن شد
ریاض و گلستان طبعی طبعی	شمس بہر بلخ چون سخن شد

بگزار کاشی گل آلود تازہ
نہر جان لونی بہار چمن شد
پسند آمدہ بلبلان چمن را
حُطّ کلاش پیروی چمن شد
صبا خواند تاریخ گلزار گمش
ز نرسین گشن ترین چمن شد

مغفور علیؒ پر خاتمہ از جانب کارگزاران مطلع کے زیر عنوان یہ عبارت ہے :

”المنّت لئلاّ کہ دریں زمان یہ منعت تو امان نسو بہفت بندین کلام قلم کا شعی علیہ الرحمۃ
والاکرام موصوعہ ہای نصیحت جناب مستغنی عن الانقلاب خاندان صاحب سپہر مرتبت خورشید شہادت
امیران امیر شاعر بنی نظیر گوہر درج سخن گسری اختر برج ہنر پردے یکداز مضار شیریں نیا بی شہو
میدان خوش بیانی و الادب عالی خاندان محمد علی خان صاحب المتصل بہ انجم دام اقبالہم
بحسب فراتش جناب ممدوح و نیز بہ تحریک تقدس لب فضیلت اقبال زبیر دسادہ
شریعت زینت یکہ طریقت مجبی ملسم ایمان مائی لازم طغیان دعائم استوار کاغذ دین مبین
گل شاخار شرع متین مولوی حسن مرزا صاحب پیش نماز خلف الصدق جناب مولوی مرزا
مہدی صاحب مدرس میروا بن جناب مرزا علی صاحب صالح مغفور بذات محبت نہایت
لطافت در مطلع لکھنؤ زیور طبع پوشید۔“

اس عبارت کے نیچے حاشیہ پر ترجمہ میں خاں ۱۲۸۱ھ کی مہر ہے۔ جس کی دائیں جانب قلم سے یہ عبارت
ہے۔ ”عنایتیں جناب امو محمد علی خاں صاحب“ اس سے ظاہر ہے کہ ترجمہ میں خاں انجم کے جملہ نچے تھے۔ جنہیں نسخہ
انجم نے عنایت کیا تھا۔

مطلع انجمین نام کا ایک اور رسالہ میرے علم میں ہے۔ جسے مرزا محمد ذکی علی خان ذکی نے نثر میں لکھا تھا۔
اور جو مطلع جعفری لکھنؤ سے ۱۲۰۶ھ میں شائع ہوا تھا۔ یہ رسالہ صرف آٹھ صفحات پر مشتمل ہے اور خدا بخش لائبریری
کے دسینہ سکشن میں موجود ہے۔ انجم کا رسالہ خدا بخش لائبریری کے ذخیرہ کتب میں نہیں ہے اور گمان اغلب ہے
کہ اب اس کے نسخے نایاب ہیں۔ ایک ہی نام کے ان دونوں رسالوں میں نام کے سوا موضوع یا مواد کسی بھی اعتبار
سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔

انجم کا دوسرا رسالہ ”گوہر منظوم“ ہے اس کی تقطیع بھی وہی ہے جو اول الذکر کی ہے۔ صفحات کی تعداد صرف

مشکوٰۃ ہے یہ رسالہ بھی مکمل ہے۔ گو کہ منظوم شاعری کا نام ہے۔ جس سے ۱۳۶۷ ہجری بمقام قتلہ ہے۔ اور جس میں ایک عدد کم کر دینے سے اس رسالے کا سال تصنیف ۱۳۶۶ ہجری حاصل ہوتا ہے۔ گو یا یہ رسالہ اول الذکر سے دس گیارہ سال پہلے تصنیف ہوا۔ مگر طباعت اس کی بھی ۱۳۶۷ ہجری میں ہوئی۔ خود انجمن نے اس رسالے کی آخری تین آیات میں اس کا سال تصنیف سنہ ہجری و فصلی و عیسوی تینوں میں نظم کیا ہے۔ یہ رسالہ مطبع خاص منشی نوکشتہ میں چھاپا گیا ہے۔ اس کی فنی ہیئت مثنوی کی ہے۔ اور موضوع علم منطق ہے۔ سرورق کی جلالت یہ ہے:

مہم و سپاس و شکر بلے قیاس نہایت انسان را سزا است کہ رسالہ رافعہ و عجلہ فائزہ و علم
منطق برای افادہ طلبہ علوم کے ہو کہ منظوم ۱۲۸۱ ہجری از تصنیفات جناب مستطاب رفیع
الامکان و عظیم الشان راس و رئیس مردم محمد علی خان صاحب متخلص باغیچہ در مطبع خاص منشی
نوکشتہ زبور مطبع بقامت موزوں آراستہ

صفحات کی تفصیل یوں ہے کہ صفحہ اول سرورق ہے۔ دوسرے صفحہ پر برکت کے خیال سے سلطان العلماء، مولانا سید محمد کے دستخط و مہر کی نقل ہے۔ جنہوں نے بعد تصنیف اس رسالہ کو ملاحظہ فرمایا، پسندیدگی ظاہر کی اور اپنے دستخط و مہر سے اسے مزین کیا تھا۔ صفحہ ۱۵ رسالے کا متن ہے جو مختلف عنوانات کے تحت دوسو اکیس اشعار پر مشتمل ہے تفصیل حسب ذیل ہے (توسیع میں دیئے ہوئے اعداد آیات کی تعداد ظاہر کرتے ہیں)۔

حمد (۵)، نعت (۷)، حال مصنف (۴)، اور تعریف علم منطق (۹)، در بیان عقول عشرہ (۵)، فصل در لفظ (۹)، فصل در مرکب و مفرد (۳۵)، فصل در مفہومات مفرد (۲۲)، فصل در قول شارح (۱۳)، فصل در بیان قضایا (۹)، فصل در تقسیم قضیہ بہ ہجرت و سلب (۸)، تقسیم شرطیہ بر دو قسم (۱۰)، فصل در بیان تناقض (۵)، فصل در بیان شروط ثنائیہ (۴)، فصل در بیان عکس مستوی (۵)، فصل در بیان قیاس (۹)، فائدہ (۲۴)، طریق انتاج قیاس استثنائی (۳۱)، (جملہ دوسو اکیس آیات)۔

نمونہ کلام کے طور پر حمد و نعت کے اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

حمد ایندہ دراکم در شکرش زبان	لال باشد لب معطل از بیان
کہ او گنجد نہ ہرگز در قیاس	فکر باشد در ریش علمت اساس
منطق ان بان جو صفیش بیکس	طبع در انشائے مدح او عقیم
نیست دانش را بران احتیاج	در صفاتش کی تن قضیہ رواج
ذات اور اکثیت وحدت عرض خاک	یافتہ حکمت بذاتش اختصام

نعت

نعت احمد نیز آمد فرض عین بعد تحمید خدا کے مشرقین
فرض شد تصدیق امرش برانام واجب ست اتباع ہمیش لاکلام
شد مقدم نور او بر ہمکسار گرچہ بود آس تالی پیغمبران
آسمان موضوع بہر آنجناب کار او محمول بر خیر و ثواب
وامنش ماراست منشور نجات عاصیاں را ذات او سورجات
رسم دیں بگرفت از سعیش نمود وصف او باشد ز حد عقل دور
پس سلام از من الی یوم النشاد بر نبی و آلہ الامجاد باد

بعدہ "حال مصنف" میں ذیل کی چار ابیات ہیں۔

اولیں نام محمد پس علی نام امیں گم نام کردہ منجلی
در حسین آباد باشد مولد مولد م نیک ست گریہ من بد
چوں کشائی چشم بر اشعار من یاد کن نام مرا از پیچمن
پس دعای خیر کن عیم مجو زانکہ ہستم کم سواد ای نیکو

عقول عشرہ کی تفصیل یہ بتائی گئی ہے۔

عقل باشد جو ہر بے مادہ مقترن بامادہ گاہی شدہ
آں وہ انواع ست پس اقسامیں میکنم تشریح اسے در خمیں
عقل اول عقل ناقص ای ہما نوع ثالثہ را مرکب گشت نام
عقل فصال و مجرور عقل کل عقل جزو و شہم معاد سٹا بل
ہم بود عقل معاش و ہم بسیط یاد کن بر علم تا باشی محیط

"طریق امتاج قیاس استثنائی" کے تحت اکتیس ابیات ہیں۔ آخری سات ابیات یہاں نقل

کی جاتی ہیں۔ ان میں اول دو کا تعلق نفس موضوع سے ہے۔ ایک بیت مقطع کی ہے۔ پھر ایک دعائیہ ہے اور آخری تین بیٹوں میں اس رسالے کے سنن تصنیف بہ لحاظ ہجری و قمری و عیسوی نظم ہوئے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

چون بیدم اسب حقوش جبار
مفتشش این اسب باشد راہلہ
پس قیاس انوی بنا سازی اگر
مفتشش راکن تامل خوب تر
اصطلاح منطق انہم نظم کرد
مبتدی را تا نگردد رنج و درد
باور افضل خدای ذی الکرام
ایں رسالہ لپیستہ خاص دعا
گوسر منقوس شد نامشش رقم
سال بجزی نیز یک ساتھی حکم
سال فصلی شد زہدی اعتذار
چوں کئی بر عکس معضلی قاعدہ
عیسوی نظم کشاں انفایدہ

انہی اشعار پر اس رسالے کا اختتام ہوتا ہے۔ آخری صفحہ ۱۶ پر مرزا ذریعہ علی قدیم کے تین قطعات تاریخ ہیں جن میں اول سولہ اشعار پر مشتمل ہے اور رسالے کی تاریخ تصنیف سے متعلق ہے۔ بقیہ دو قطعات چار چار مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ اور حاشیہ پر درج ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق تاریخ طباعت سے ہے۔ قطعہ اول اہم ہے لہذا یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

رفیع مرتبہ علیٰ نژاد والا جہا
قر رکاب ثیا محل سپہر خیام
زاسم سہای مدوح میکنم آگاہ
رئیس عصر محمد علی بلند مقام
زہی امیر کبیر یک دولت و اقبال
قویہ منشئ ستارہ قبول کنیز غلام
شجاعت و کرم و عدل تم بر ذاتش
کمینہ ستم و کسری و حاتم از غلام
زمین از زمین قدم سر بر آسمان سایہ
سپہر مرد در دولت خمیدہ ہر سلام
حکیم و منطقہ و غوی و ریاضی دہان
فقیہ و متقی و عارف ملال و عرام
ذکی و شام و ذی عقل و خوشنویسین
ہنرور و مخلص بانجم آں مقام
بزرگوار خدایا بلطف و رافت بخش
ببخش در راحت و آرام و شادام
نگاہدار مراد را تو از حوادث دہر
بعز و جاہ محمد و اہل بیت کرام
بیاں مشتقت اذنا کجا کئی مداح
عنان تو سن خامہ بتاج بی کرام
بعد فصاحت الفاظ و فن و منطق
رسالہ کہ رسد نفع آں بنجامن بجا
نکو تر از شعر ای گذشتہ و موجود
نمود نظم مع الاستدہ بحسن نظام
جناب مجتہد العصر قبلہ و کعبہ
چو استماع نمود از شروع تا انجام

پسند خاطر قدسی مناظر شش گردید
رسید صیت مضامین انگوش قدیم
چو سال ختم ز ہجرت ترا بود مظلوم
بہر دستخط خاص کرد زیب تمام
چنانچہ فائدہ برداشتہ بدق تمام
بگور سالہ پسند دل خواص و عوام

اس قطعہ کے فوراً بعد اس رسالے کا تتمہ ہے جو صرف دو سطروں میں ہے۔ اور یہ ہے :

تمام شد ایں رسالہ فائدہ من تصانیف محمد علی انجم بن المرحوم المہر جنت مکان مصاحب
حسین خاں مغفور غفرلہ لہما و ستر عیوبہما ساکن موضع حسین آباد ضلع مونگیر۔

اس رسالے کے اقتباسات سے پتہ چلا کہ محمد علی خان انجم فتح المکان، عظیم الشان، راس و رئیس مردم تھے۔ عالی زاد و بالا جاہ بھی تھے۔ شجاعت و کرم و عدل میں بھی یکساں تھے۔ زمانہ تھے۔ علاوہ ازیں انہیں حکمت فلسفہ نور یا مخفی فقہ و معرفت اور زہد و اتقا سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ ذہن و ذکاوت و ذوق شعری کی نعمتوں سے بھی قدرت نے نوازا تھا۔ نیز خوش نویس کی مشق میں انہیں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ اس رسالے کی تصنیف کے وقت (۱۲۶۶ھ مطابق ۱۸۵۱ء) تک غالباً وہ غالب کے حلقہ تلامذہ میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ ورنہ یہ رسالہ بھی رسالہ اول الذکر کی طرح خدمت استاد میں ضرور پیش ہوتا۔ اور جس طرح یہ اپنے صفحہ پانچہم تا ہجرت العہد العصر سلطان العلماء سید محمد بن المرحوم سید ولید علی کی خدمت میں پیش کیے جانے اور شرف قبولیت و پسندیدگی حاصل کرنے کی شہادت دستخط و ہر کی شکل میں رکھتا ہے۔ ویسی ہی کوئی شہادت خدمت استاد میں پیش کی بھی ضرور ہوتی۔ جیسی کہ ”مطلع الشمسین“ میں موجود ہے۔ دیگر یہ کہ کار گزاران مطبع، قطعہ نگار شعراء، غالب تا وحید اور خود مصنف سب نے انجم تخلص ہونے کی تصدیق تو کی ہے۔ تاہم تخلص کرنے کا ذکر کسی نے نہیں کیا ہے۔ یوں لفظ ”نامی“ وحید نے اپنے قطعہ کے پہلے شعر کے مصرعہ ثانی میں استعمال ضرور کیا ہے (ع: چو خورشید نامی امیر زمن شد) مگر بہ حیثیت ایک لفظاً بمعنی کے نہ کہ بہ حیثیت تخلص کے۔ غالب، قدیم اور وحید کے یہ قطعات شاید ان کے فنیہ کلام میں بھی موجود نہیں ہیں۔ کیونکہ اگر ایسا نہیں ہے تو انجم اور کلام انجم سے متعلق معلومات کا یہ قوطیوں ہے، اگر مزایہ قیاس صحیح ہے اور گمان غالب یہی ہے کہ صحیح ہے تو یہ بات بھی اہم ہے کہ یہ رسالے ان شعراء کے مذکورہ قطعات کی بازیافت کا ذریعہ بھی بنے ہیں۔

گوہر منظوم نام کا ایک رسالہ خدا بخش لاہوری کے دینہ کشن میں ۱۳۴۹ نمبر پر موجود ہے۔ اور اتفاق سے اس کا شاعر بھی مخلص بہ انجم ہی ہے۔ مگر دراصل یہ انجم شیخو روی کا رسالہ گوہر منظوم نہیں ہے۔

انجم شہزادی کے متصور چار دہائیوں سے لے کر آج تک محمد علی صاحب دارالاستاذ اسلامیہ ہائی اسکول شہنشاہی کالے
 جو انجم کی مگلی بہن امای بیگم کے انتقال میں ہیں ان کا مکان شہنشاہی کے محلہ بابولی پڑ ہے۔ جس کے سامنے ایک
 چھوٹا ٹالاب ہے۔ اسی کے بجائیک مسجد انہوں نے مجھے بتلایا کہ یہ مسجد امای بیگم صاحبہ ہی نے بنوائی تھی۔
 جس کے صحن میں وہ خود عین کے بجائے انجم شہنشاہی کا دوسرا محلہ خاندان محمدیہ میں قبریں کھدی ہیں۔ اور
 کتبہ نہیں ہے۔ انجم کے دو لڑے اسلئے ان کا اولاد مسکن حسین آباد بتاتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ ان رسالہ کی
 طباعت یعنی ۱۹۸۱ء تک انہوں نے شہنشاہی میں سکونت اختیار نہیں کی تھی۔ وہ شہنشاہی کالے ہی رہے؟ اس کا
 تعین فی الوقت مشکل ہے۔

مسئلہ ارتقا سے متعلق اقبال اور آزاد کی تحقیق

اقبال نے حیات اور تہذیبی زندگی کی ارتقا پذیری کے مسئلہ پر نہ کوئی بسوط مقالہ لکھا ہے اور نہ کوئی کتاب۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ سائنسی انداز بیان میں اسلامی افکار دینی کی ازسرفو شیرازہ بندی کریں کیونکہ مفکرین اسلام خواہ متکلمین ہوں خواہ تصوفین ان کی منطقی اصطلاحیں اب ناقابل فہم ہو چکی ہیں۔ اسی مقصدی کاوش کے نتیجہ میں انہوں نے سات خطے سپروٹلم کیے اور ۱۹۲۹ء میں The Reconstruction of religious thought in Islam کے عنوان سے انھیں شائع بھی کیا اور ہندستان کی بعض یونیورسٹیوں میں طلباء کی جماعت کے سامنے انھیں پڑھ کر بھی سنایا۔ ساری بحثیں نظری بنیادوں پر ہیں اور ہر جہد یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھیں اختیاری میزان پر پرکھا نہیں جاسکتا پھر بھی بدیہی اور اختیاری حقیقتوں کی مماثلت پر اپنے نظریات کی ترجمانی کر کے وہ فلسفہ کوٹ آئیں کا روپ عطا کرتے ہیں۔

اپنی بحث کے آغاز سے پہلے ہم یہ جان لیں کہ اقبال کی نظر میں قرآن کی کیا اہمیت ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

(۱)

”تاریخ اسلام میں فلسفہ یونان کو ایک عظیم ثقافتی درجہ حاصل تھا۔ تاہم فلسفہ یونان سے متاثر ہو کر مسالک دینیہ کے جو مختلف مکاتب فکر عالم وجود میں

تسے ان کے مطالعہ کے ساتھ قرآن مجید کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ اہم حقیقت کھل جاتی ہے کہ ایک طرف یزانی فتنہ کی بدولت متفکرین اسلام کے مطلع نظر میں کافی وسعت ہوتی تو دوسری طرف برحیث مجموعی قرآن مجید کے مطالعہ میں کافی نگاہوں کو بصیرت نہیں مل سکتی:

اے مل جل کر وہ کہتے ہیں کہ قرآن اور اک بالحواس کی اہمیت کو تسلیم کر لے مگر:

(۲)

”اس کو عہد قدیم میں مسلمانوں کا ذی علم طبقہ کلاسیکی طرز فکر کے ظلمات میں گرفتار ہو کر بالکل محو نظر کر گیا تھا۔ ان لوگوں کو یہ سمجھنے میں دو سو برسوں سے زیادہ لگا اور پھر بھی واضح طور پر نہیں سمجھ سکے کہ قرآن کا مزاج کلاسیکی تصورات کے بالکل منافی ہے۔“

اقبال ہاں تک کہتے ہیں کہ جلد علوم قرآن کی کسوٹی پر پرکھے جاسکتے ہیں لیکن قرآن کو کسی میزان پر پیش نہیں کیا جاسکتا۔ ایک دوسرے سوال کا حل بھی کر دیا جائے کہ کیا اقبال کلاسیکی طرز فکر کے مقابلہ میں سائنسی واقفیت کو صداقت بکنا سمجھتے ہیں۔ انھیں کے لفظوں میں:

(۳)

”اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ سائنس کے نظریات کی ترکیب میں قابل اعتماد علم ہے کیونکہ ان کی تصدیق کی جاسکتی ہے اور ان سے فطرت کے وقائع کے بارے میں پیشین گوئی کرنے اور انھیں ستر کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں بھولنا نہیں چاہیے کہ جو سائنس کہلاتا ہے وہ فطرت کا کوئی واحد منظم تصور نہیں رکھتا۔ یہ تو ایک متجزئی تصور حقیقت کا انبار ہے یعنی تجربہ کی کلیت کے منتشر ٹکڑے ہیں جن میں ایک میں جوڑنا محال ہے... دراصل مختلف فطری سائنس بہتیرے گدھوں کے جیسے ہیں جو فطرت کے مردہ جسم پر ٹوٹے پڑتے ہیں اور ہر ایک اس کے جسم کا ایک ٹوٹھرا لے کر بھاگ جاتا ہے... وہ تصورات کہ جن میں ہم تنظیم علم کے عمل میں استعمال کرتے ہیں وہ کردار میں تجزی، ہیں اور ان کا اطلاق تجربہ کے جس معیار پر بھی کیا جا

اضافی ہوتا ہے۔

ان اقتباسات سے واضح ہو گیا کہ اقبال سائنسی حقیقت کی تلمیحات کے قائل تھے اور مذہبی حقیقت کو حقیقت کا بھی انکشاف نہ کھتے تھے اس سے یہ نہیں سمجھا جا سکے کہ اقبال کا یہ نقطہ نظر غیر عمومی ہے اور اس خیال کا اظہار صرف زمان کی اہلیت کے لیے سائنسی مطالعہ کے ناشیغی بخش ہونے کی وجہ سے ہوا ہے۔

انیسویں صدی کے علم الہیات کے ماہرین نے برف کی چٹانوں کے نیچے جبے ہوئے جانوروں اور پودوں کے سڑے گئے ڈھانچوں کے پیش نظر ارتقار حیات کا تصور پیش کیا جسے علم الہیات کے ماہرین نے سماجی زندگی سے وابستہ کر کے ایک ایسا نظریہ قائم کیا جو وحشی قبائل کے طرز حیات، مذہبی تصورات و ہم دگمان کی روشنی میں بنتے روپے پیش ہوا اور بالآخر علم الانسان کے مطالعہ میں اسے تاریخی شواہد کی حیثیت عطا کر دی گئی۔ اقبال ان مفکرین میں سے ہیں جنہیں سلسلہ ارتقار سے خصوصی دلچسپی ہے۔ ہم یہاں پر ان کے نقطہ نظر کو پانچ ابواب میں تقسیم کر دیتے ہیں:

- ۱۔ قرآنی تعلیم ارتقار کے خلاف نہیں ہے۔
- ۲۔ تصور ارتقا موجودہ سائنس کا انکشاف نہیں ہے بلکہ بہت پہلے ہی مسلم مفکرین نے قرآن کی روشنی میں ارتقار کے تصور پر غور و فکر کیا ہے اور اس کی تائید کی ہے۔
- ۳۔ مذہبی تصورات ارتقائی روش کے انداز میں ترقی پذیر ہوتے رہے ہیں۔
- ۴۔ اسلامی تصور ارتقار اور سائنسی تصور ارتقار میں اتنا فرق ہے کہ اہل الذکر مرنے کے بعد بھی مزید ارتقار کی نشاندہی کرتا ہے جبکہ سائنسی ارتقار موجودہ حیات کو ہی ارتقار کی آخری کڑی مان کر انسان کو یاسیت میں مبتلا کر دیتا ہے۔
- ۵۔ اسلام میں ختم رسالت کا تصور بھی ارتقائے انسانی کی ایک کڑی ہے۔ آنحضرت کی بعثت کے بعد چونکہ انسانیت طفولیت سے نکل کر بلوغ کی حد میں داخل ہو گئی اس لیے اس کی تہذیب کے لیے نئے پیغمبر کے آنے کی ضرورت نہیں رہی۔

پہلی بات کہ قرآن ارتقار کے خلاف نہیں ہے اس کے لیے وہ دو دلیلیں دیتے ہیں:

الف - "کائنات ایک آزاد تخلیقی حرکت پذیری ہے۔"

(۵)

ب۔ "زندگی کی حقیقی کلیت ایک طرح کی وحدت ہے جو ایک طرح سے کثرت بھی ہے اپنے ماحول کے مطابق نمود پذیری اور اس سے مطابقت پیدا کرنے کے سارے متعدد طریقوں میں ... زندگی ایسی روش سے متصف ہوئی ہے ... جس کی کارکردگی کے اخذات کی تشریح ایک بعید ترین مافی کے بغیر نہیں کی جاسکتی۔ اس کی آفرینش کی تلاش ایک روحانی حقیقت میں کی جانی چاہیے اس سے یہ معلوم ہو جلتے گا کہ زندگی طبعی اور کیمیاوی طریقوں کے دستور العمل سے بنیادی اور مقدم ہے۔ انیس ایک قسم کی ایسی متعینہ روش سمجھنی چاہیے جو ارتقاء کے طویل دور میں رو پذیر ہوئی ہے۔"

(۶)

"قرآن کی روشنی میں آدمی زمین پر کوئی اجنبی نہیں ہے ... مجھے ایسا لگتا ہے کہ قرآن کے بیان میں جنت ایک قدیمی حالت کا تصور ہے جس میں آدمی طبعی طور اپنے ماحول سے غیر متعلق رہتا تھا اور بطور نتیجہ اسے انسانی احتیاج کی کلفت کا احساس نہیں تھا اور نہ ہی اسی کا پیدا ہو جانا انسانی تمدن کے نقطہ آغاز کا موجب ہو گیا۔"

(۷)

"اب ہمیں معلوم ہو گیا کہ قرآن کے مہبوط آدم کے روایتی قصہ کا آدمی کے سیارہ ارضی پر بطور اول سے کوئی فاسطہ نہیں ہے۔ بجائے اس کے اس کا مقصد وجدانی خواہش کی ابتدائی حالت سے انسان کے شعوری طور پر اس آزاد خودی کو اختیار کر لینے کی طرف اشارہ کرنا ہے جو ہم و گمان اور نافرمانی کی اہلیت سے آراستہ ہے۔"

دوسری بات یہ ہے کہ مسلم مفکرین نے تصور ارتقاء سے متعلق انکشافات کیے ہیں اس کا ذکر دو جگہوں پر کرتے ہیں :

(الف) 'جائزہ' (متوفی ۱۲۵۵ھ) نے سب سے پہلے بتلایا کہ امام طوہر پر نقل مکانی اور
 احوال کے اثر سے حیوانی زندگی میں تغیر واقع ہو سکتا ہے۔ بعد میں وہ دعوت جو انھوں نے
 کہلائی ہے اس نے جائزہ کے تصورات کی مزید تفصیل پیش کی لیکن ابن سکویہ (متوفی
 ۱۳۲۱ھ) ہی اولین مسلم مفکر تھا جس نے واضح اور بہت معنوں میں بالکل عصر حاضر کے
 جیسا آفرینش آدمی سے متعلق ایک نظریہ پیش کیا۔ یہ بالکل قدرتی بات تھی اور بالکل
 روح قرآنی کے مطابق کہ رومی نے ابدیت کے مسئلہ کو حیاتی ارتقا کا ایک مسئلہ قرار
 دیا اور اسے ایک عقدہ نہیں رہنے دیا کہ خالص مابعد الطبیعیاتی طریقوں کی بحث سے
 جیسا کہ مسلم مفکرین کا خیال تھا۔ اس کا حل ڈھونڈا جائے۔۔۔ مولانا روم کے اچوتے
 اشعار کا ترجمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے :

سب سے پہلے انسان غیر نای اشیل کے مجبور کے بطور ظاہر ہوا، پھر اس
 سے وہ پودوں کی زندگی میں منتقل ہو گیا۔ برسوں وہ ایک پودے کی اتد رہا، اسے
 غیر نای زندگی جو اس حالت سے مختلف تھی یاد نہیں رہی اور جب وہ نباتی زندگی سے
 حیوانی حالت میں منتقل ہوا تو اسے اپنے پودے کی حالت یاد نہیں رہی سوائے اس میلان
 کے جو اس کے اندر نباتات کی طرف ہوتی ہے۔ بالخصوص موسم بہار میں اور جب خوش
 رنگ پھول کھلتے ہیں۔ اس کی مثال افعال شیر خوار کے ماؤں کی طرف میلان سے دی
 جاسکتی ہے کہ وہ اس کا سبب نہیں جانتے کہ ماں کے صحنوں کی طرف ان کا میلان کیوں
 ہے۔ پھر نباتی اُبگر نے جیسا کہ ہمیں معلوم ہے آدمی کو حیوانی زندگی سے انسانی حیثیت
 میں کھینچ لیا۔ چنانچہ آدمی فطرت کے ایک نظام سے دوسرے نظام میں گزر گیا۔ یہاں تک
 کہ اب ماقبل دوانا اور توانا ہو گیا۔ اپنی پہلی زندگی کی اسے اب کوئی یاد نہیں۔ اس
 موجودہ زندگی سے بھی وہ تبدیلی اختیار کرے گا۔

(ب) ایک دوسرے خط میں فرماتے ہیں:۔۔۔۔۔

• جس زمانہ میں علم یا عقل سے متعلق اسلامی منکر پروان چڑھ رہی تھی انہیں
دنوں تصور ارتقا کی بہ تدریج تشکیل ہونے لگی تھی۔ سب سے پہلے حافظ نے یہ شاہدہ
کیا کہ نقل مکانی سے چڑیوں کی زندگی میں تبدیلی آجاتی ہے۔ بعد میں ابن مسکویہ نے جو
ابیرونی کا ہم عصر تھا اس تصور کو زیادہ متعین طریقہ کی صورت میں پیش کیا اور اسے اپنی
دینیات کی کتاب الفوائد الاغفر میں شامل کیا۔ میں یہاں پر اس کے تصور ارتقا کی
تفصیل اس کی سائنسی قدر جاننے کے لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کی فکری
روش پر ایک روشنی پڑتی ہے، نقل کرنا ہوں :

ابن مسکویہ کا خیال ہے کہ ارتقا کی پست ترین سطح پر بناتی زندگی کی نمود و
افراش کے لیے بیج کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کی جنم بجوں کے ذریعہ تھیں
جاودانی پاتی ہے۔ اس قسم کی بناتی زندگی اور معدنیات میں اتنا ہی فرق ہے کہ اس میں
نور اسی حرکت آجاتی ہے جو اعلیٰ قسم کی بناتی زندگی میں زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے، اور
آگے چل کر اپنی نمود اس طرح کرتی ہے کہ پودا اپنی شاخیں پھیلا دیتا ہے اور بیجوں
کے ذریعہ اپنے نوع کو دوائی تسلسل عطا کرتا ہے۔ حرکت پذیری کی قوت مزید بڑھتی
ہی جاتی ہے تا آنکہ ایسے اشعار پیدا ہوتے ہیں جن میں تپ، پتیاں اور پھل ہوتے
ہیں۔ ارتقا کی اعلیٰ سطح پر اس قسم کی بناتی زندگی پیدا ہوتی ہے جسے اپنے نشوونما کے
لیے بہتر مٹی اور بہتر آب و ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ ارتقا کی آخری سطح پر کھجور اور
کھجور نمودار ہوتے ہیں جن کا مقام یوں سمجھیے گویا حیوانی زندگی کی دہلیز پر ہے۔ کھجور
میں جنم کے واضح امتیازات نمایاں ہو جاتے ہیں۔ جڑ اور بیٹے کے علاوہ اس میں بعض
ایسی چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں جو حیوانی دماغ کا اثر رکھتی ہیں۔ اس کی سالمیت پر کھجور
کی زندگی کا مدار ہے۔ یہ بناتی زندگی کے ارتقا کی اعلیٰ ترین سطح ہے اور یہی حیوانی زندگی
کی تہید ہے۔ حیوانی زندگی کا آگے کی طرف سب سے پہلا قدم زمین پر سستی سے نجات
پانے میں ہے اور اسی میں شعوری حرکت کی اہلیت ہے۔ حیوانیت کے ابتدائی مرحلہ میں
قوت لاسر کو اولیت ہے اور قوت باصرہ کی نمود سب سے اخیر میں ہوتی ہے۔ حواس کی

نمودے جو ان کو آزادی رفتار حاصل ہوتی ہے۔ کیسے، رہنمائی ملے، جانور، چوہیاں اور مکھیاں اس کی مثالیں ہیں۔ حیوانیت چارپائے میں گھٹے میں درجہ کمال کو پہنچتی ہے اور چڑیوں میں شاہین میں، اور بالآخر بن مانس میں انسانیت کی سرحد پر پہنچ جاتی ہے کہ یہ میزان ارتقا میں انسان سے صرف ایک درجہ کمتر ہے۔ آگے چل کر ارتقا کچھ ضمیاتی تغیر پیدا کرتا ہے جس سے قوت تمیز اور روحانیت کی ترقی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان دور وحشت سے دور تہذیب میں داخل ہو جاتا ہے۔

تیسری بات مذہبی تصورات کی ارتقائی روش سے متعلق ہے۔ اقبال ان نقطوں میں اپنے نظریہ کی وضاحت کرتے ہیں :

(۱۰)

”اجالی طرز پر مذہبی زندگی کی تقسیم تین ادوار میں کی جاسکتی ہے۔ ان ادوار کا ذکر ایمان، نیکو اور انکشاف کے طور پر کیا جاسکتا ہے۔ مذہبی زندگی کے پہلے دور کی نمود اس طرح کے آداب میں ہوتی ہے جسے فرویا پوری قوم کو ایک غیر مشروط حکم کی طرح اس حکم کے بنیادی مفہوم و مقصود کو سمجھے بغیر ماننا لازم آتا ہے کسی قوم کی سماجی اور سیاسی تاریخ میں ممکن ہے کہ اس رویے سے بڑے بڑے نتائج نکلنا ہوے ہوں، لیکن جہاں تک کسی فرد کے اندرونی نشوونما اور دست پذیری کا تعلق ہے، یہ کوئی زیادہ نتیجہ خیز نہیں ہوتا۔ ان آداب کے سلسلے بہ تمام و کمال تسلیم ختم کر دینے کے بعد ان آداب اور اس کے اقدار کے حقیقی آغاز کی عقلی تقسیم کا دور آتا ہے اس دور میں مذہبی زندگی ایک تسکیم یا بعد الطبیعیات میں، یعنی عالم کے ایسے مستحکم منطقی تصور میں جس میں خدا کا اثبات اس تصور کا ایک حصہ ہو، اپنی بنیاد تلاش کرتی ہے۔ تیسرے دور میں یا بعد الطبیعیات کی جگہ نفسیات لے لیتی ہے اور مذہبی زندگی میں حقیقت مطلقہ سے براہ راست وابستگی پیدا کرنے کا حوصلہ پروان چڑھنے لگتا ہے۔ یہاں پہنچ کر مذہب کا ساحل ارتقا طوع پر حیات و قدرت کو جذب کر لینے کا ہو جاتا ہے اور فرد کو قانون کی گرفت سے اپنے آپ کو رہا کر کے نہیں بلکہ اپنے شعور کی گہرائیوں کے اندر قانون کے بنیادی

آئندہ کا انکشاف کر کے، ایک آزاد شخصیت حاصل ہو جاتی ہے۔

چونکہ بات اسلامی تصور ارتقاء اور انسانی تصور ارتقاء میں ربا نیت اور باسیت کے فرق کا جو ذکر انبیاؑ نے کیا ہے اس کے لیے دوسری بات کے الفاظ کے لیے جو اقباس صفحہ ۱۲۱ سے دیئے گئے ہیں وہیں اس پر اگر اگراف کی سولہویں سطر سے پچیسویں سطر تک کی عبارت ملاحظہ کریں۔

پانچویں بات یہ کہ ختم رسالت ارتقاء انسانی کی ایک کڑی ہے اس کے سلسلہ میں یہ اعتبار پیش کرنا ہوں :

(۱۱)

”قرآن میں جس طرح وحی کا لفظ آیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہر چند ارتقاء حیات کے مختلف مراحل میں اس کی نوعیت و اہمیت مختلف ہوتی ہے، قرآن اس کو عبادت کا ایک وصف مشترک مانتا ہے۔ نباتات کا فضا میں آزاد ہونے کے ساتھ بڑھنا، کسی جانور میں کسی نئے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے کسی نئے معنوی کاروبار کا پانا اور کسی آدمی کا اپنے باطنی انوار سے منور ہونا، یہ سبھی وحی کے احوال ہیں جن کی نوعیت طالب یاہں سے طالب وابستہ ہے اس جنس کی مزدورتوں کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔ انسانیت کی طغویت میں اس توانائی و جدان نفس (Psychic Energy) کا فروغ ہوتا ہے جسے ہم شعور نبوت کہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی وضع ہے جو فصلے، انتخابات اور عمل کی راہوں کے یقین میں بنا بنایا (Readymade) وسیلہ مہیا کر کے انفرادی نمکرو انتخاب کی زحمت سے نجات دلاتی ہے۔ لیکن عقل اور تنقیدی صلاحیتوں کے فروغ کے ساتھ ہی زندگی نے، اپنے مفاد کے پیش نظر، ان بے پروا خورد و خوراک شعور یعنی توانائی و جدان نفسی کی تشکیل و نشوونما کو جس کی انسانی ارتقاء کے اولین مراحل میں عام روش تھی، اپنے اوپر حرام کر لیا۔ ... اس امر کو اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو لگتا ہے کہ پیغمبر اسلام کا مقام عہد باستان اور عہد حاضر کے وسط میں ہے۔ جہاں تک آپ کے الہام کے سرچشمہ کا تعلق ہے یہ باستانی عہد سے وابستہ ہے اور جہاں تک آپ کے الہام کی اصلیت کا تعلق ہے۔ یہ عصر حاضر سے وابستہ ہے۔ آپ کی خات کی بدولت زندگی

کچھ ایسے دوسرے ذرائع علمی کا اکتشاف کرنے لگی جو اس کی نئی ہدایت کو اس آسکے۔
 ... اسلام کا انھوں نے اتھرائی فکر کا تصور ہے۔ اسلام میں نبوت درجہ کمال کو پہنچ جاتی ہے
 اسی سے ختم نبوت کا انداز میاں ہو جاتا ہے۔ اس میں یہ شدید احساس شامل ہے کہ حیات
 کو بیش کچھ پتلیوں کا نالچ نہیں بنایا جاسکتا۔ تاکہ آدمی اپنے ذاتی شعور کی بھرپور تکمیل
 کر سکے یہ ضروری ہی تھا کہ اسے خود اس کے دستِ مئل کی طرف منتقل کیا جائے۔ ...
 لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اہل معرفت کے اکتشافات جو اپنی خاصیت کے اعتبار سے
 نبی کے ابہام سے مختلف نہیں ہوتے ان کا وجود بھی ایک زندہ حقیقت کی طرح نہیں ہو سکتا۔

اب ہمارے پیش نظر مولانا آزاد کا ترجمان القرآن ہے۔ اس کی تالیف کی تاریخ ۱۰ جولائی
 ۱۹۳۲ء لکھی گئی ہے یعنی اقبال کے خطبات اور آزاد کی تفسیر کی تدوین میں بہت کم مدت کا نام لیا ہے۔
 دونوں کتابوں کے مندرجہ شہود پر لکھنے سے پہلے جنگ عظیم اول ختم ہو چکی تھی۔ انسانی کوششوں نے اپنی کئی
 تہذیبوں کے پس ماندہ نقوش کو زمین کی گہرائیوں سے کھود نکالا تھا اور ۱۹۱۲ء تک انسانی فکر و تقاضا
 تصورات میں ٹانگ ٹوٹیاں کھانے کے بجائے حقایق کا مشاہدہ کر کے انسانی وجود کی دیرپائی کا اعتراف
 نکار رہا تھا۔ اب انسان پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ ہم اپنے سال و ماہ کے انداز سے وجود کی حقیقت کی
 بے پایاں کو سمجھ نہیں سکتے۔ قرآن کریم نے تو پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ :

وان یوما عند ربک کالغفلة سنة مما تعدون ۷

خدا کی ایک دن انسانی حساب کے ایک ہزار برس کے جیسا ہے۔ اقبال کو قرآن کی اس واضح حقیقت کا
 عرفان ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۶۔ پھر بھی وہ عراقی کے بارے میں لکھتے ہیں :

(۱۲)

• دوسرا سامان صوفی، متفکر اور شاعر عراقی ہے جو نظماہائے سکانی و
 زمانہ کی کثرت کا ذکر کرتا ہے اور خدائی زمان و خدائی مکان کی بات کرتا ہے۔ یہ
 ہو سکتا ہے کہ جسے ہم خارجی دنیا کہتے ہیں وہ صرف ایک عقلی ڈھانچہ ہو اور یہ کہ وہ
 تجرؤ کے اند بھی ملارج ہوں جو دوسرے نظماہائے زمان و مکان سے منسلک ہو
 سکتے ہوں یعنی کچھ ایسے ملارج ہوں جن میں تصور و تجرؤ ایک ہی کردار ادا کرتے

ہوں جیسا کہ پہلے مادی تجربہ کے معاملے میں کہتے ہیں:-

میرے پیش نظر جو ترجمان القرآن کا نسخہ ہے اسے تک عمر شفیق مالک مطبع مصطفائی نے کو اپریٹو کیپٹل پرنٹنگ پریس لاہور سے شائع کیا تھا۔ اس کے طبع ثانی کا دیباچہ ۷ فروری ۱۹۲۵ء میں لکھا گیا تھا۔ طبع اول کے دیباچہ پر ۱۶ نومبر ۱۹۲۳ء کی تاریخ ہے لیکن آٹھویں صفحہ پر لکھتے ہیں ۲۰ جولائی ۱۹۲۰ء کو آخری سورت کے ترجمہ و تفسیر سے فارغ ہو گیا۔

(۱۳)

”قرآن اور صفات الہی کا تصور کے عنوان کے تحت کوئی گیارہ صفحوں پر مشتمل مولانا آزاد کا وہ مقالہ ہے جس کا تعلق مسئلہ ارتقا سے ہے۔ شروع کے چار صفحوں میں انہوں نے مذہب ارتقا سے متعلق مختلف مکاتیب فکر کا اجمالی خاکہ پیش کیا ہے۔ یہ خاکے یوں تو نہایت ہی مختصر ہیں لیکن ہر مکتبہ فکر کے تصورات کا پتہ دیتے ہیں۔ آئندہ تین صفحات میں مذہب ارتقا کا خاتمہ اور زمانہ حال کی تحقیقات کا خلاصہ پیش کرتے ہیں اور پھر قدیم ترین تہذیبوں کی مذہبی بنیادوں کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ انبال کے تصور کا وہ حصہ ہے جس نے یہاں قیسری بات کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ آزاد کی تحقیق کی روشنی میں سراسر بے بنیاد ثابت ہو رہا ہے مولانا آزاد لکھتے ہیں:

(۱۴)

”اگر خدائے تصور میں وحدت کا تصور انسانی دماغ کا بلند تر تصور ہے اور اشراک و تعدد کے تصورات پچھلے درجہ کے تصورات ہیں تو ہمیں اس نتیجہ تک پہنچنا پڑے گا کہ یہاں ابتدائی کڑی جو نمایاں ہوئی، وہ پچھلے درجہ کی نہ تھی، اونچے درجہ کی تھی، اور اس کے بعد جو کڑیاں ابھریں انہوں نے بلندی کی جگہ پستی کی طرف رخ کیا، مگر ارتقا کا عام قانون یہاں بے اثر ہو گیا۔ ترقی کی جگہ رجعت اصل کام کرنے لگی۔“

اب یہاں پر یہ بات بھی قابلِ ملاحظہ ہے کہ مولانا کا دماغ بھی عصری اثرات سے فارغ نہیں تھا۔ وہ مانتے ہیں کہ ارتقائی نظریہ ذات الہ کے اعتقاد میں نہیں بلکہ اس کی صفات کے تصورات کے مطالعہ میں

(۱۵)

”انبیائے کرامؑ کی دعوت کی ایک بنیادی اصل یہ رہی ہے کہ انہوں نے ہمیشہ خدا پرستی کی تعلیم ویسی ہی شکل و اسلوب میں دی، جیسی شکل و اسلوب کے فہم و تحمل کی استعداد مخاطبوں میں پیدا ہو گئی تھی وہ جمع انسانی کے علم و مرئی تھے اور معلم کا فرض یہ ہے کہ متعلموں میں جس درجہ کی استعداد پائی جائے اسی درجہ کا سبق بھی دے۔ پس انبیاء کرامؑ نے بھی وقتاً فوقتاً خدا کی صفات کے لیے جو پیرایہ تعلیم اختیار کیا وہ اس سلسلہ ارتقاء سے باہر نہ تھا بلکہ اس کی مختلف کڑیاں مہیا کرتا رہا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ آزاد قرآنی آیات سے اپنے اس خیال کی تائید کے بجائے تردید کی راہ ہی ہموار کرتے ہیں :

سنۃ من قد ارسلنا قلوبا من رسلناو
لا تجد لسننا خفیلا۔ ۷۷ : ۱۷
اے پیغمبرؐ تم سے پہلے جن رسولوں کو ہم نے بھیجا
ہے ان کے لیے ہماری سنت ہی رہی ہے اور
ہماری سنت کبھی ملنے والی نہیں ہے۔

شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا والذی
اوحینا الیک وما وحنینا بہ اسماعیلیم
وموسیٰ وعیسیٰ ان اقموا الدین ولا
تفرقوا حنیہ۔ ۱۳ : ۴۲
اور دیکھو اسل نے تمہارے لیے دین کی وہی
راہ ٹھہرائی ہے جس کی وصیت نوحؑ کو کی گئی تھی اور
اور جس پر چلنے کا ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو حکم
دیا کہ الدین کو قائم رکھو اور اس راہ میں الگ الگ
نہ چھو جاؤ۔

ارتقاء کے تصور کو شروع شروع میں پٹ اور سے ڈھاکا جانے والی گرینڈ ٹرنک روڈ کی طرح
ایک سہاٹ خط مستقیم کے طور پر مان لیا گیا تھا۔ ایک طرف نیاز فقہوری کی شخصیت تھی جنہیں اتحاد پسندی
کو مقبولیت پسندی کے مرادف ثابت کرنے کی جلدی تھی اور انہوں نے نیم پختہ مواد کے پیش نظر نگار کا خدا
نمبر نکال دیا مگر اقبال کی حیثیت جدا گانہ تھی وہ اپنے مقصد کے اعتبار سے اسلامی افکار دینی کو نئے انداز
بیان سے مرصع کرنا چاہتے تھے اور عمل کے اعتبار سے نیاز کی سلطیت کے برخلاف وقت نظری سے کام لینا

ہاہتے تھے معکروہ تو امتقائین کے نظریہ سے اتنے متاثر ہوئے کہ مذہبی زندگی کو تین ادوار میں منقسم کر دیا۔ اگر وہ قرآن کی اس تعلیم پر نظر فائر ڈالتے کہ خدا نے نوح سے لے کر عاد و ثمود کی ان قوموں کے لیے جن کی تہذیبی زندگی کی نشانیاں بھی امتداد زمانہ کی نذر ہو چکی ہیں ایک ہی دین کے التزام کی تاکید کی تھی تو انھیں محسوس ہو جاتا کہ قوانین فطرت کی طرح قرآنی تعلیمات ارض و سموات میں روز ازل سے جاری و ساری ہیں :

انغیر دین اللہ یبغون ولہ اسلم من فی
السملات والارض طوعا وکرا والیہ
یرجعون - ۸۲ : ۳۵

کیا یہ لوگ اپنے اللہ کے ٹھہرائے ہوئے دین
کو چھوڑ کر کوئی دوسرا دین اختیار کرنا چاہتے
ہیں حالانکہ آسمانوں اور زمین کے رہنے
والے سب چار و ناچار اسی کے ٹھہرائے ہوئے
قانون عمل کے آگے جھکے ہوئے ہیں اور بالآخر
سب کو اسی طرف لوٹنا ہے۔

یسلم للہ ما فی السموات وما فی الارض
زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے سب کے
سب اللہ کی تسبیح و ثناء میں مصروف عمل ہیں۔

اگر ہم مان بھی لیتے ہیں کہ کبھی ایسا بھی زمانہ تھا جب زمین حیات سے ماری تھی پھر پانی اور
مٹی کی آمیزش سے اس پر کائی کی تہ جمی اور نم کی شکل پیدا ہوئی تو یہ بات اس وقت تک قابل قبول نہیں
ہو سکتی جب تک کہ ہم یہ بھی مان نہ لیں کہ پانی اور مٹی میں باطلع نم کے اسکانات کو ظہور میں لانے کے
خصائص موجود تھے۔ یہ دلیل ہیں ایک ایسی نہایت پرے جا نیکی جب ہمیں اننا پٹے کا کہ نم مٹی اور پانی
کے وجود سے مقدم ہے۔ یہ دلیل اسی علت غائیہ کے تابع ہو گی جس کی تفصیل اقبال نے کی جبکہ انھیں نسبتاً
میں پیش کی ہے۔ یہی خصائص تو فطرت کے ہم گیر قانون کی وہ صفت ہے جو درہ درہ کے رنگ دے میں
جاری و ساری ہو کر خضاب الیکھ من جبل الودید کا نغمہ الاپ رہی ہے۔ مگر دین اسلام وہی
فطرت ہے جس پر انسان کو پیدا کیا گیا ہے تو اس دین کے لیے طہنویت، نیم باغی اور غنۃ سائگی کے ادوار
کا اطلاق کب اور کیسے کیا جاسکتا ہے ؟

ہم ارتقا کے تصور کو زمین کی آفرینش کے تصور سے الگ کر کے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ ارفیت

کے ماہرین کا کہنا ہے کہ ایک کروڑ ناری سو دن سے ٹوٹ کر سیارۂ ارضی میں جلیقہ مگر ہوا۔ یہ واقعہ کب ہوا اس کا اندازہ انسانی حساب سے ممکن نہیں ہے اور اس لیے اس تفاوت زمانی کے لیے وہ ارضیاتی سال (Geological year) کا تصور پیش کرتے ہیں اور ان کے مطابق ایک ارضیاتی دور سے دوسرے ارضیاتی دور میں داخل ہونے کی مدت کروڑوں ارضیاتی سالوں کے برابر ہے۔ لیکن اقبال کا یہ کہنا کہ ”کسی قوم کی سماجی اور سیاسی تاریخ میں ممکن ہے کہ اس رویہ یعنی غیر مشروط اطاعت کے رویہ سے بڑے بڑے نتائج رونما ہوئے ہوں۔“ لگتا ہے کہ کسی پیش پا افتادہ واقعہ کا ذکر کر رہے ہوں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیا مانگ رہے ہیں کہ وہ یہ بھی جان سکے کہ ”جہاں تک کسی فرد کے اندرونی نشوونما اور وسعت پذیری کا تعلق ہے یہ کوئی زیادہ عجیب چیز نہیں ہوتا۔“ وہ کسی تاریخ شہادت سے یہ ثابت ہی نہیں کر سکے کہ غیر مشروط اطاعت کا رویہ کبھی عالم انسانیت میں رائج بھی ہوا سوائے ان زمانوں کے کہ جب انسان منزل کے غار میں مگر گیا۔

اقبال نے فتم رسالت کے تصور کی توجیہ کے لیے بھی سلسلہ ارتقا کا سہارا لیا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ان کی دلیل کی روشنی میں یہ لازم بھی آتا ہے کہ اب انسان مذہب اور مذہبی تعلیمات کو سرے سے دھیا برد کر دے کیونکہ ان کے مطابق استقرائی فکر سے رہنمائی حاصل کرنا ذاتی شعور کی محکمیں کے لیے لازمی ہے اور نبوت کے اشارے پر چلنا گویا کچھ پتیلوں کا ناچ ناچنا ہے اور اب جبکہ زندگی کو ایسے ذرائع ہاتھ آگئے جو اس کی ہدایت کے لیے اس آسکتے ہیں تو مذہب کی گرفت سے سراسر آزاد ہونا ہی نجات کے مفاد میں ہوگا۔

آزاد اس کے برخلاف مذہبی ہدایت کو ربوبیت کی ایک شاخ مننے ہیں اور کہتے ہیں:

”یہ ”اہدئی“ یعنی ہدایت کی ایک ہی اور حقیقی راہ کون سی ہے؟ قرآن کہتا ہے وحی الہی کی عالمگیر ہدایت ہے جو اول دن سے دنیا میں موجود ہے اور بلا تفریق و امتیاز تمام انواع انسانی کے لیے ہے۔ وہ کہتا ہے جس طرح خدا نے وجدان، حماس اور عقل کی ہدایت میں نہ تو نسل و قوم کا امتیاز رکھا نہ زمان و مکان کا۔ اسی طرح اس کی ہدایت وحی بھی ہر طرح کے تفرق و امتیاز سے پاک ہے وہ سب کے لیے ہے، اور سب کو دی گئی ہے۔۔۔ ہدایت کی راہ تو وحی عالمگیر ہدایت کی

ماہ ہے۔ اسی عالمگیر ہدایت و وحی کو ”الہام“ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یعنی فروع

انسانی کے لیے حقیقی دین اور اسی کا نام اس کی زبان میں ”الاسلام“ ہے۔

اقبال نے جو دو اقباس مولانا روم کی مثنوی سے دیئے ہیں۔ وہ تصنیف ان کے انگریزی منظوم ترجمہ

سے ماخوذ ہیں۔ یہ اشعار مثنوی معنوی میں اس ترتیب کے ساتھ نہیں ہیں۔ اقبال نے خطبہ اول کے آغاز

میں ہی کہا ہے کہ: ”شاعری مبدلے و بدلنے سے بھرپور مبہم اور غیر واضح ہوتی ہے۔“ ظاہر ہے کہ مباحثات

سے معانی کا اس طرح تعین نہیں کیا جاسکتا کہ اسے کسی نظریہ کا مدد دیا جاسکے۔ زیادہ امکان یہی ہے

کہ رومی نے ان اشعار میں انسانی زندگی کی ہی ان مختلف حالتوں کا ذکر کیا ہے جسے قرآنی اصطلاح

میں ایک وقت بین العصب و الزراب بتایا گیا ہے۔ پھر نقطہ اشباح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پھر مغز یعنی

جسم نامی اور طبعہ یعنی آغاز حیات اور آخری منزل وہ ہے جسے حدود شک و خدشہ و خدشہ کے تعبیر

کیا گیا ہے۔ پھر یہی نو مولود و جدانی ضرورتوں کے تابع رہتا ہے۔ پھر محاسن کام کرنے لگتے ہیں۔

رفتہ رفتہ عقل اور شعور کی منزل سے گزرتا ہوا انسان کامل میں رونما ہوتا ہے اور اسی ماحول پر یہ

امید کی جاتی ہے کہ حیات بعد اٹھامات کی حالت میں انسان ملکوتی شان میں نمودار ہوگا۔ اگر ایسا

ہے تو یہ ارتقا ————— نہیں کہلا سکتا، اسے Metamorphosis کہا جانا چاہیے۔ جس کا

مفہوم تبدیل ہیئت ہے۔ یہ تبدیلیاں ہر انسان میں ناگزیر طور پر ہمیشہ رونما ہوتی رہیں گی۔ ارتقا کی

صورت میں ایک ہیئت سے دوسری ہیئت اختیار کر لینے کے بعد پہلی ہیئت کا تو اثر عام حالتوں

میں نہیں ہو سکتا۔

دوسرا اقباس جو ابن سبویہ سے دیا گیا ہے اس کا تعلق بھی ایک نوع کا دوسرے نوع سے

افضل ہونے سے ہے۔ مزید برآں ایک ہی نوع کے مختلف جنسوں میں فضیلتوں کی نشانیاں بھی دکھلائی

گئی ہیں پھر یہ بتایا گیا ہے کہ ایک ہی جنس کے مختلف افراد میں بعض کا بعض سے افضل ہونا ممکن ہے۔

ابن سبویہ اس ماحول سے شاید یہ کہنا چاہتا ہے کہ رسولان حق عام انسانوں سے ذکاوت عقل اور روحانی

ارتقا میں برتر ہوتے ہیں۔ اور اگر یہ بات ہے تو ابن سبویہ کے خیالات کو بھی ہم مسئلہ ارتقا کا مقدمہ

ابھیش نہیں کر سکتے۔ اقبال نے پہلے کسی نے یہ نہیں کہا کہ اسلامی عہد میں کسی نے تصور ارتقا سے متعلق ابتدائی

مدد جو کے خیالات کا بھی انظار کیا ہے۔

اقبال کی تیسری بات کہ اسلامی عہد میں استقرائی ذہن کو فروغ حاصل ہوا۔ بہت زیادہ لگتی تھی یہ بات نہیں ہے اور اس بات کی تصدیق بھی نہیں کی جاسکتی کہ اس عہد کو اس کے باطل کے عہد کے مقابلہ میں عہد جدید کہا جانا چاہیے۔ عربوں کا سب سے بڑا کارنامہ یہی رہا ہے کہ انہوں نے دنیا بھر سے تحصیل علوم کر کے انہیں بجائے کاشف و کشف۔ ان کی حیثیت صرف خوشہ چینوں کی تھی۔ البتہ وہ ایسی راہ پر لگ گئے تھے۔ جہاں سے نئی فکر کا آغاز ہوا۔ لیکن اسلامی تعلیم کا تعلق تو فطرت انسانی سے ہے نہ کہ اس کی تفسیری صلاحیتوں کی وسعت پذیری سے۔ اب الگ آئے کہ قرآنی بصیرت کی کم نصیبی کی وجہ سے وہ عجیب قسم کی بھول بھلیوں میں پھنسنے چلے گئے ہیں۔ تاہم ان کے دیباچہ کا یہ اقتباس پیش کر کے ہم اپنی بات ختم کرتے ہیں:

”جیسے جیسے علمی ترقیاں ہوتی جائیں گی، فکر کے لیے نئی راہیں کھلتی جائیں گی۔

تب دوسرے نظریات کا پیدا ہونا ممکن ہے، اور اغلب ہے کہ وہ ان نظریات سے زیادہ صائب ہوں جو ان خطبات میں پیش کیے گئے ہیں۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم انسانی فکر کی ترقیوں پر مستطادِ حنگ سے غور کریں، اور اس پر آزادانہ تنقیدی رجحان قائم رکھیں۔“

حوالہ جات

- ۱- اقبال ری کنسٹرکشن آف ری لیجس تھٹ ان اسلام۔ اردو نیشنل پبلشرز دہلی ۱۹۷۵ء، ص ۳
Iqbal reconstruction of religious thought in Islam Oriental Publishers

Delhi, 1975, p.3.

- | | | | | |
|---------|---|-------|---|----|
| ۴ | ص | ایضاً | ایضاً | ۲ |
| ۴۳ | ص | ایضاً | ایضاً | ۳ |
| ۵۲ | ص | ایضاً | ایضاً | ۴ |
| ۴۵ | ص | ایضاً | ایضاً | ۵ |
| ۸۵ | ص | ایضاً | ایضاً | ۶ |
| ۸۵ | ص | ایضاً | ایضاً | ۷ |
| ۱۲۱-۱۲۲ | ص | ایضاً | ایضاً | ۸ |
| ۱۳۲-۱۳۳ | ص | ایضاً | ایضاً | ۹ |
| ۱۸۰ | ص | ایضاً | ایضاً | ۱۰ |
| ۱۲۵-۱۲۶ | ص | ایضاً | ایضاً | ۱۱ |
| ۱۸۲ | ص | ایضاً | ایضاً | ۱۲ |
| ۱۳۲-۱۳۳ | ص | | ترجمان القرآن، مصطفائی، طبع دوم۔ ۱۹۴۵ء۔ | ۱۳ |
| ۱۲۳-۱۲۴ | ص | ایضاً | ایضاً | ۱۴ |
| ۱۳۳ | ص | ایضاً | ایضاً | ۱۵ |
| ۱۸۰ | ص | ایضاً | ایضاً | ۱۶ |
| VI | ص | | اقبال بحوالہ سابعہ (دیباچہ) | ۱۷ |

ڈاکٹر محمد منصور عالم ریڈر شعبہ اردو ایچ۔ ڈی جین کالج آرہ مشابہات اقبال

مشابہات سے ہمارا ذہن حکمت کی طرف جاتا ہے۔ یہ الفاظ قرآن مجید میں ایک دوسرے کی ضد کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔

وہ ہے جس نے آوری اور پر تیرے کتاب
بعض اس کی آیتیں محکم ہیں یعنی ظاہر معنوں
کی وہ جڑ اور اور ہیں مشابہ سنی کی طرف
ملے۔ پس آیا وہ لوگ کہ بچ دلوں ان
کے کبھی ہے۔ پس پیروی کرتے ہیں اس چیز
کی کہ شبہ ڈالتی ہے اس میں سے واسطے چاہتے
مگراہی کے اور واسطے پہلے حقیقت اٹکی کے۔

هُوَ الَّذِي أَنْشَأَ لَكُمُ الْكِتَابَ مِنۡهُ
آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ
مُتَشَابِهَاتٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ
زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ
الْفِتْنَةِ ۚ وَأَبْعَثْنَا نُوحًا
(پارہ ۳- رکوع ۹- آیت ۷)

حکمت وہ آیتیں ہیں جن کا مفہوم واضح متعین اور غیر مشتبہ ہے۔ ان میں تاویلات کی
گہنائش نہیں۔ ان کی زبان ایسی صاف اور مدعا ریز ہوتی ہے کہ ہمیں مفہوم سمجھنے میں کوئی دقت
نہیں ہوتی۔ لیکن مشابہات میں سنگ مفہوم بھاری اور تراشیدہ ہوتا ہے۔ اسے اٹھانے اور غماز
جہت سے رکھنے کے لیے راسخ علم اور ذہنی رسائی کی ضرورت ہے۔ مشابہات میں خدا کا واقعی
کیا منشا ہے، کون جلنے۔ لیکن علم راسخ اور ذہن رسا رکھے والے حضرات مشابہات کی حقیقت
کو تسلیم کرتے ہیں، ان میں الجھتے نہیں، ان کے پیچھے نہیں پڑتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ مشابہات
وہ آیتیں ہیں جو مشتبہ المراد ہیں۔

اس اشتباہ مفہوم کی وجہ انداز بیان ہے۔ حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس
لفظ کی تفسیر لکھتے ہوئے وضاحت کی ہے:

”جو چیزیں انسان کے احساس سے ماوراء ہیں، جو انسانی علم کی گرفت میں نہ کبھی آتی ہیں نہ آ سکتی ہیں۔ جن کو اس نے نہ کبھی دیکھا نہ چھوا نہ چکھا، ان کے لیے انسانی زبان میں نہ ایسے معروف اسالیب بیان مل سکتے ہیں جن سے ہر سامع کے ذہن میں ان کی صحیح تصویر کھینچ جائے جو اصل حقیقت سے قریب تر شاہدیت رکھنے والی محسوس چیزوں کے لیے انسانی زبان میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مابعد اطمینان مسائل کے بیان میں قرآن کے اندر ایسی ہی زبان استعمال کی گئی ہے اور مشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جن میں یہ زبان استعمال ہوئی ہے۔“ (تفہیم القرآن - جلد اول)۔

اس وضاحت سے چند ایسے نکتے فراہم ہوتے ہیں جن کی ہماری ادبی گفتگو اور اسلوبی بحث میں بڑی اہمیت ہے۔

۱۔ جب ایسے مضامین کو موضوع گفتگو بنانا مقصود ہو جو مخاطب کے لیے نامعلوم یا نامحسوس ہیں تو اسلوب وہ اختیار کرنا پڑے گا جو مثال محسوس موضوعات کے پیرائے بیان سے قریب تر ہو یا موزوں تمثیل کے ذریعے قریب کر دیا گیا ہو۔ اس سے ابلاغ کا قصہ ظاہر ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ مخاطب اس کا مفہوم متعین کر ہی لے۔ کیونکہ عام طور پر اس کی علمیت کی گرفت میں پوری صورت حال نہیں ہوتی۔ اس کا ذہن جتنا رسا ہو گا اور قوت سخن فہمی جتنی زندہ، بالیدہ اور راست رہے گی، اتنا ہی وہ قائل کے مافی الضمیر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گا۔ اور مشابہات روشن ہو کر محکمات میں شامل ہوں گے۔

۲۔ خود قائل موضوع سے پوری طرح واقف نہیں تو اس پر محکمات کی طرح اظہار خیال تقریباً ناممکن ہے۔ موضوع نامحسوس یا نامعلوم ہو تو اسلوب لامحالہ نامحسوس ہو جائے گا اور نتائج قبیح مشابہات کی شکل میں نمودار ہوں گے۔ اسے آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ موضوع معلوم و محسوس ہو تو وہ فطری طور پر معروف اسلوب بیان کی طرف جھکتا ہے۔ موضوع سے آشنائی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر گرفت کے باوجود اسلوب بیان اجنبی رہا تو یہ نقص اسلوب ہے۔ اسلوب کا تہ دار جو نا ایک بات ہے اور اس کا اجنبی یا غیر معروف ہو جانا دوسری بات ہے۔

اسلوب کی تہ داری عیب نہیں کیونکہ یہ دراصل انسان گویا کی قدرت کلام، موضوع سے گہری واقفیت، موضوع سے موضوعات پیدا کرنے کی صفت اور ذہنوں کو نئی سمتوں میں لے جانے کے حوصلے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ادب میں جسے ہم ابہام کہتے ہیں اور جس ابہام کو جوہر شعر سمجھتے ہیں، وہ بھی تہ داری ہے۔ ورنہ محض ناما فوسیت عرض ہنر نہیں۔ یہ تہ داری موضوعات اسلوب دونوں کے جذباتی، راغبانہ اور تشفی بخش اتصال سے عالم وجود میں آتی ہے۔ اس تہ داری کی حامل تعلقات کو میں مشابہات کے ذیل میں رکھتا ہوں۔ یہ فن کے اعلیٰ اور عمدہ نمونے ہوتے ہیں۔ تہ داری کی گوشش خام اور جاہلانہ ہے تو نتیجہ مہمل ہے۔ پنختہ اور غلافانہ ہے تو وہ مشابہ ہے۔

۳۔ مشابہات کی تخلیق ایک نہایت مشکل مرحلہ ہے۔ اسے وہی لوگ طے کر سکتے ہیں جو مختلف علوم و فنون کا وسیع علم، کائنات کے عناصر و مظاہر کا باریک مشاہدہ اور مختلف حالات کا گہرا تجربہ رکھتے ہیں اور اپنے احسابات و جذبات کو ان کے پس منظر میں پیکری نقوش عطا کرنے پر قادر ہیں۔ اس صورت میں جو مشابہات خلق ہوں گے وہ خلاق کی عظمت و قدرت کے بین دلیل ہوں گے کیونکہ ان میں فکر و دانش اور مرصع نقش کاری کی ظالم نیز موزوں ہوں گی۔ مگر ان میں معنوی خلش یا غلابی ضرور ہوگا۔

۴۔ ہم خالق کو نہیں کہہ سکتے کہ تو نے مشابہات کا سہارا کیوں لیا۔ صرف حکمت پر ہی قناعت کیوں نہ کی۔ ہماری فہم کی آزمائش ہوگئی۔ ہمیں غلبان میں مبتلا ہونا پڑا۔ نہیں۔ یہ سراسر سلاع یا قاری کی ذمہ داری ہے کہ وہ مشابہات کو سمجھنے کی گوشش کرے۔ ان کے خلا کو پُر کر کے خلش کو دور کرنا نقطہ اس کا کام ہے۔ دراصل یہ صورت ذہنی بالیدگی، فکری رسائی اور اعجاز فن اور عجائبات حسن سے لطف اندوزی کے لیے بہت موزوں اور نافع ہوتی ہے۔

۵۔ مشابہات کا مدار زیادہ تر الفاظ پر ہے، معنی پر نہیں، معنی خواہ کیسے ہی ادق اور اجنبی ہوں، اگر ان پر غور و فکر کیا گیا ہے، ان کے موزونی نشیب و فراز اور حد و وسعت کو سمجھا گیا ہے تو فساد و انکلاہی کا تقاضا یہ ہے کہ الفاظ ان کا ساتھ دیں اور معنوں پر اسے میں ان کی ترسیل کریں۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ ترسیل کے باوجود وہ محکم نہ ہو سکیں، مشابہ کے

نمر سے منسلک جائیں۔ یہ اس وقت ممکن ہے، جب مثال پر ایہ بیان سے متواتر کام لیا گیا ہو۔ مثلاً اور مثلاً کا مادہ تو ایک ہی ہے۔ مگر مثلاً بہ غیر محکم، غیر واضح کے معنی رکھتا ہے اور مثلاً میں مثلاً ایک دوسرے کے جیسا اور مماثلت کے معنی ہیں۔ بعض مفسرین کے نزدیک خود مثلاً بھی مثلاً کا ہم معنی ہے۔ اس سلسلے میں تفسیر ابن کثیر کے اردو ترجمے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

”محکم اور مثلاً کے بہت سے معنی سلف سے منقول ہیں۔۔۔ حضرت مجاہدؒ کا قول ہے کہ یہ ایک دوسرے کی تصدیق کرنے والی ہیں جیسے اور جگہ ہے کِتَابًا مُمْتَلَبًا مُمْتَلَبًا۔ اور یہ بھی مذکور ہے کہ وہ کلام ہے جو ایک ہی طرز کے ماتحت ہو اور مثالی وہ ہے جہاں دو مقابل چیزوں کا ذکر ہو۔۔۔“

(محکمات و تشابہات کی تفسیر میں۔ پارہ ۲۔ رگدہ ۱۹)

حضرت ابن کثیر نے سلف کے اقوال نقل کرنے کے بعد اپنا خیال یہ ظاہر کیا ہے کہ ”اس آیت میں مثلاً بہ محکم کے مقابل میں ہے“ لیکن میں اپنے موضوع کی وضاحت کے لیے مثلاً میں کلام کی ہم طرزی کو فراموش نہیں کروں گا۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک وجہ تو سلف کا قول ہے، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ دوسری اہم تر وجہ خود کلام اللہ ہے۔ قرآن میں تشابہ، اشتباہ اور مشابہت دونوں مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اگر اشتباہ موضوعی اور اسلوبی دونوں طرح سے ہوتا ہے، یقیناً بھی دونوں طرح کی ہوتی ہے اور مشابہت کی کوشش سے ہی معنوی یا صوری اشتباہ ہوتا ہے۔

۶۔ تشابہات سے طرز خاص کا تعین ہوتا ہے۔ بعض الفاظ، ترکیبیں، تلافی اور فقرے تواتر سے استعمال ہوں تو گو وہ بالکل نئے ہی کیوں نہ ہوں اپنا پس منظر بنا لیتے ہیں۔ سامع یا قاری یہ سمجھنے لگتا ہے کہ انشاء پر ناکازی فکر نکلاں، نہج پر زیادہ چلتی ہے یا فلاں موضوع پر وہ زیادہ مروج ہے یا کسی خاص موضوع کو ادا کرنے کے لیے چند نقوش بطور خاص مرتب کرے۔ اس طرح اس کی غرابت خیالی بھی دور ہوتی ہے اور اسلوبی شناخت بھی ہوتی ہے۔

اب آئیے اس پس منظر میں کلام اقبال کے چند تشابہات معنوی و نقلی پر نظر ڈالیں۔

مسجد قرطبہ کے دو اشعار یہ ہیں ۔

اول و آخر فنا باطن و ظاہر فنا نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

ہے مگر اس نقش میں نگ ثابتاً ہم جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام
شعرا دل پڑھنے کے بعد ذہن قرآن کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ سودہ رحمن میں ہے :
”كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهٌ لِّدُنِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔“

مگر اقبال اس شعر کے ساتھ یہ نہیں کہتے کہ بقا صرف اللہ کو ہے۔ مسجد قرطبہ کے سیاق و سباق
میں وہ بالکل دوسری بات کہ جاتے ہیں۔ یعنی ہر نقش کو فنا ہے مگر جس نقش کو کسی مرد خدا نے
بنایا ہے، اسے فنا نہیں۔ توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ ”هُوَ الْأَدَلُّ وَالْأَخْزَرُ وَالْظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ“ تو
خاص خدا کی صفت ہے۔ اقبال نے اول و آخر کے الفاظ دوسری جگہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ
و سلم کے لیے بھی استعمال کیے ہیں۔ ع

نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر

ہیاں ”نگاہ عشق و مستی“ کی تفصیص بھی مزوری نہ تھی۔ رسالت کی حیثیت سے یہ عالمی اور دائمی قیادت
ہے۔ اسے شریعت بھی تسلیم کرتی ہے اور طریقت بھی۔ اگر نگاہ عشق و مستی سے وہ راہ مراد لی جائے
جس کے سالک حبیب خدا کو خدا کہہ بیٹھتے ہیں تو یہ اقبال کا مسلک نہ تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اقبال
مسجد قرطبہ کے اشعار زیر بحث میں اول و آخر و ظاہر و باطن استعمال کرتے وقت سورۃ الحديد
(پارہ ۲۷) کی ابتدائی آیتوں کو فراموش کر گئے تھے۔ اس لیے ایسی متناقض بات کہ گئے تو یہ
میرے نزدیک قابل تسلیم نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان چاروں خصوصی الفاظ کو مصرعہ ہذا میں آٹھ
وقت اقبال کا ذہن آیت قرآنی سے خالی نہ رہا ہوگا۔ یہ کلا در اصل اکلا کو ثابت کرتا ہے جو شعر
دوم سے ظاہر ہے اور جو معنوی اشتباہ ہے وہ خلا پیمانی سے دور ہو جاتا ہے۔ ہمیں مصرعے کو تنہا
کہہ نہیں دیکھنا چاہیے۔ مصرعہ دوم میں ”نقش کہن ہو کہ نو“ موجود ہے جو اقبال کے منشا کی فکر
اشارہ کرتا ہے۔ اقبال یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دنیا کے اول و آخر اور ظاہر و باطن کو فنا ہے مگر
اس دنیا کے جو نقوش مرد خدا کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں انھیں فنا نہیں۔ یہ مفہوم اقبال کے فلسفہ
زمان و مکان سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔

ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے

حسنِ ازل کی ہے نمود چاک ہے پردہ وجود دل کے لیے ہزار سود ایک نگاہ کا نریاں

یہ شعر ذوق و شوق سے ماخوذ ہے جو اس دور کی بہترین نعتیہ نظموں میں سے ایک ہے۔ اس کی تشریح کہتے ہوئے پروفیسر یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں :

”اس مصرعہ (مصرعہ دوم) کا مطلب یہ ہے کہ جب تک نگاہ معرودہ
نظارہ رہتی ہے، بصیرت (دل کی قوت) مضاعف رہتی ہے۔ ... خلاصہ کلام یہ
ہے کہ دل کی ترقی کے لیے نگاہ کو نظارہ سے معرودہ کرنا بہت ضروری ہے۔“
(شرح بال جبرولی)

مجھے شک ہے کہ اقبال کے مافی الغیر میں یہ مفہوم رہا ہوگا۔ چشتی نے جس طرح سے معنی کا بند کھولا، ہم
ذوق نظارہ رکھنے کے بھی معرودہ ہو گئے ہیں۔ اس شعر سے ٹھیک پہلے نظم کا افتتاحی شعر یہ ہے :
قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں

چشمِ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں

یہ منظر تقاضا کرتے ہیں کہ نگاہ کو نظارے سے معرودہ نہ کیا جائے۔ ورنہ، پورے بندی کی غنویت
ختم ہو جائے گی۔ دراصل چشتی صاحب کو تشابہ معنوی ”نگاہ کا زیاں“ سے ہوا ہے۔ اقبال کی تنکائی
نے ایسی گرہ لگائی ہے جو تہ داری پر مبنی ہے۔ ”نگاہ کا زیاں“ ایک نگاہ نہیں دیکھا تو گویا
ایک نگاہ کو نقصان ہوا۔ یعنی اسے ہم چشم بندی کے معنی میں لیں تو وہ مفہوم ہر گاہ یوسف صاحب
نے بیان کیا ہے۔ لیکن اس کا مفہوم یہ لیا جائے کہ ایک نگاہ جو دیکھا تو گویا ایک نگاہ برباد کی۔ نہ دیکھتا
تو وہ بچی رہتی، ہمیں ایک نگاہ کا نقصان نہ ہوتا۔ تو، اس صورت میں مصرعہ کا معنی یہ ہو گا کہ اگر
ایک نگاہ اٹھا کر دیکھ لیا ایک نگاہ کا نقصان ہو تو دل کو ہزار فائدے ہوں گے۔ اقبال کی شاعر کی
کے پس منظر میں اس مفہوم کو زیادہ قرین قیاس سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اقبال چشم و گوش و لب
بندی کو اختراعات اقوام مغلوبہ سے سمجھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو اسرار خودی کی حکایت مسکے نفی خودی
از مخترعات اقوام مغلوبہ، جی فوج انسان کا یہ شعر ہے

چشم بند و گوش بند و لب بہ بند تار سد فکر تو بر چرخ بلند
اسی ثنوی میں در شرح اسرار اسلمے علی مرتضیٰ، یہ شعر ملتا ہے :
چشم و گوش و لب کشا ہے ہوشمند گر نہ بینی ماہ حق بر من بخند

ہی اقبال کا اصل خیال ہے۔

شعر زیر بحث کی رعایتیں بھی ہمیں بھلاوے میں پٹنے سے بچاتی ہیں۔ حسن۔ دل۔ نگاہ۔ نمود۔ پاک سہے پردہ وجود۔ ہزار۔ ایک۔ سو۔ زیاں۔ کی۔ کا۔ ازل۔ وجود۔ زیادہ رعایتیں، ہمیں آمادہ نگاہ کرتی ہیں۔ اس لیے، دل کے سودمند غمخیز نظری نہیں، اور کتاب نگاہ ہے۔

اقبال کی شاعری میں مشابہات معنوی کی مثالیں بہت ہیں۔ مثلاً یہ مشہور شعر دیکھیے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے جوتا ہے جن میں دیدہ ور پیدا

اس میں "نرگس کی بے نوری" اشتباہ مفہوم کی وجہ ہے۔ اور یہ شعر ہے

محمد بھی ترا قرآن بھی جبریل بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں تر چاں تیرا ہے یا میرا

اس میں تشابہ کی وجہ "حرف شیریں" ہے۔ زیادہ مثالوں کی یہاں گنجائش نہیں۔

اب چند نقلی تشابہات پر بھی نظر ڈالیے۔

۱۔ آبلیس کی مجلس شادی لار مغنان مجاز، اردو) میں تیسرا مشیر ایک شعر یہ کہتا ہے۔

وہ کلیم بے تجلی وہ سبح بے ملیب نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

یہاں کارل مارکس کی طرف اشارہ ہے۔ اقبال نے مصرعہ دوم سے ایک رکن (فاعلاتن) کم کر کے اس مصرعہ کو پیام مشرق میں گونے گونے کیے بھی کہا ہے۔ قلم ہے "جلال و کجائے" شعر ملاحظہ فرمائیے۔

شاعرے کو ہچموں مالی جناب نیست پیغمبر و لے دارد کتاب

میں نے یہ مصرعہ ایک جگہ پڑھا تو حاضرین چونکہ کچھ ہوشیار ہو گئے۔ انہوں نے مجھے کم نواں بتلایا کیونکہ ان کے ذہن میں صرف مصرعہ مشیر سیوم موجود تھا۔

۲۔ پیام مشرق کی قلم اول کے پانچویں بند میں ایک شعر ہے۔

گفت حکمت را خدا خیر کثیر ہر کہا ایں خیر را مین بگیر

اس کے بعد یہ شعر ہے۔

سید کل صاحب ام الکتاب پر دیکھا برضیرش بے حجاب
لیکن جاوید نامہ میں ”مسلکات عالم قرآنی“ کے تحت نظم چہارم بعنوان ”حکمت خیر کثیر است“ ہے
اس کا پہلا شعر وہی ہے جو اوپر پہلے درج ہوا۔ لیکن اس کے بعد بالکل ہی دوسرا شعر ہے۔
علم حرف و صوت را شہر دہد پاکئی گوہر بہ ناگوہر دہد
جو مصرات شعر خوانی کے شایق ہیں، انھیں سلسل شعر کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔

۳۔ جاوید نامہ میں علاج ابلیس کے بارے میں ہدایت کرتا ہے۔
کم بجو ناز خواجہ اہل فراق تشنہ کام و از ازل خونیں باقی
لیکن جب آگے خواجہ اہل فراق ابلیس نمودار ہوتا ہے تو ہے
گفت روی خواجہ اہل فراق آن سراپا سوز و آن غوئیں باقی
علاج و رومی کے فرق بیان کو ملحوظ رکھیے ورنہ ممکن ہے کہ ان شعروں کے مصرعے آپ کے ماننے
کی مدد سے کوئی سازش کر بیٹھیں۔

۴۔ زبور عجم نمبر ۴۵ اور جاوید نامہ میں بعنوان ”نغمہ ملائک“ کے تحت کے چند اشعار
ملاحظہ ہوں :

زبور عجم	جاوید نامہ
فروغ خاکیاں از لوریاں افزوں شود روز	فروغ مشت خاک از لوریاں افزوں شود روز
زمین از کوکب تقدیر ما گردوں شود روز	زمین از کوکب تقدیر او گردوں شود روز
خیال ما کہ ادرا پرورش داند طومنا نہا	خیال او کہ از سیل حوادث پرورش گیرد
ز گرداب سپہر نیگوں بیرون شود روز	ز گرداب سپہر نیگوں بیرون شود روز
یکی در معنی آدم نگر از من چہ می پرسی	یکی در معنی آدم نگر از ما چہ می پرسی
ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روز	ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روز

یہاں خود شاعر کو تشابہ ہوا ہے۔ طبع موزوں مشابہتوں سے مغالطہ خوب کھاتی ہے۔ اس کی مافہ
شائیں ملاحظہ فرمائیں اور انکلام آزاد اخبار خاطر میں فرما رہے ہیں۔

۵۔ اسرار خودی (مرحلہ دوم ضبط نفس) میں یہ شعر ہے :

امتناع مارطی تن پرورد است کشتہ فشا ہلاک منکاست
چند شعروں کے بعد ایک شعر آیا ہے جس کا معرہ دوم مذکورہ بالا معرہ دوم سے شائبہ
رکھتا ہے :

دکھ مسلم شال خنجر است قاتل فشا و بنی منکر است
۶۔ اسرار خودی (خودی از عشق و محبت استکام می پذیرد) میں مدینہ طیبہ کی تعریف
کرتے ہوئے اقبال نے یہ شعر لکھا ہے :
خاک یثرب از دو عالم خوشتر است لے خشک شہب کہ آنجا دلبر است
لیکن رموز بخودی میں "عرض حال مصنف بمغفور رحمۃ اللعالمین" کے تحت مدینہ طیبہ کی تعریف
یوں کی گئی ہے :

فرغا شہب کہ تو بودی دریاں لے خشک خلک کہ آسودی دریاں
حافظ ہوشیار رہے۔ دونوں شعروں کے معرہ دوم کے الفاظ "شہب" اور "خلک" اپنے مقام
بدل دیں تو وزن میں کوئی فرق نہ آئے گا مگر شعر کے مزاج پر اثر پڑ جائے گا۔
۷۔ اسرار خودی (چوں خودی از عشق و محبت حکم می گیرد) تو لے ظاہرہ و مخفیہ نظام عالم را
مسخری سازد) میں حضرت بوعلی قلندرؒ کا حوالہ آیا ہے :

با توی گویم حدیث بوعلی در سواد ہند نام او جلی
آں نوا پر لے گلزار کہن گفت با ما از گل رعنا سخن
شعر آخر میں بوعلی کے ایک شعری طرف اشارہ ہے۔ وہ شعر یہ ہے :
مرصباے ببل باغ کہن از گل رعنا بگو با اسمن
شر اقبال میں اس کا عکس صاف جھلکتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ حافظ ایک معرہ اقبال کا ایک معرہ
بوعلی قلندرؒ کا معرہ لے "گلزار کہن" اور "باغ کہن" کے فعلی فرق کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔
۸۔ اسرار خودی (انداز میر خجاست نقش بند معروف بہ بابائے صوفی) میں ایک شعر ہے :
پلے خویش از مکتبم بیروں گذار قیل و قال است این تیرا با و چہ کار
چند شعروں کے بعد ایک شعر کے معرہ دوم میں اپنی تغیر پھر آیا ہے۔ وہ یہ ہے :

گفت شیخ اے تسلیم زمار دار ذوق و حال است این ترابا دو چکار
مصرعہ دوم کا تشابہ ظاہر ہے: ”قیل وقال“ والے شعر کے بعد یہ شعر ہے:
قال ا از فہم تو بالا تر است شیشہ ادراک را روشن گراست
مصرعہ اول ”ذوق و حال“ والے شعر کے بعد بادی تغیر پھر آیا ہے:

حال ما از نکر تو بالا تر است شعلہ ما کیمیائے احمر است
غضب ہے۔ تشابہ کیا ظلم ڈھاتا ہے۔ حافظ کیا کرے۔ حال وقال کے چکر میں مصرعہ مکان بدل
ہی دیتا ہے۔

۹۔ محنت نخی معاف ہو، ایک چھوٹا سا سوال پوچھتا ہوں۔ کیا اقبال کے یہاں سروج آدم خاکی
سے انجم صرف سمجھتے ہیں؟ بال جبریل میں سلسلہ اول کی غزل نمبر ۱۷ کا آخری شعر ضرور آپ کو
یاد ہو گا۔

سروج آدم خاکی سے انجم سمجھتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جلتے
جو اس کے لیے سلسلہ دوم کی غزل نمبر ۱۷ کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے
سروج آدم خاکی کے منتظر ہیں تمام یہ کہکشاں، یہ ستارے یہ نیلیگوں اٹلاک
”سروج آدم خاکی“ دونوں جگہ۔ لیکن پہلے ستارے سروج سے غائب تھے۔ اب یہ سروج کے
منتظر ہیں۔

۱۰۔ بال جبریل سلسلہ دوم کی غزلوں میں (پہلی غزل، حصہ سوم) ایک مصرعہ ہے۔ ع
غبار راہ کو بخشا فروغ داوی سینا
یہ مصرعہ نسبتاً زیادہ مشہور ہے۔ لیکن اس سے مشابہ ایک اور مصرعہ ہے۔ ملاحظہ ہو ارمنان مجاز
میں نظم بعنوان ”مسعود مرحوم“ کا مصرعہ ذیل۔ ع

غبار راہ کو بخشا گیا ہے ذوق جمال

۱۱۔ ”ساقی نامہ“ (بال جبریل) میں ایک مصرعہ ہے۔ ع

ہمالہ کے چشمے بہنے لگے

ارمنان مجاز (اردو) میں ”لانا زادہ صغیر لولائی کشمیری کا بیاض“ کے زیر عنوان جو قطعیں لکھی گئی ہیں

ان میں تلم نمبر ۱۱ کا یہ مصرعہ ہے۔

ہمالک کے چشے ملتے ہیں کب تک
۱۲۔ اور مخان حجاز (ازدو) میں اسی عنوان کے تحت تلم ۱۹ کے شعر اول کا مصرعہ اول یہ ہے:
غریب شہر ہوں سن تو لے مری فریاد
اور بال جبریل میں شروع کی چوتھی غزل کے مطلع کا مصرعہ اول یہ ہے:
اثر کس نہ کس سن تو لے مری فریاد
تشابہ ظاہر ہے۔

۱۳۔ اچھا، صاب! بھیس بدلنا صحیح ہے یا بھیس بنانا؟ بال جبریل سلسلہ دوم کی غزل ۱۱۱
میں ایک شعر ہے

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے عشق بچارہ نہ لایا نہ حکیم
یہ شعر تقریباً زبان زد ہے۔ لیکن میں شاید ہوں کہ کئی اصحاب علم کی زبان پر مصرعہ اول یوں
ہے۔
عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے
محترم سامعین! اقبال نے بھیس بدلنا بھی استعمال کیا ہے۔ لیکن یہاں نہیں، ضرب یکم میں نظم
”ناز“ پڑھیے۔ شعر یہ ہے

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں

اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

نو ثابت ہوا کہ بھیس بدلنا اور بھیس بنانا دونوں صحیح ہے۔

۱۴۔ بانگ درا آخری حصہ کی غزلیات میں تیسری غزل کا مطلع ہے

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی اپنے سینے میں لے اور ذرا تخام ابھی

اسی قافیہ اور رویت میں بال جبریل میں ”خزشتوں کا گیت“ ہے

مقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی

نقش گر ازل ترا نقش ہے ناقص ابھی

غزل کی بحر مل مثنیٰ معنویں مقطوع (خاطرات غزلات غزل) ہے۔ اور ”گیت“ بوجہ مثنیٰ

مطوی جنون (مقتلن مقتلن مائلن) میں نکھا گیا ہے۔ رویت و قوافی کی یکسانیت سے مجھے شبہ ہوا کہ کہیں بحرزل میں ڈال کے بحر ہرج تو نہیں چلے گئے؟ نہیں نہیں یہ بحر رجنہ ہے۔

۱۵۔ ارمغان مجاز (اردو) کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں ایک مصرع ہے۔

القدر! آئین پیغمبر سے سوارا القدر!

اسی مجموعے میں نظم "عالم برزخ" کا ایک مصرع ہے۔

القدر! محکوم کی میت سے سوارا القدر!

اور آپ کو خواجہ الطاف حسین حالی کا مصرع یاد آتا ہوگا۔

القدر! اس فقر و ناداری سے سوارا القدر!

میں نے گزشتہ سطور میں یہ نکھا تھا کہ طبع موزوں شایرہوں سے مخاطبے خوب لکھائی ہے

اقبال کے یہاں ایک دو مثالیں ایسی لائحہ فرمائیے، جن سے یہ معلوم ہوگا کہ ان کی موزونی طبع تشابہات خوب غلط کرتی ہے۔

۱۶۔ بانگ درا میں "اسیری" کے عنوان سے ایک نظم ہے۔ اس کے آخر میں حافظ کا شعر لکھا:

شہرِ زناغ و زغن در بند قید و حبس نیست

ایں سعادت قسمت شہباز و شاہین کردہ اند

لیکن یہ شعر دیوان حافظ (سب رنگ، کتاب گھر، دلی) میں اس طرح ہے

شہرِ زناغ و زغن زینبے عید و قید نیست

کایں کرامت ہمرہ شہباز و شاہین کردہ اند

اسی طرح بانگ درا میں ہی "دیوڑہ خلاف" کے عنوان سے جو نظم ہے، اس کے آخر میں بھی حافظ کا شعر ہے۔

مرا از شکستن چہناں عار نباید کہ از دیگران خواستن مویائی

لیکن یہ شعر بھی دیوان حافظ میں بتغیر نظر آیا ہے

دل خستہ من گردش ہمتے نیست نخواہد ز سنگیں دلاں مویائی

ان شعروں میں شاعر کی موزونی طبع نے قاریوں کو تشابہات سے دوچار کیا ہے۔

مشائیں اور بھی ہیں۔ اس مسئلے میں ان کا استعداد متعقد نہیں۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اقبال کی مشاعری میں سنوئی اور قطعی دونوں طرح کے مشابہات موجود ہیں۔ ابھی وہ شعر و شاعرانہ تیر اور غالب اور انیس اور شاد کے مشابہات کا مطالعہ باقی ہے۔ اس لیے یہاں یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے ہاں اقبال سے زیادہ مشابہات ہیں یا کم۔ میرا خیال ہے، بساک میں نے پہلے بھی کہلے کہ مشابہات کا وجود کسی شاعر کا عجیب نہیں بلکہ یہ اس کی شعری عظمت کی دلیل ہیں۔ ہاں مگر وہ ایسے سے نہ ہوں کہ انسانی عقل انہیں حل کرنے سے قاصر رہ جائے۔ میں مشابہات کو شاعر کی انفرادیت، عظمت اور شناخت کا ایک پیمانہ سمجھتا ہوں۔

اقبال کے مشابہات وسیع طبیعت اور غائر و محیط فکر کا پتہ دیتے ہیں۔ انہوں نے اکثر ایسے موضوعات پر قلم اٹھائے ہیں جو ان کے لیے تو معلوم و محسوس ہیں مگر غالب ان سے کم آشنا ہے۔ لازماً انہیں یہ اسلوب اختیار کرنا پڑا ہے جس سے خیال کا موزوں ابلاغ ہو سکے۔ ایسا کہیں نہیں ہے کہ شاعر بھی اپنے موضوع سے پوری طرح واقف نہیں۔ نہیں کہ تو اپنے موضوع پر مادی ہے۔ اسی وجہ سے اکثر و بیشتر محکمات کی طرح ان پر روشنی ڈالتا ہے۔ مگر اس کی پختہ فکر اور عقائد حسن اسے مشابہات کی تخلیق پر مائل کر دیتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اقبال کے مشابہات میں محکمات سے زیادہ شعریت ہے۔ مثلاً پہلے یہ شعر پڑھیے :

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کو چر گرد

یہ پریشاں روزگار، آشفۃ مغز، آشفۃ ہوا

اب اس کے مقابلے میں یہ شعر دیکھیے :

فقد فریاد کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج

کانپتے ہیں کوہِ سدا و مرغزار و جوبار

شاید آپ کہیں کہ یہ شعر مشابہات میں کیسے شامل ہو گیا۔ میرا جواب یہ ہو گا کہ اس کا اسلوب معنی کو زہن بھی کرتا ہے، بیچ دل بھی بناتا ہے اور حرکتی پیکر میں نقش بھی کرتا ہے۔ مرغزار اور جوبار کو تو ہم کانپتے ہوئے دیکھتے ہیں لیکن کوہِ سدا میں جنبش نہیں۔ کوہِ سدا کی وجہ سے معنی میں اشتباہ ہوتا ہے۔ پھر بھی ہم مرغزار و جوبار کے ساتھ جنبش کوہِ سدا کو تسلیم کر لیتے ہیں، کیونکہ شعری عظمت

گنہگار یعنی قاری کا ہی کام ہے۔ اس مقام پر یہ کہنا ناگزیر معلوم ہو چکا ہے کہ شعری غلابی عیب نہیں اور یہ زیادہ تر آفریدہ اسلوب ہی ہوتا ہے۔ اس لیے مشابہات کی نمود میں شعری صنعتوں، تمثیلوں اور علامتوں کا اہم کردار ہوتا ہے۔ دو ایک اشار اور ملاحظہ ہوں۔

سرور و سوز میں ناپائیدار ہے وزن سے فرنگ کا تہ جرد بھی نہیں ناماف

یوں تو روشن ہے مگر سوز دروں رکھتا نہیں

شعلہ ہے مثل چراغ لالہ محسوسا تیرا

اقبال مشابہات کے درجے محکمات کی تشکیل میں مدد لیتے ہیں۔ میں پہلے کہ چکا ہوں کہ مشابہات روشن ہو کر محکمات میں اس وقت داخل ہوتے ہیں جب معروف پر ایہ بیان اختیار کیا جاتا ہے۔ اس سے بری مراد صفت، تمثیل اور علامت کا ایسا استعمال ہے جو خیال، احساں یا جذبہ کو پیکری نقش عطا کرے اور اس کی بہتر تفہیم کے لیے لفظوں کو ماہ نابند دے۔ ظاہر ہے کہ اس عمل میں معروف اسالیب بیان سے کسی قدر سہارا ضرور دیا جائے گا۔ خیال یک بیک بالکل ہی نئے اسلوب بیان کے ساتھ نمودار نہیں ہو سکتا۔ نیا اسلوب بننا ضرور ہے مگر موجود سے منقطع ہو کر نہیں۔ اسلوب موجود سے یک گونہ تعلق ہی اسلوب جدید کو قاری کے لیے گوارا بناتا ہے۔ کیونکہ قاری محکمات سے واقف ہوتے ہیں اور مشابہات کی پہلی تفہیمی کوشش اس پس منظر میں کرتے ہیں۔ مثال کے لیے، آپ اردو شاعری کے معروف اسلوب میں نفس، آتش، گل، مرض جن، لونا، صلہ جیسے لفظوں سے واقف ہیں۔ واقعیت کے اس پس منظر میں یہ شعر آپ کے سامنے آگئے ہیں

تیرے نفس سے ہوئی آتش گل تیز تر مرض جن ہے یہی تیری لونا کا صلہ

تو آپ پہلے اسی پس منظر میں شعرا کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ قوی طود پر پورا مفہوم نہ سمجھتے ہوئے بھی آپ ماہ واہ کہ اٹھتے ہیں۔ میں معافی کا خواستگار ہوں کہ مجھے یہ جملہ کہنا پڑا۔ دماغ کوئی بھی شخص کسی عمدہ شعر کے پورے مفہوم تک بیک لم نہیں پہنچ سکتا۔ یہ رسائی غور و فکر کے بعد ہوتی ہے اور شعر غور و فکر کا تقاضا بھی کرتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ انھیں سخن سازی کا فن نہیں آتا اور انھیں شاعری کی فکر بھی نہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا تمام ہی خیال، جسے ہم سب پیغام یا فلسفہ کہتے ہیں، احساس اور جذبے میں شیر و شکر ہو گیا ہے اور بیشتر حالات میں وہ شعریت سے خالی نہیں۔ انہوں نے اپنے محکمات کو اتنا آراستہ کیا ہے، چند مخصوص لفظوں، ترکیبوں اور تلازموں کو یوں قوارتے استعمال کیا ہے کہ وہ ایک طرف تشابہات کا ہی لطف دیتے ہیں اور دوسری جانب اقبال کے ”انداز بیان“ کو مخصوص، منفرد اور معنویت سے مبریز بھی بنا دیتے ہیں۔ اس صورت حال سے عہد اقبال کے سیاسی، سماجی، مذہبی، معاشی حالات کے ساتھ شاعر کے نفسیاتی انسلاک و کیف کا گہرا شعور حاصل ہوتا ہے۔ اور ہم دور سے ہی اس کے انداز بیان کو پہچان لیتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہو:

نگاہ عشق دل زندہ کی تلاش میں ہے

شکار مردہ سزاوار شاہباز نہیں

فرض کیجیے کہ کوئی نہ بھی جانتا ہو کہ یہ کس کا شعر ہے تو طرز شعر کی روشنی میں وہ کہ لٹھے گا کہ یہ اقبال کا نتیجہ نکمے ہے۔

اقبال کے تشابہات شعری عظمت کی مہر تصدیق ہیں۔

پہلی خاتون ناول نگار

رشیدۃ النساء

ہمارے بیشتر ناقدین اور محققین اپنے ارد گرد پہلے ہی ایک دائرہ پہنچ لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اس میں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ انہیں پاس پڑھنے کی خبر ہو تو کیسے ہو؟ ایسے میں ادب کی کسی صنف یا اصناف کے ارتقا کا نام لے کر جانے ہی ہمارے سامنے آتا ہے گا۔ یہی کچھ ہمارے ناول کے ساتھ بھی ہوا ہے کہ اسکی اصل صورت حال سے ہم آج بھی بے خبر ہیں اور بے خبر رہنے ہی کو بہت کچھ جانتے ہیں۔ چنانچہ ہم اب تک اردو ناولوں کا مکمل احاطہ نہیں کر سکے۔

ہندوستان کے مشرقی علاقے میں ۱۸۵۷ء کے بعد یعنی انیسویں صدی کے آخری پچیس تیس برسوں میں جو ناول لکھے گئے وہ اب تک یا تو گوشہ نگہ نامی میں پڑے ہوئے ہیں یا اگر کسی نے ذکر کیا ہے تو رسماً یا اسکی حیثیت سنی سنائی کی ہے، اور جب تک ان ناولوں کا احاطہ نہیں کیا جاتا اردو ناول کے آغاز و ارتقاء کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اور اس پر کوئی بات نامکمل رہے گی۔ اپنی مذکورہ گفت گو کو تقویت پہنچانے کیلئے اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد کے ”مراۃ العروس“ (۱۸۶۹ء) کی اشاعت کے آس پاس کے برسوں میں تقریباً دس بارہ ناول ”بہار“ میں لکھے گئے جن میں جدید غزل کے بانی حضرت شاد عظیم آبادی کا ناول ”صورت الحیاں عرف ولایتی کی آپ بیتی“ (۱۸۷۶ء) ”بدعا دا“ (۱۸۸۹ء) مولوی عبدالمبارخاں کے ناول ”مخبر الوقعات“ (۱۸۸۱ء) اور ”مخبر الحسناات“ (۱۸۸۲ء) منشی حسن علی ونشی محمد اعظم کا ناول ”نقش طاؤس“ (۱۸۸۶ء) مولوی افضل الدین احمد کا ناول ”فسانہ خورشیدی“ (۱۸۸۶ء) صغیر بلگرامی کا ناول ”جو ہر مقامات حصہ اول“ (۱۸۸۷ء) سید سجاد علی کا ناول ”نئی نوبلی“ (۱۸۸۹ء) انکے علاوہ منشی محمد اعظم کا ناول ”رازِ سر بستہ“ سید علیل الرحمن بی۔ لے کا ناول ”سرخنی“ (جسے آپ اردو کا پہلا طبع زاد جاسوسی ناول کہہ سکتے ہیں) سید علی سجاد عظیم آبادی کا ”محل خانہ“ مولوی غیاث الدین لمبی کا ”سحر زما شرت“ علی اسلم عظیم آبادی کا ”فسانہ شریفی“ اور سید محمد حنیف فائز عظیم آبادی کا ناول ”رفیق وانیس“ انیسویں صدی ہی کی تصانیف تصور کیے جاتے ہیں۔ بعد کے زمانوں میں یعنی ۱۹۰۱ء آگے بھی ناول لکھے کا سلسلہ جاری

رہا ہے۔ جن میں عبدالغنی استخوانی کا ناول ”مسماۃ گیندھریا کی سوانح عمری“ ۱۹۰۷ء، محمد ضیاء الدین عرش گیاروی کا ناول ”ثمرہ نافرمانی“ (۱۹۰۷ء) سید احمد باروی ثم دہلوی کا ناول ”راحت زمانہ کی مریخا رکھائی“ (۱۹۱۰ء) وغیرہ ہیں۔ اس تہمید کے بعد میں اپنے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں، میرا آج کا موضوع رشیدۃ النساء کا ناول ”اصلاح النساء“ ہے جو اب تک کی اطلاع کے مطابق پہلی خاتون ناول نگار تصور کی جاتی ہیں۔ اسی ناول سے کسی خاتون ناول نگار کے قلم سے نکلا ہوا یہ پہلا ناول ہے، اس کی مصنف نے اپنے دیباچے میں جو معلومات فراہم کی ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ناول تحریری شکل میں اپنی پہلی اشاعت یعنی ۱۸۹۴ء سے تیرہ برس پہلے مکمل کر کے رکھ چھوڑا گیا تھا۔ جب لندن کے صاحبزادے محمد سلیمان لندن سے بیرسٹری کی سند لے کر واپس لوٹے تو انہیں اس مسودے کا خیال آیا اور پھر یہ کتابی صورت میں (۱۸۹۴ء) میں اشاعت پذیر ہوا۔ اگر ہم ۱۸۹۴ء میں سے تیرہ برس کو منہا کر دیں تو ۱۸۸۱ء بنتا ہے، گویا یہی ”اصلاح النساء“ کا سال تصنیف قرار پاتا ہے۔

”... محمد سلیمان سلمہ الرحمن کے عمدہ تعلیم پانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ تیرہ برس سے یہ

کتاب جو ردی میں پڑی تھی اس کو انھوں نے چھپوا دیا۔ اللہ تعالیٰ جو بخوردار و موصوف کی ہر طرح ترقی فرمائے۔“

بہار میں ابتدائی اردو ناولوں پر بنگلہ ناولوں کا اثر ہے، ان کے موضوعات، تکنیک اور بہتاد، سب میں بنگلہ ناول کی مثال پیش نظر رکھی گئی ہے۔ شاید عظیم آبادی کا ناول ”صورت الخیال“ اور فشی حلی کا ناول ”نقش طاؤس“ اور کئی اور دوسرے ناول اس بات کی شہادت دینا میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اس طرح کی اثر پذیر فطرت کے عین مطابق یوں تھی کہ اس وقت بہار اور بنگال ایک صوبہ ہونے کے ناطے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ کلکتہ کے بندرگاہ شہر ہونے کی وجہ سے وہاں روزگار کے مواقع بہت زیادہ تھے۔ ہر شخص کی نظر اسی طرف لگی ہوتی تھی، جب بہار اور بنگال میں ریل کا رابطہ تھا، جب بھی وہاں دریائی راستوں سے لوگ روزگار کی تلاش میں اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے جاتے رہتے تھے۔ جب ریل گاڑی کی سہولت عام ہوئی تو گویا بہار اور کلکتہ ایک ہو گئے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ بہار کے بڑے لکھے افراد جو ردی یا دیگر حوالوں سے اپنا بیشتر وقت کلکتہ میں گزارا کرتے تھے۔ وہ وہاں کے ثقافتی و ادبی سرگرمیوں سے غیر متعلق رہتے۔

بجلا ادب کے اثرات کے ساتھ ہی ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ”مرآۃ العروس“ اور ”ہمتاں النعش“ کے زیر اثر یہاں کے ادیبوں کو اصلاحی ناول لکھنے کی تحریک ملی۔ ”رشیدۃ النساء“ کا ناول ”اصلاح النساء“ اس اثر سے خالی نہیں۔ اس بات کے شواہد وہ مکالمات ہیں جو ناول کی ایک کردار لاڈلی اور اشرف النساء کے درمیان ہوئے ہیں۔

لاڈلی :- ہاں مولوی نذیر احمد صاحب نے بھی کتابیں لکھی ہیں، ایک مرآۃ العروس جو لکھی ہے جس میں اکبری، اصغری کا حال لکھا ہے تو کیا سب اصغری ہو گئیں کوئی اکبری دنیا میں باقی نہیں رہی؟ اشرفۃ النساء :- اگر سب اصغری نہیں ہوئیں جب بھی ستوں میں پھرتا تو اصغری ہو گئیں۔ اور پچیس اکبری باقی رہیں، تو کیا یہ فائدہ نہیں ہوا؟

اس کے باوجود اصلاح النساء کی مصنف رشیدۃ النساء کی مندرجہ باتیں قابل لحاظ ہیں، یہ باتیں اگرچہ مرادہ ہیں لیکن مغایم کی کئی جہات رکھتی ہیں۔ اللہ مولوی نذیر احمد کو عاقبت میں بڑا انعام دے ان کی کتاب پڑھنے سے عورتوں کو بڑا فائدہ پہنچا، جہاں تک ان کو معلوم تھا انہوں نے لکھا اور اب جو ہم جانتے ہیں اس کو انشاء اللہ تعالیٰ لکھیں گے۔ جب اس کتاب کو روکیاں پڑھیں گی تو مجھے خدا سے امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ سب اصغری ہو جائیں گی، شاید ستوں میں سے ایک اپنی بد قسمتی سے اکبری رہ جائے تو رہ جائے۔ میرے لکھنے میں علامہ بات یہ ہو گی کہ اس کتاب کے پڑھنے سے عورتوں پر اثر زیادہ ہوگا، اور سمجھیں گی کہ اس نے عورتوں کی رسموں کو جہاں تک لکھا ہے آنکھ دیکھی بات لکھی ہے۔ یہاں اصلاح النساء کی مصنف شاید یہ کہنا چاہتی ہیں کہ عورتوں کی اصلاح احوال کی باتیں عورتوں ہی کی زبان سے اچھی لگتی ہیں اور زیادہ موثر و کارگر ہو سکتی ہیں۔ اس بات کا ان کا تجربہ و مشاہدہ زیادہ قریبی اور مبنی بر حقائق ہوتا ہے، واقعی اصلاح النساء کی اکثر باتیں اندرون خانہ کی ہیں جن تک مردوں کی رسائی مشکل سے ہو پاتی ہے، اور اگر رسائی ہو بھی جائے تو ان کا محیط تحریر میں لانا ان کے لیے غیر معی کھرب ثابت ہوگا، پھر رشیدۃ النساء بھی کہنا چاہتی ہیں کہ موضوعات میں مشابہت بھی ہو تو کیا ہوا، ہر شخص اپنے مشاہدوں اور تجربوں کو بیان کرتا اور انہیں کی مناسبت سے اپنے موضوع میں رنگ بھرتا ہے۔ یہی وہ سبب ہے کہ ایک موضوع پر دو تخلیقات ایک دوسرے سے تمیز و مختلف ہو جاتی ہیں، پھر اس تمیز و فرق کو پیدا کرنے میں وہ سر زمین اور ہاں کی سماجی صورتحال بھی تو ہمارا کردار ادا کرتی ہے جس میں کوئی تخلیق وجود میں آتی ہے۔

اصلاح النساء کی کہانی کا خلاصہ :-

پیشہ کے ایک زمیندار گھرنے میں دو بھائی محمد اعظم اور محمد معظم ہیں، محمد اعظم بڑے اور محمد معظم چھوٹے، محمد اعظم اپنی زمینداری کی دیکھ بھال خود کرتے ہیں۔ کاروبار زمینداری کے معاملے میں نوکروں پر انحصار نہیں کرتے۔ چونکہ مزاج خدا ترس پایا ہے۔ لہذا ان کی کوشش رہتی ہے کہ ان کے کسی فعل سے ان کی رعایا کی دل آزاری کا پہلو نہ نکلے اور ان کے ساتھ بہتر سلوک سے پیش آیا جائے۔ محمد اعظم کو بیوی بھی ان کے مزاج کے عین مطابق ملی ہیں، 'سنگمہ'، خوش طبع اور دین دار، پیسے کو پیسہ سمجھتی ہیں، لہذا ان کے گھر کے اخراجات میں اعتدال اور آمد و خرچ میں توازن برقرار ہے، جس کی وجہ سے کچھ رقم پس انداز بھی کر لیتی ہیں۔ اس کے برعکس محمد اعظم کے چھوٹے بھائی محمد معظم کی بیوی فضول خرچ، جھوٹی شان پر مبنی، بدمزاج، بدسلوک اور ضعیف الاعتقاد ہے۔ اس کی اپنے شوہر سے ہمیشہ تو ترقی رہتی ہے اور شوہر بیوی کی بدزبانی کے آگے خاموشی کو راہ نیچے چلے آتے ہیں۔

محمد اعظم کا بیٹا امتیاز الدین پڑھا لکھا ہے، اس کی طبیعت پر ماں باپ کی تربیت کا بھرپور اثر ہے۔ اس کے برعکس محمد معظم کی بیٹی بسم اللہ الف سے ب نہیں جانتی اور اس کی ماں کا حال یہ ہے کہ اگر کہیں سے خط آگیا تو دوسرے سے پڑھواتی ہیں۔ بسم اللہ اپنی ماں کا بالکل چریہ ہے۔ محمد معظم اپنی بیٹی کے رشتے کے لیے پریشان ہیں، ایک موقع پر وہ جب بڑے بھائی محمد اعظم سے اس کا ذکر کرتے ہیں تو وہ محمد معظم کی ڈھارس بندھاتے ہیں ساتھ ہی امتیاز الدین سے بسم اللہ کے رشتے کی خواہش ظاہر کر کے اپنے چھوٹے بھائی کی مشکل آسان کر دیتے ہیں۔ محمد معظم اپنی بیوی کی مخالفت کے باوجود رضامند ہو جاتے ہیں اور پھر امتیاز الدین اور بسم اللہ کی شادی کر دی جاتی ہے۔ ایسی سہاگ کے پھول مرجھاتے بھی نہیں کہ بسم اللہ اپنے پر پڑنے نکالنے شروع کر دیتی ہے، وہ ایک نو ٹیٹ جاہل، دوسرے عادات و اطوار میں اپنی ماں کے سرچڑھ کر ناپچنے والی ہے۔ جلد ہی امتیاز الدین اور بسم اللہ کے مزاجوں کا بُعد ہر عنوان دونوں کی زندگیوں میں داخل ہونے لگتا ہے۔ امتیاز الدین بسم اللہ کی ہر عادیہ جاکو خاموشی سے برداشت کیے جاتا ہے۔ امتیاز الدین کے والدین کو بسم اللہ کے سنگے چچا ہیں، اس لیے وہ ایسے معاملوں کو نظر انداز کرنے ہی میں عافیت جانتے ہیں۔

ادھر امتیاز الدین ملازمت کے سلسلے میں حاجی پور چلا جاتا ہے، لیکن حاجی پور کے دور نہ ہونے کی وجہ سے ہفتے عشرے میں پٹنے آتا رہتا ہے، امتیاز الدین کے گھر میں دو بچوں کا پیدا ہونا اور پھر ان کا

جانا، اس کے گھر میں ایک اعتقاد بنی ہوئی ہو کر آتا ہے۔ بسم اللہ کی ضعیف الاعتقاد ماں یہ جان کر اور وزیر بھی مشورہ کار کے چکر میں آکر یہ سمجھتی ہے کہ بسم اللہ کسی کا سایہ ہے، چنانچہ وہ بیٹی کو لے کر بہار شریف کی بڑی درگاہ پر چلے کشتی کے لیے چلی جاتی ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور ضعیف الاعتقاد مجاورن سے ہوتی ہے۔ مجاورن بسم اللہ کی ماں سے بسم اللہ کے یہاں آنے کا سبب پوچھتی ہے تو اس کے جواب میں وہ مجاورن سے کہتی ہے کہ اس کے یہاں پیدا ہونے والا بچہ نہیں بچتا اور اس کا شوہر اس سے التفات نہیں کرتا۔ مجاورن بسم اللہ کے شوہر کو اس کا باندھا غلام بن جانے کے لیے اُسے اُلٹا گوشت کھلانے کا مشورہ دیتی ہے۔ بسم اللہ کی ماں اس پر عمل کرنے کیلئے امتیاز الدین کو تاکہ کید کے ساتھ بلوا بھیجتی ہے، امتیاز الدین آتا ہے، اُلٹا گوشت کر کے گوشت پکایا جاتا ہے، لیکن جب کھلانے کا سوال آتا ہے تو گل چہن جو امتیاز الدین کی ماں کی طرف سے بسم اللہ کی خدمت پر مامور ہے، اُڑے آجاتی ہے اور سب باتیں امتیاز الدین کو بتا دیتی ہے، امتیاز الدین بے حد خوف زدہ ہو جاتا ہے اور دسترخوان پر جب کھانا چنا جاتا ہے تو وہ بھوک نہ لگنے کا بہانہ کر دیتا ہے۔ رات جیسے جیسے بھر کر کے صبح سویرے ہی پٹنے کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔ امتیاز الدین نے کسی سے سن رکھا تھا کہ اُلٹا گوشت دشمنوں کو پاگل کرنے کے لیے کھلایا جاتا ہے۔

بسم اللہ اپنی ماں کے آخر میں اس درجہ ہے کہ اسے شوہر کی ذرۂ برابر پروا نہیں، شوہر کو جو تیوں کی نوک پر رکھتی ہے، چٹا کی مدت طویل ہوتی جاتی ہے، اور امتیاز الدین فصحتوں میں گھبراتا اور بے نیل مرام لوٹ جاتا ہے۔ اس صورتحال کو جاننے کے باوجود امتیاز الدین کے والد محمد اعظم ایک خط لکھ کر بسم اللہ کو بلوا بھیجتے ہیں، جواب میں بسم اللہ تو کیا آتی، خط لے جانے والے لازم پر بسم اللہ کی ماں برس پڑتی ہے اور صلواتیں سناتی ہے اور وزیرین کے کہنے پر بسم اللہ امتیاز الدین کو خط میں سخت سست لکھتی ہے اور دوسری شادی کے طے دیتی ہے۔ بسم اللہ کا یہ خط جلتی پرتیل کا کام کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امتیاز الدین دوسری شادی کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ کے طور پر ایک غریب گھرانے کی لڑکی رحمت النساء امتیاز الدین کی دہن بن کر اس کے گھر آ جاتی ہے۔ رحمت النساء پڑھی لکھی، ہنرمند، سلیقہ شعار، محنتی اور ادب و تمیز والی ہے، امتیاز الدین کے پریشان حال گھر کے لیے رحمت ثابت ہوتی ہے۔

دوسری بیوی سے جو سکون پسر آتا ہے تو امتیاز الدین اپنی دیرینہ خواہش یعنی انگریزی پڑھ کر سب ڈپٹی کا امتحان پاس کرنے کی طرف لگ جاتا ہے۔ جہاں چاہ وہاں رہا ہے، سو امتیاز الدین جلد ہی

سب بیٹی کے امتحان میں کامیاب ہو کر اسی عہد سے پرفائز ہو جاتا ہے۔

اودھ جب بسم اللہ اور اس کی والدہ کو اس شادی کی خبر ہوتی ہے تو ماں بیٹی کی آپس میں خوب لڑائی ہوتی اور بیٹی بیٹتی ہے۔ بیٹی ماں کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتی ہے۔ لیکن اب کیا ہوتا۔ تیرکان سے نکل چکا ہے۔ پہلے تو ماں بیٹی وزیرن اور ایک مختاس کے کہنے پر لڑکڑی رہیں، شوہر کے انتقال کے بعد دیسے بھی بسم اللہ کی ماں کو کوئی کام دینے والا نہیں رہ گیا تھا، پھر ایک ہمدرد کے بھلسے پر بسم اللہ امتیاز الدین کے پاس دوسری بیوی کی موجودگی میں واپس آ جاتی ہے۔ رحمت النساء کی قربت اور رویت سے بسم اللہ بے حد متاثر ہوتی ہے۔ رحمت النساء کا بسم اللہ کے ساتھ خوبصورت برتاؤ، بسم اللہ کے لیے کبھی حیرت کا مقام پیدا کرتا ہے اور کبھی ہشامانی میں بدل جاتا ہے جس کا نتیجہ نکلتا ہے کہ بسم اللہ اب اپنی ماں کی ہر بات پر براں میں ہاں ملانے والی نہیں رہتی بلکہ دل و دماغ اور صوبہ بوجہ سے بھی کام لینے لگتی ہے۔

امتیاز الدین کا کنبہ خوش و خرم آگے بڑھ رہا ہے۔ بسم اللہ کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے، جس کا نام نذیر اعظم رکھا جاتا ہے۔ رحمت النساء کے یہاں لڑکی پیدا ہوتی ہے، دادا دادی اس کا نام اشرف النساء رکھتے ہیں، دو سال بعد بسم اللہ کے ہاں بھی ایک لڑکی پیدا ہوتی ہے، اس کا نام امیر النساء رکھا جاتا ہے۔ بسم اللہ کی ماں اسے پیار سے لاڈلی پکارتی ہیں۔

رحمت النساء کی بیٹی اشرف النساء کی تربیت اس کے اپنے زیر سایہ ہو رہی ہے۔ اور بسم اللہ کے بیٹے نذیر اعظم اور بیٹی لاڈلی کی تربیت کی ذمہ داری بسم اللہ اور اس کی ماں پر ہے۔ ان بچوں کی تعلیم کے لیے ایک مولوی صاحب بھی رکھے گئے ہیں۔

رحمت النساء کی معیت و قربت سے بسم اللہ میں تبدیلی تو آئی ہے لیکن ابھی رستی جل گئی، دشمن نہ گئی والی بات باقی ہے۔ بسم اللہ اور اس کی ماں نذیر اعظم اور لاڈلی کے ساتھ بے ضرورت ناز و نعم کا اظہار کر رہی ہیں۔ اللہ تلے زندگی گزر رہی ہے۔ انہیں کھانے کے لیے ڈائیوں کی گودیاں ایک پر ایک واہیں۔ اودھ اشرف النساء براہ راست اپنی ماں رحمت النساء کی تربیت میں ہے، اس کی کھلائی کھل چمن بھی رحمت النساء ہی کی تربیت یافتہ ہے۔ اشرف النساء ابھی ڈیڑھ برس کی ہے لیکن اس کی کھلائی کھل چمن طرح طرح کے کھلونوں پر لاف یا کی تختی پہنچتی رہتی ہے۔ بچی کی عادت یہ ہے کہ جب اس کی ماں رحمت النساء یا کھلائی کھل چمن ناز و قرآن پڑھنے لگتی ہے تو وہ کبھی ماں اور کبھی کھل چمن سے الگ ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے اور رکوع و سجدے کی نقل

کرنے لگتی ہے۔ کل جن بھی کا یہ شوق دیکھ کر گل بوٹے سے آراستہ کر کے ایک مٹی سی جائے نماز اور ایک خوبصورت سی کتاب جلد باندھ کر اس کے لیے تیار کر دیتی ہے۔ بچی اشرف النساء چار برس کی عمر میں اتنی خود اعتماد ہو گئی ہے کہ اب باپ سے مکالمے کرتی ہے اور سوالات کی بوجھ کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس بسم اللہ کے بچے تعلیم سے آراستہ تو رہے ہیں لیکن بے جالاؤ اور پیارنے اہمیں ضدی اور زن مانی کرنے والا بنا دیا ہے۔

اسی اثنا میں جب اشرف النساء سات برس کی ہوتی ہے تو اچانک اس کی ماں کا سایہ اس کے سر سے اٹھ جاتا ہے۔ امتیاز الدین کو رحمت النساء کی رحلت کا دکھ تو بہت ہوتا ہے لیکن مشیتِ ایزدی میں چارہ کیا ہے۔ چنانچہ اشرف النساء کی آنکھ کی تربیت کی ذمہ داری دادی اور کھلائی کل جن پر آ جاتی ہے۔

پندرہ برس کی عمر چڑھتے چڑھتے اشرف النساء بیاہ کر سسرال چلی جاتی ہے۔ اور بسم اللہ کے بیٹے نذیر اعظم اور بیٹی لاڈلی کی شادی بھی ہو جاتی ہے۔ نذیر اعظم کو سردار دلہن کے روپ میں ایک بہت سمجھدار اور پڑھی لکھی بیوی مل گئی ہے۔ نذیر اعظم اگرچہ اپنی ماں اور نانی کے خراب ماحول میں پلتا بڑھتا ہے، لیکن اس کا خون امتیاز الدین کا ہے۔ خون کا اثر اتنا قوی ہے کہ ماں اور نانی کے ماحول کی کبھی بھی آڑے نہ آسکی ہے، دونوں یعنی بسم اللہ اور اس کی ماں کی بُرائی سے نذیر اعظم کی تیسری نسل بہت حد تک پاک ہے۔ نذیر اعظم کی بیوی سردار دلہن مزاج کے اعتبار سے رحمت النساء کی روایت کی فرنگی ہے۔ وہ آتے ہی گھر پر اثر انداز ہو جاتی ہے۔ وزیرن جو اس خاندان کو دونوںوں سے اپنی مکٹاری کا نشانی بنا تی رہتی ہے۔ سردار دلہن اس کو بلوا کر اپنے حُسنِ تدبیر اور رواداری سے ہمیش آتی ہے اور اُسے یہ قبول کرنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ وہ محض پیٹ پالنے کے لیے یہ دھندے کرتی رہی ہے۔ اس کی رواداری اور تدبیر کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وزیرن صدقِ دل سے اپنی حرکتوں سے تائب ہو جاتی ہے۔ سردار دلہن اس خوشی میں گھر والوں کے اشتراک سے وزیرن کو حج پر بھجوانے کا انتظام کر دیتی ہے۔

ناول کا فنی معیار :-

یہ تو تھا "اصلاح النساء" کا خلاصہ۔ اب اس ناول کی فنی اعتبار سے قدر و قیمت متعین کرنے کیلئے اس کی جانچ پڑتال ضروری ہے۔ اس کے لیے ہمیں اس دور کا جائزہ لینا ہو گا جس میں یہ ناول معرضِ تحریر میں آیا۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ یہ ناول ۱۸۸۱ء میں تصنیف کے مرحلے سے گزرتا تھا کہ پوچھا اور پہلی بار ۱۸۹۴ء میں زیرِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ اس وقت اصلاح النساء کی مصنفہ رشیدۃ النساء

کے سامنے دو معروف ناولوں میں ایک ڈپٹی کمشنر احمد کا ناول ”مرآۃ العروس“ اردو سرائے کا عظیم آبادی کا ناول ”صورت الخیال“ تھلا رشیدۃ النساء طبقہ نسواں سے تعلق رکھنے کے ناطے ”مرآۃ العروس“ سے زیادہ قریب تھیں۔ یہ نظری امر تھا، ان کی پسندیدگی کا پڑا اسی جانب جھکتا چاہئے تھا، کیونکہ اس موضوع پر وہ زیادہ بہتر انداز میں اپنے تجربات بیان کر سکتی تھیں، ان کا مشاہدہ کو اعلیٰ نسواں کے باب میں زیادہ قریبی اور صحیح ہو سکتا تھا۔ انھیں باتوں کو محسوس کرتے ہوئے ”بہار میں اردو نثر کے ارتقاء“ کے مصنف ڈاکٹر امین مظفر اقبال نے لکھا ہے:

”بلاشبہ رشیدۃ النساء کے بیانات میں نسبتاً زیادہ واقعت اور صداقت نظر آتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ”اصلاح النساء“ میں مسلم گھرانوں کی معاشرت کی جو تصویریں پیش کی گئی ہیں وہ بالکل سچی، جیتی جاگتی ہیں۔“

کہانی کے خلاصے سے یہ تو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اصلاح النساء کا آغاز اختتام ۱۸۸۱ء کے آس پاس لکھے جانے والے ناولوں کی روش سے ہٹا ہوا نہیں ہے۔ یہ انداز ہر ادا مستقیم پر سحر کرنے کا ہے۔ اصلاح النساء کی مصنفہ رشیدۃ النساء کی مجبوری یہ ہے کہ ان کی تعلیم گھریلو ہے۔ مخصوص سخت گیر مسلم معاشرت کا گھیرائے گد تنگ ہے۔ پھر ناول نگاری کا فن ابھی الف بے کے مرحلے میں ہے، فنی اعتبار سے ناول لکھنے کی سنی اندیزہ میں ٹاک ٹوئیاں مارنے کے مترادف ہے۔ ایسے میں رشیدۃ النساء سے کسی بڑے اجتہادی اقدام کی توقع عبث ہے۔ جب ہم اس کیلئے کو مان لیتے ہیں تو پھر ”اصلاح النساء“ پر بات کرنی نسبتاً آسان ہو جاتی ہے۔

”اصلاح النساء“ تحریر کرتے ہوئے رشیدۃ النساء کے پیشی نظر محض یہ مقصد نہیں رہا کہ ناول کے حوالے سے اخلاقی پسند و نفاق بیان کر دیئے جائیں، بلکہ انہوں نے اپنے ناول کی اساس عورتوں میں روشن خیالی کے فروغ پر رکھی ہے، وہ عورت کے معاشرے کی ہر اعتبار سے تطہیر چاہتی ہیں، اس کا اظہار ناول میں کہیں متن کی سطح پر ہوا ہے کہیں اس کے مین السطور اور کہیں کرداروں کی زبان سے۔

اصلاح النساء میں کردار کے لحاظ سے عمدہ مثال یوں تو بسم اللہ کی ماں، خود بسم اللہ، رحمت النساء اور اشراف النساء وغیرہ کی ہے، لیکن وزیرین کا کردار ان سب پر بھاری ہے کہ اس کی نوعیت یکسر مختلف ہے وزیرین شروع سے آخر تک ناول میں موجود بھی ہے اور ناول کو حرکت میں بھی رکھتی ہے۔ دیکھا جائے تو وہ ایک طرح سے ناول میں ولین کی کمی بھی پوری کر رہی ہے۔ وزیرین عیاری اور مکاری کا مجسمہ ہے، عورتوں کو اور بالخصوص ضعیف الاعتقاد عورتوں کو اٹوٹانے کے لئے، انداز تراشی رہتی ہے۔ اس معاملے میں

میں نے ہزار سا اور ساڑ گارڈین پایا ہے، وزیرین کا کردار Characterization کا ایک عمدہ نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ بسم اللہ اور اس کی وجہ سے وہ اس خاندان میں بری طرح خیل ہے۔ بات بات پر پیر کھینٹی اور پیر جھرتی ہے۔ بسم اللہ کے گھرانے میں خوراسی کسی کو کوئی تکلیف ہوئی اور وزیرین بلوائی لگی۔ اس نے پیر کھیل اور طرح طرح کے مجیر العقول انکشافات کئے۔ اگر یہ تکلیف کسی لڑکی کو ہے تو اس پر جعفر جن اور نہ جانے کس کس جن کا قبضہ بنایا، اور اگر یہ تکلیف کسی لڑکے کو ہے تو اس پر کس کس جن کی بیٹی اور دل بھینک پریوں کو وارفتہ کیا۔ پیر کھینٹنے کے دوران میں خود سوال کیا اور خود ہی اس کے مطابق ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اور بسم اللہ کی قسم کی ضعیف الاعتقاد اور توہم پرست بیبیوں نے بچ جانا اور وزیرین سب کے سر پر ناجت رہی اور ان سے پیسے بھرتی رہی۔

وزیرین کا یہ کاروبار زور شور سے محمد اعظم کے خاندان کی دوسری بیڑھی تک چلا۔ لیکن تیسری نسل میں آکر اس خاندان میں ایک بیڑھی لکھی خاتون سردار دلہن ہو بن کر وارد ہوئی، وہ وزیرین کے چکر کو جلد ہی بھانپ گئی، اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ وزیرین محض اپنا علوہ ماندہ درست رکھنے کے لیے ضعیف الاعتقاد بیبیوں کو اپنا نشانہ بناتی اور ان کی ضعیف الاعتقادی میں حزیلہ اندھیرے جو نکھتی رہتی ہے، لیکن سردار دلہن یہ جان کر بھی کہ وزیرین ایک عرصہ سے اس خاندان کو آلو بنارہی ہے اور ان کے آگے اپنی مکاری کا پتہ اشارہ کھولے بیٹھی ہے، اس کے برخلاف نہ تو سخت گیر ہوئی نہ ہی اس کے ساتھ کسی خراب برتاؤ سے پیش آئی۔ بلکہ اُسے موقع بہ موقع نرمی سے سمجھاتی رہی، اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ وزیرین نے سردار دلہن کے آگے خود ہی اپنی دیرینہ مکاری کا اعتراف کر لیا یہ کہتے ہوئے کہ وہ یہ دھندلے محض بیٹ پالنے کی خاطر کیا کرتی تھی۔ اعتراف جرم کے باوجود وزیرین ”جو رچوری سے جائے پیر پھیری سے نہ جائے“ کی منزل میں کچھ دیر قیام کرتی ہے، لیکن سردار دلہن اس سے مایوس نہیں ہوتی اور وزیرین کو برائی کی دلدل سے نکالنے کیلئے پی کیوشن جاری رکھتی ہے، اور آخر کار ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وزیرین سردار دلہن کے آگے بالکل ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ وزیرین کے ساتھ سردار دلہن کا یہ رویہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اصلاح النساء کی مصنفہ شریفا انسان کو اس کے کیرکڑے کے ساتھ قبول کرتی ہے، وہ اسے نیکی اور بدی کے الگ الگ خانے میں رکھ کر دیکھنے کی قائل نہیں، اور اس معنویت کو وہ انسان کی سرشت و جبلت کا لازمی جزو سمجھتی ہیں۔ اپنے کرداروں کے سلسلے میں مصنف کا یہ شعور انہیں ان کے ہمعصروں میں منفرد و ممتاز کرتا ہے۔

ناول میں جہاں امتیاز الدین کی پہلی بیوی بسم اللہ کے بچے خدیوہ اعظم اور لادلی اور دوسری بیوی رحمت النساء کی بچی اشرف النساء کا بیان ہے، وہ اس بات کی گواہی ہے کہ اصلاح النساء کی مصنفہ بچوں کی نفسیات کو صحیح خطوط پر لے جانے کی کس قدر فکر میں ہیں۔ انہوں نے اشرف النساء کے کردار میں یہ بات سچ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بچوں کا پہلا مکتب ماں کی گود ہے، لیکن اس کو اس کی بھرپور معنویت کے ساتھ سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے ماں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ سبق بھی ملتا ہے کہ بچوں کی تربیت اپنی سطح سے کہنے کی بجائے ان کی سطح سے کرنی چاہیے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ”مرآۃ العروس“ کی اکبری اور اصغری، رشیدۃ النساء کے اصلاح النساء میں بسم اللہ اور رحمت النساء کے روپ میں دیکھی جاسکتی ہے، لیکن مرآۃ العروس میں اکبری اور اصغری دو بھائیوں یا دو الگ الگ شوہروں کی بیویاں ہیں اور اصلاح النساء میں بسم اللہ اور رحمت النساء ایک شوہر کی دو بیویاں ہیں، اس تناظر میں اگر دیکھا جائے تو ”مرآۃ العروس“ کے مقابلے میں اصلاح النساء کا کام مشکل پیچیدہ اور نازک ہو گیا ہے، وہاں ایک عورت کا ایک مرد سے واسطہ ہے۔ یہاں دو عورتیں کا ایک مرد سے۔

بات ”مرآۃ العروس“ کی اس گئی ہے تو یہاں شعیب عظیم کے مضمون مطبوعہ نقوش شمارہ ۱۱۵، ۱۱۶ سے اقتباس درج کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔

”رشیدۃ النساء بیگم کی گھریلو زندگی پر بڑی گہری نظر تھی، یہی وجہ ہے کہ اپنے مشاہدات سے پرہیز پر افانڈہ اٹھایا، اور اپنے ناول میں کردار نگاری اور جزئیات نگاری میں توازن برقرار رکھا ہے اور جو کردار پیش کیا ہے وہ اسی آب و گل اور ہمارے معاشرے کے جیسے جلتے کردار ہیں۔ اور اس میں تنگ و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ یہ کردار فطری ہیں، اس کے برعکس مولوی نذیر احمد نے جو کردار پیش کیے ہیں وہ آئیڈیل ہیں اور ایسے کردار ہمارے معاشرے میں ملنا ناممکن ہیں۔ اور اچھے کردار میں حرکت اور زندگی کی چیل پہل نہیں۔ ان کے اکثر کردار جامد معلوم ہوتے ہیں۔“

”اصلاح النساء میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ نہ تو مفہوم و معنی پر ہے، نہ ہی اس میں مترادف و شریکی سی انتہا پر ہوازی ہے۔ نہایت سلیس اور عام فہم انداز تحریر میں ناول کی کہانی اور نکالناات بیان ہستے چلے گئے ہیں۔ ہمارے خیال میں زبان کی یہ وہی سادگی ہے جس کے لیے آگے چل کر بابائے اردو

مولوی عبدالحق نے وکالت کی اور عمر بھر خود بھی برتے رہے۔ ٹی اکڑ سیّد مظفر اقبال نے اپنی کتاب ”بہار میں اردو نثر کا ارتقاء“ میں بجا فرمایا ہے۔ ”اصلاح النساء کا طرزِ زبان نہایت دل کش ہے، اس کی زبان خاص ناول کی زبان ہے۔“

در اصل آرائشی زبان ناول کے حقائق کی اترا آفرینی کو کم کرنے کا سبب بنتی ہے۔ مغرس و مخرّ بیان کی وجہ سے معنی اوقات قاری انکے مفاہیم کی تسبیحانہ میں لگ جاتا ہے اور بین السطور جو تاثر اور معنی آفرینی کا فرما ہوتی ہے، اس کے سرے سے گزر جاتی ہے۔ ناول میں روزمرہ کی زبان کے استعمال کی محنت یوں پڑتی ہے کہ اس میں بہت سے کردار موجود ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ تمام کردار ایک ہی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں۔ انکے الگ الگ طبقات ہوتے ہیں اور تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ ہر طبقے کی اپنی زبان اور لب و لہجہ ہوتا ہے، ایسے میں ایک مصنف کیلئے اور کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا کہ وہ ایسی زبان لکھے جس کے ذریعے تمام کرداروں کے جذبات اور حرکات و سکنات کے اظہار اور نمائندگی میں آسانی ہو اور جس کی تفہیم سب کے لیے سہل بھی ہو۔ ظاہر ہے ایسے میں روزمرہ کے علاوہ اور کوئی زبان کس طرح مناسب ہو سکتی ہے۔

”اصلاح النساء“ اپنے قارئین کیلئے ایک دلچسپ مطالعہ کیوں بن گیا ہے کہ اس میں پیدائش سے لے کر موت تک کے سارے مراحل میں رسومات اور بدعات کے اثر و رسوخ کو دکھایا گیا ہے۔ اس انداز میں کہ پڑھنے والوں کیلئے تخیل و تفرق کے لمحات بھی آتے ہیں اور کچھ سیکھنے سکھانے کے مراحل بھی طے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک شادی بیاہ ہی کو لے لیجئے، اس کی بیسیوں رسوم و رواج کی ایک تازہ نئی حیثیت بھی ہو گئی ہے۔ آج اگر کوئی شخص یہ جانتا چاہے کہ انیسویں صدی کے آخری ادوار میں پٹنہ اور اس کے قریب وجہار میں شادی کی رسومات کیا تھیں اور لوگ انہیں مختلف مرحلوں میں کس کس عنوان سے برتتے تھے، تو اس کے لیے ”اصلاح النساء“ ایک تاریخ کا بھی کام لے سکے گا۔

اس ناول میں شادی بیاہ کے مواقع پر صرف دلچسپ رسومات کے برتنے کے مناظر ہی سامنے نہیں آتے بلکہ وہ گیت بھی خامی تعداد میں مل جاتے ہیں جو شادی کے مختلف مدارج میں گھروں کی بیبیاں یا مرائیں گاتی ہیں۔ اگر آپ ان گیتوں کا مطالعہ کریں تو بڑے اعکشاف سے گزریں گے۔ یہ گیت نہ صرف خوشی و جشن کے اظہار کا ذریعہ ہیں بلکہ گیت ہی گیت میں شادی کے بندھن میں باندھے جانے والے نئے

جوڑوں کے لئے کچھ خوبصورت اشارے اور ہدایات بھی ہیں، مجھے تو ”اصلاح النساء“ شادی بیاہ کے رسومات اور گیت کا ایک انسائیکلو پیڈیا بھی نظر آیا ہے۔

اب ذرا میں مختصراً ”اصلاح النساء“ سے اقتباس کی صورت میں محمد اعظم کے بیٹے امتیاز الدین کی بارات کی روانگی اور پھر اس کے دلہن کے دروازے تک پہنچنے کا منظر پیش کرتا ہوں تاکہ رسم و رواج اور گیتوں کے استعمال کا قارئین خود اندازہ کر سکیں :

”الغرض جب پورب دروازے سے برات روانہ ہوئی، تو دستور کے موافق دولہا کے سامنے ہنساب اور دس دس قدم کے فاصلے پر لوگ اتار چھوڑتے جاتے تھے، نوشہ کے ارد گرد محمد اعظم کے چند احباب تھے اور گھوڑے کے پیچھے ابرک اور جگمگے کے جھار فانس تھے۔ ان چیزوں کے پیچھے ماماؤں اور لونڈیوں کا غل اٹھا، ان لوگوں کو نہ آرائش دیکھنے سے مطلب تھا نہ روشنی سے غرض، یہ تو اپنے گانے کی دھن میں تھیں، ان احمقوں کو یہ بھی خیال نہ ہوتا تھا کہ اتنے باجوں کے غل میں گانے کا کیا موقع ہے۔ دیوانیوں کی طرح سے نوشے کے پیچھے پیچھے یہ گیت سہ

تیری دادی بلیا لے	اے میرے لال بٹے
ہاتھی بنی ہے	امباری بنی ہے
کھوب بنی ہے ہر بات	اے میرے سو گھر بنے
دولہے کی صورت عجیب بنی ہے	چندلے لیا ہے پھیپھائے
اے میرے لال بٹے	

گاتی چلی جاتی ہیں۔“

”جب (دولہا) آتش بازی کے دھوئیں سے پریشان ہو جاتا تھا تو اس کے ہم خیال دوست جو گھوڑے کے قریب تھے، گلاب سے رومال بھگو کر اُس کو دیتے تھے۔ اس کے سونگھنے سے دھوئیں کے ہزارے محفوظ رہا۔“

جب اس شان و جلوس سے برات دلہن کے دروازے کے قریب پہنچی تو وہاں جو آتش بازیوں کا ڈی گئی تھیں پھوڑی گئیں، دروازے پر لونڈیوں نے گیت گانا شروع کیا۔

گھوٹے پر ادگیو جھٹے پر ادگیو
آج شہانی رات چند اتم ادگیو
سہرے پر ادگیو کٹے پر ادگیو
مڑے پر ادگیو لاڈ پر ادگیو
آج شہانی رات چند اتم ادگیو

یہاں تک تو دوہا کے گھر سے اس کی برات کی روانگی اور دوہن کے دروازے تک پہنچنے کا منتظر تھا۔ اب ذرا اس کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ فرمائیے:

”جب دوہا کے لوگ دوہا کو گھوڑے سے اتار کر زنانی ڈیوڑھی کی طرف لے چلے تو دروازے پر ایک رشتے کے سالے نے دروازہ روکا۔ ان کو بھی کچھ روپے مل گئے، یہ بھی ایک رسم ہے، اس کے بعد دو طرف دونوں نے دوہا کے دونوں بازو پکڑے۔ دو مراثنیں بھی وہاں پر نازل ہو گئیں۔ ایک کے گلے میں ڈھول اور ایک کے ہاتھ میں بانس کا سوپ، اس میں اردا چاول، مصری کی ڈلیاں، پانی، لال ناڈا اور آٹے کے سات چراغ اور سات مٹھیاں خشک کی تھیں، مراثنوں نے ڈھول بجا کر گیت گانا شروع کیا۔“

ان اقتباسات سے ”اصلاح النساء“ کی مصنفہ کی سادہ، سلیس، عام فہم اور دل کو لگنے والی عبارت آرائی کا اندازہ بھی ہوا ہوگا، اور یہ بھی کہ اس موقع پر کس کس طرح کے گیت گائے جاتے ہیں، یہ اس سلسلے کی چند مثالیں تھیں۔ ساری کتاب میں اس طرح کی سادہ مگر دلچسپ عبارت آرائی سے آپ کا واسطہ پڑے گا۔ عبارت آرائی کی اس سادگی نے ایک خاص قسم کے تاثر آفرینی سے مصنفہ کی توجہ کو محسوس کیا ہے۔ علاوہ ازیں مصنفہ کی روشن خیالی اور بدلتی ہوئی اقدار کو کھلے دل سے قبول کرنے کا جذبہ۔ بریں رو کی صورت میں جگہ جگہ کتاب کی مندرجات میں نظر آجائے گا۔ جس سے آپ یہ نتیجہ آسانی سے اخذ کر سکیں گے کہ ”اصلاح النساء“ کی مصنفہ نے تو ہم پرستی اور جہالت کے مقابلے میں سائنسی سوچ کو راہ دی ہے۔

یہ درست ہے کہ ”اصلاح النساء“ کے حوالے سے موضوع کے استحباب میں رشیدۃ النساء

کی ننگہ ”مرآۃ العروس“ لکھی گئی ہے، لیکن فن کے لحاظ سے ان کے بیش نظریہ میں لکھا جانے والا ناول ناول ”صورت الخیال“ رہا جو کا جو یمن جلدوں میں تھا۔ جو رشیدۃ النساء کے ناول ”اصلاح النساء“ کی تصنیف سے تقریباً چھ برس پہلے یعنی ۱۸۷۶ء میں منظر عام پر آچکا تھا جسے بعد کے ناقدین نے جدید ناول کا بجا طور پر پیش رو کہا ہے۔

”اصلاح النساء“ کے مطالعہ کے دوران اس بات کا احساس بھی ہوا کہ اس کی مصنفہ نے بڑی بے ساختگی سے اس علاقے کی مخصوص غریب الاشغال استعمال کی ہیں، مثلاً :

”میں تو سن کر کاٹھ ہو گئی۔“

”میرے ماں باپ نے تمہارا کیا تصور کیا تھا جو تم نے ادن کو اوکٹ دیا۔“

”غرض کہ اوچھڑ ہو گئیں، چلا پھلا کروا ہیات خرافات بکنے لگیں۔“

”جیسا سوت ویسی بھینٹی، جیسی ماں ویسی بیٹی۔“ وغیرہ وغیرہ

”اصلاح النساء“ کے صفحہ ۱۴۲-۱۴۳ پر دو مقامات ایسے ہیں جہاں لفظ پنجیری کا استعمال ہوا ہے۔ اس کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ کھانے پینے کی شے ہے اور لڑکی کے والدین اپنی بیٹی کے ماں ولادت کے موقع پر منوں کے حساب سے برادری میں تقسیم کروانے کے لیے سمجھاتے ہیں۔ پنجیری بھیجا کرتے ہیں۔

اب تک میں پنجیری کو خالص پنجاب کی شے سمجھتا تھا۔ ہمیں اس کا ذکر میں نے پہلی بار اور پھر بار بار لوگوں کی زبانی سنا۔ ٹی۔ وی ڈرامے ”پنجیری“ کی مقبولیت کی وجہ سے ہر خاص و عام کے زبان زد ہو گیا۔ لیکن ”اصلاح النساء“ کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ پنجیری بہار کی پرانی چیز ہے۔

اس ناول میں روشن خیالی اور قدامت کے الگ الگ رخ کو امتیاز الدین اور ان کی بیگم بہار اللہ کی مدد سے پیش کیا گیا ہے۔ امتیاز الدین انگریزی تعلیم کی وجہ سے انقلاب زمانہ سے آگاہ ہیں۔ اشیاء کو اس کے حقیقی پس منظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر ان کی بیگم پران باتوں کا

کئی اثر نہیں ہوتا، وہ اپنا ہر کام نذر نیاز، اور ٹوٹے ٹوٹے کی مدد سے نمٹنا چاہتی ہیں، بات بات پر پیر یا برین بلوائی جاتی ہے۔ اور اپنے منہ کے محل انہیں میں ڈھونڈا جاتا ہے، بچے کی پیدائش پر ہزاروں روپے زائچہ نکلوانے اور فال کھلوانے کی نذر کر دیتی ہیں، لیکن بچے کی حفاظت کے لیے چوچک کے ٹکے

نہیں لگوائے جاسکتے۔

چنانچہ ایک موقع پر جب امتیاز الدین کے محلے میں چیچک کی وبا پھیلی اور امتیاز الدین نے اپنے بچے کو ٹیکا لگوانا چاہا تو ان کی بیگم بسم اللہ نے گھر سر پر اٹھالیا، امتیاز الدین نے ٹیکے کے فوائد لاکھ گنوائے، لیکن یہ باتیں ان کی بیگم کے سر سے گزر گئیں اور سویاتوں کی ایک بات کہ:

”یہ سب کچھ نہیں ہوگا اگر ڈاکٹری چھاپا دیا جائے گا تو میری اماں کو اس کا بہت رنج ہوگا۔“

غرض کہ اس بچے کو ٹیکا نہیں دیا گیا۔ روٹیاں کھیں، اس پر بھدرا اور لال ناٹا رکھ کر حضرت فرید شکر گنجؒ کی فاتحہ دلائی گئی۔ ناٹا بچے کے گلے میں ڈال کر بسم اللہ مطمئن ہو گئیں کہ بچہ محفوظ ہے۔ جب چند روز کے بعد بچے کو بخار آیا تو حضرت جلال بخاریؒ اور معروف کرنی اور پیر خطرا کا پیمبر بازو پر باندھا گیا، لیکن بخار کسی طرح نہیں اُترا۔ چیچک کے دلے نکل ہی آئے۔ اور آخر کار رنجی حواس کا خدشہ تھا۔ بچہ مر گیا۔

”اصلاح النساء“ کی مصنفہ کی بزرگوں سے عقیدت اپنی جگہ قائم ہے، وہ تو اس سارے واقعے سے صرف یہ بتانا چاہتی ہیں کہ کسی مرض کا شافی علاج دوا ہے، ٹوٹے ٹکے نہیں ہے۔ مصنفہ نے اپنے اس موقف کو کردار کی زبان، ان کے طرز عمل اور ان کے حرکات و سکنات سے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ دیکھا جائے تو یہ پورا ناول عورتوں میں توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کے خلاف جہاد ہے۔ جن کی وجہ کر پورا معاشرہ تباہ و برباد تھا۔

”اصلاح النساء“ کی مصنفہ رشیدۃ النساء کھلے ذہن کی مالک تھیں، جسے عرف عام میں روشن ضمیری و روشن خیالی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان کے یہاں یہ روشن خیالی علم کے ذریعے بھی آئی، اور وراثت میں بھی ملی۔ وہ شمس العلماء سید وحید الدین خان بہادر، پیر سٹراپٹ لاک بیٹی، شمس العلماء نواب سیدامداد امام اشرفی بہن، بہار کے رئیس اور مشہور وکیل مولوی بیچنی کی بیوی، سر علی امام حسن امام کی چھوٹی بیٹی، پیر سٹرا محمد ریلان، لریڈی سر عبدالرحیم اور بہار کی پہلی صاحب دیوان شاعر نثار کبریٰ (جس کے شعری مجموعے کا نام ”خیالات کبریٰ“ ہے اور ۱۹۳۹ء میں قومی پریس ہائیکلی پور پرنٹ سے شائع ہوا ہے) کی والدہ تھیں۔ اتنا کچھ بتا دینے کے بعد اب اس بات کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ ان کا ادبی تہذیبی اور معاشرتی ماحول و منظر کیسا ہوگا۔

”اصلاح النساء“ میں کچھ غیر متعلق باتیں بھی درآئی ہیں، جیسے ملوے وغیرہ پکانے کے طریقے اور بیماریوں کے علاج کے نسخے جو بہر حال قاری کو کھٹکتے ہیں، لیکن اس کے معاشرانہ ناول ”فساد خورشیدی“

کو بڑھتے ہیں جو قزاق افضل الدین کا لکھا ہوا ہے۔ تو وہاں بھی ناول کے متن میں لطیفے اور چٹکے الگ سے ٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے قدیم ناگوں میں ناظرین کا موڈ بدلنے کے لیے الگ سے کالم جوڑنے کا رواج تھا۔ اس توڑ جوڑ کی غرض محض منہ کا ذائقہ دلانا ہوتی تھی۔

”اصلاح النساء“ شروع سے آخر تک دلچسپ ناول ہے، اس کا پہلا حصہ ۲۲۲ صفحات اور دوسرا حصہ تقریباً ۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اب اس سلسلے میں جو آخری بات کہنے کے لیے رہ جاتی ہے وہ یہ کہ اگر نئی اعتبار سے اس ناول میں کچھ ڈھیلا پن یا بھول نظر آتا ہے تو یہ اس دور کا ڈھیلا پن ہے جس میں ناول نگاری کا فن پاؤں پاؤں چلنا سیکھ رہا تھا، ابھی اس کے پاؤں زمین پر درست نہیں پڑ رہے تھے۔ اسے استقامت سے چلنے اور منزل بہ منزل جاتی میں قدم رکھنے کے لیے ایک طویل عرصہ درکار تھا۔ ان معروضات کو پیش نظر رکھ کر اگر ”اصلاح النساء“ کے بارے میں کچھ اور کہنا ہو تو یہی کہا جائے گا کہ یہ ناول ”مرآة العروس“ کے مقابلے میں زبان و بیان، کلمہ اور معاشرت کے لحاظ سے اپنی مٹھی سے جڑا ہوا ہے۔ کسی تخلیق میں اس رشتے کا اظہار اگر نہ ہو تو فنی اعتبار سے اس تخلیق کا ڈھنڈا تصنع سے جاملتا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں تصنع اثر آفرینی کے لئے سم قاتل۔!

خواجہ احمد عباس۔ ایک دانشور صحافی (رواں دھائی کے آزاد قلم کے حوالے سے)

خواجہ احمد عباس صف اول کے ناول نگار، افسانہ نگار، ڈراما نویس، اردو ہندی اور انگریزی کے ممتاز صحافی، فلم ساز اور دانشور تھے۔ وہ اپنی اس علمی و ادبی خاندانی وراثت کے نمائندہ تھے جس کا سلسلہ مولانا حالی سے ہوتا ہوا مدینہ منورہ میں رسول اکرمؐ کے میزبان جلیل القدر صحابی حضرت ابوالیوب انصاری سے جاملتا ہے۔

”خواجہ احمد عباس کے ذہنی اور فکری نشوونما میں چار مختلف عوامل یا محرکات کارفرما رہے ہیں۔۔۔ (ان میں) سب سے پہلی قوت جو انکی تربیت پر اثر انداز ہوئی، ان کا خاندانی ماحول اور اسکی روایات تھیں۔ کسی لوٹ اور لالچ کے بغیر ملک قوم اور انسانیت کی خدمت کا جذبہ انہیں اپنے پرانا خواجہ الطاف حسین حالی اور والد غلام السبطین سے ورثہ میں ملا تھا۔ بقول خواجہ احمد عباس۔ انہوں نے مجھے سچ بولنا سکھایا کسی کے سامنے سر نہ جھکانا سکھایا۔

انہوں نے مجھے سکھایا کہ سب انسان برابر ہیں۔ کوئی اونچا اور نیچا نہیں ہے۔ اور جنہوں نے مرتے دم تک میرے لیے کوئی جائداد نہیں چھوڑی سوائے انسانیت کے چند اصولوں کے۔ دوسرا اہم محرک مہاتما گاندھی کے عدم تشدد اور ستیہ گرہ کے خیالات تھے۔ وہ گاندھی جی کی طرح ہندوستان کے غریب عوام کی اخلاقی قوت اور تہذیبی اقدار میں یقین رکھتے تھے اور سچائی کی تلاش میں اپنے ضمیر کو بھاری رہا سمجھتے تھے تیسرا محرک چٹت خواجہ اہلال نہرو کی محرک شخصیت تھا جس نے انہیں شمت سے متاثر کیا، ان کا تاریخی شعور زندگی کے بارے میں اُن کا سائنسی فک نظر یہ اور سب سے جڑ کر اُنکی تعقل پسندی جو ہر طرح کی قدامت پرستی، فیوڈل اقدار اور حکمت پرستانہ خیالات کی حریف و مخالف تھا عباس کی شخصیت پر غزنائی نقوش چھو گئی اور آخری اہم محرک کارل مارکس کی شخصیت اور اس کا سائنسی فک نظر یہ تھا جس نے انہیں طبقاتی استعمار اور سامراج کی گھناوٹی سازشوں کے خلاف اُن تک جدوجہد کا حوصلہ بخلا اسکے نتیجے میں وہ انصاف امن اور آزادی کے لیے ساری دنیا کے محکوم اور بے کچلے عزت کش انسانوں کی جدوجہد

ہے ایک احساس یگانگت محسوس کرتے رہے ان کی حمایت کے لیے انہوں نے اپنی ساری ذہنی اور تخلیقی صلاحیتوں کو وقف کر دیا تھا۔

خواجہ غلام السیدین جو اپنے عہد کے معروف ادیب و دانشور اور ماہر تعلیم تھے انکی شخصیت کے کئی نمایاں اثرات اُن پر پڑے۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

”بھائی جان کی میز پر بیٹھ کر ان کے ادبی کھانوں کی بدولت میں نے زندگی کے بارے میں جو کچھ سیکھا، وہ اپنی پوری طالب علمی کے زمانے کے ان پچھروں سے زیادہ تھا جو مجھے کلاس روم میں برواشت کرنا پڑے۔“

چنانچہ تذکرہ بالا افراد اور ان کے افکار کی جلوہ گری خواجہ احمد عباس کی شخصیت اور فن پر نمایاں ہے۔ انہوں نے دوسری جنگ عظیم سے پہلے دنیا کا سفر مکمل کر لیا تھا، جہاں ایک طرف لوگوں کی ترقی و فراع البالی دیکھی تو دوسری جانب مظلوم اور دبے کچلے انسانوں کے آلام و مصائب کا بغیر نفس نفیس مشاہدہ کیا۔ آزادی کے بعد اپنے ہی ملک میں مسائل پیدا ہونے سے حوصلہ طلب تھے۔ روٹی، کپڑا اور مکان کا مسئلہ، فرقہ وارانہ فساد، عدم مساوات، مذہبی جنون، علاقائی ولسانی تعصب، دہشت گردی اور انتہا پسندی اور پھر دولت مند طبقوں اور سیاست دانوں کے ذریعہ پھیلائی ہوئی غلامت میں اپنے معصوم افراد کی کس پرہی۔ ملک کے انہی حالات نے خواجہ احمد عباس کو بے حد متاثر کیا۔ ان کی غیرت و حمیت کو لٹکارا۔ کچلے آسمان کے نیچے فٹ پاتھر پر سونے والوں، ایک ایک قطرہ پانی، کے لیے پریشان حالوں اور گھر کے اندر بچ پیدا کرنے والیوں نے انہیں متوجہ کیا۔ سسکتی کلتی انسانیت کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کے قطرے اُن کے دل پر ٹپکنے لگے۔ چنانچہ انہوں نے عبادت کی تعمیر نو کا عزم کیا۔ سماج کے فرسودہ نظام کو بدلنے کی ٹھانی، دشمنی اور نفرت کے خاتمہ کا بیڑا اٹھایا۔ بقول اُن کے:

”میں ان تمام ہندوستانیوں سے محبت کرتا ہوں سب سے ہمدردی رکھتا ہوں۔ سب کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں اس لیے کہ وہ میرے ہم وطن ہیں میرے ہم عصر ہیں۔ میں اپنے افسانوں میں انکے چہرے اور کردار دکھانا چاہتا ہوں۔ نہ صرف اوروں کو بلکہ خود انکو۔ انسان کو ہمارے کو شیشہ دکھانا بھی ایک انقلابی فعل ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ خوش فہمی نہیں بلکہ خود فہمی اپنی ذات کو سمجھنا بھی بڑی سماجی اور نفسیاتی تبدیلیوں کو حرکت میں لاسکتا ہے۔“

چنانچہ اس کے لیے انہوں نے ترسیل و ابلاغ کے مختلف وسیعے اختیار کیے، جیسا کہ رقم طراز ہیں:

”مجھے کچھ کہنا ہے اور وہ ممکن طریقے سے کہنے کی کوشش کرتا ہوں کبھی بلنر میں آخری صفحہ اور آزاد قلم لکھ کر کبھی دوسرے اخباروں اور رسالوں کے لیے مضمون لکھ کر کبھی افسانے کی شکل میں کبھی ناول کی کبھی ڈاکو منتری قلم بن کر کبھی دوسروں کی قلم کی کہانی یا ڈائجسٹ لکھ کر کبھی خود اپنی نظم نثر گٹ کر کے۔“

اپنے مقصد حیات اور سطح نظر کا اعادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”میری زندگی کا ایک ہی مقصد ہے وہ یہ کہ میں اپنے خیالات کو جہاں تک ممکن ہو سکے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچاتا ہوں۔۔۔ بار بار کہتا ہوں۔ کیا فائدہ ہوتا ہے۔ ایک چھوٹا سا طبقہ نوجوانوں کا مجھے اور میری تخلیقات کو پسند کرتا ہے اور میری تصانیف پڑھ کر اور میری قلم دیکھ کر سوشلزم، انسان پرستی، عالمی امن کی طرف ہوجاتا ہے۔ یہ چند لوگ میری کاوشوں کا صلہ ہیں۔ اگر ان کی تعداد بڑھ گئی تو میں اپنی زندگی کو کامیاب سمجھوں گا۔“

دراصل خواجہ احمد عباس اس لوگوں میں نہیں جو صرف ملک کی عظمت گذشتہ کا مرثیہ پڑھتے ہیں یا حالات حاضرہ پر پسینہ کوئی کرتے ہیں بلکہ وہ ایک ایسے بندوستان کا خواب دیکھتے ہیں جو افلاس، ظلم و استحصا، ذات پات کی بے رحمانہ تفریق ہر طرح کی تنگ نظری اور فرقہ پرستی سے پاک ہو۔

اپنے اسی نقطہ نظر اور لائحہ عمل پر ثابت قدمی سے ڈٹے رہنے کے لیے انھوں نے کسی ”ازم“ یا تحریک کے بندھے نئے اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے بجائے حقیقت پسندی کو اپنا رہبر و رہنما بنایا۔ نتیجتاً ترقی پسندوں نے ان کے خلاف رزولوشن پاس کیا، کمیونسٹوں نے حکومت کا حاشیہ دار ہونے کا الزام عائد کیا، ہمارا شٹر میں مرارجی ڈیسائی کی حکومت نے مارکسٹ سمجھ کر پاسپورٹ دینے سے ہی انکار کر دیا۔ اخباروں نے ان پر سی آئی کے اور امریکی ایجنٹ کا فحشی لگایا۔ کسی نے متعصب اور لائزبب قرار دیا۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ سچ بولنے کی پاداش میں ان پر تاقلا نہ حملے کیے گئے ان کے خلاف مقدمے بھی دائر ہوئے۔ ان حالات کے پیش نظر سوال یہ ہے کہ آخر خواجہ احمد عباس کیا تھے؟ کہا جاسکتا ہے کہ وہ انسانیت کا درد رکھنے اور سچ بولنے والے ایک دانشور قلم کار تھے۔ حقیقت پسند، بے باک اور بے خوف مفکر تھے جنہوں نے عدم مساوات، ظلم و استحصا اور جمہوریت کی بے لگام آزادی کے خلاف آوازیں بلند کی۔ وہ سمجھتے تھے کہ عالمی امن و مساوات اور اخوت و محبت کے بغیر حقیقی ترقی کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ لہذا انھوں نے دنیا کے ہر گوشے میں ہونے والے

ظلم، عدم مساوات اور جبر و تشدد پر ظلم اشعلیا ان کے خلاف ایک طویل جنگ لڑی جس کے لیے اپنی فکری بصیرت اور بصارت کو کسی ایک صنفِ ادب یا تنگ محدود کرنے کے بجائے انہوں نے مختلف جہتوں سے اس کا انہار کیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب انقلاب آتا ہے تو وہ زندگی کے صرف ایک شعبے میں نہیں آتا، وہ زندگی سیاست اور صحافت، کلچر، زبان، ثقافت اور معاشیات کے مختلف النوع پہلوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔ ظاہر ہے یہ تصور کسی دانشور اور وسیع النظر مفکر کا ہی ہو سکتا ہے۔ جو زندگی کے زیادہ تر پہلوؤں اور شعبوں پر سیر حاصل بھگا رکھتا ہو۔

اُردو میں دانشورانہ افکار موجودہ دہائی (۸۸-۸۹ء) کے مرکزی تہیم (Theme) کے پیش نظر آگے بڑھنے سے پہلے یہ سوال دامن گیر ہے کہ اُردو دانشوری پر گفتگو کو صرف ایک دہائی سے بھی کم کے عرصے پر محدود کرنے میں کیا مصلحت ہے جیسا کہ ادارہ تحقیقات اُردو کی تیسرے ریسرچ کانگریس کے دعوت نامے میں درج ہے۔ اُردو میں دانشوری کی تلاش اور شناخت مختلف اصنافِ ادب و سخن میں بھی کی جا سکتی ہے اور کسی مصنف کے افکار و خیالات کا احاطہ کر کے بھی۔ اُردو کی کسی تحریک کی کاوشوں کا جائزہ لے کر بھی اور کسی دبستانِ ادب کے کائناتوں کا جائزہ لے کر بھی۔ اس کے علاوہ مختلف سطحوں پر اُردو کے تحقیقی مقالات کے نتائج کو سامنے رکھ کر بھی یا پھر دس سال کے اُردو کے تمام سرمایہ کو مجموعی طور پر سامنے رکھ کر بھی یہ تلاش کی جا سکتی ہے۔ تاہم دانشوری جیسے ہر گز لفظ کو صرف چند برسوں میں قید کر کے دیکھنا شاید بہت دانشورانہ نہ ہو۔ پھر بھی حسبِ ارشاد دیکھنا ہے کہ اس مختصر مدت میں اُردو میں دانشورانہ افکار کی نشاندہی اور نمائندگی کن کن سطحوں پر ملتی ہے۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ادھر آٹھ دس برسوں کے درمیان اُردو میں نہ تو کسی فکر، تحریک، رجحان، ازم اور دبستانِ ادب نے زور پکڑا ہے۔ اور نہ کسی دانشور کی تحریر نے ہی کوئی انقلاب یا تبدیلی برپا کی ہے۔ یا کم و بیش نمایاں اثرات ہی مرتب کیے ہیں۔ اس درمیان لے دے کر وہی شخصیتیں، افکار یا رجحانات ہیں جنہی دانشوری کی شناخت موجودہ دہے سے پہلے ہی قائم ہو چکی ہے۔ اس کے برعکس رواں دہائی میں دانشوری کی رفتار اگر تہی نہیں تو سست روی کا شکار ضروری ہو گئی ہے۔ کیونکہ محض کتابوں کی اشاعت میں تیز رفتاری یا چند اشخاص کا بہت نمایاں ہونا دانشوری میں اضافے کا باعث نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اگر موجودہ دہائی کی عالمی صورتحال کا جائزہ لیا جائے تو اس درمیان چند مصالحتی واقعے، کچھ خیرگال کے جذبے کی پیش رفت کے علاوہ وہی قتل و غارتگری بڑی طاقتوں کی آویزش انتہا پسندی اور دہشت گردی

کے سوا کوئی بہت اہم اور پرامید صورت نظر نہیں آئی۔ نہ ہی دنیا کی تاریخ و جغرافیہ، تہذیب و تمدن، سیاست و ثقافت کے بارے میں کوئی قابل لحاظ و امتیاز تبدیلی رونما ہوئی ہو جس نے ہمارے ادب کو کوئی تازہ دانشورانہ موڑ دیا ہو۔ بد قسمتی سے اس دوران ہندوستان میں غربت و افلاس، فرقہ وارانہ فساد، مذہبی احمیا پسندی، قانون و انتظامیہ کی بگڑتی صورت، مسانی و ملاقاتی تعصب، تشدد، اخلاقی جرائم، آفات سلوئی وارضی میں اضافہ ضرور ہو چکے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے خواجہ احمد عباس نے اپنے دانشورانہ انکار کے کون سے نقوش چھوڑے۔ ان کی تحریروں نے اردو ادب کو کون سا دانشورانہ رخ دیا۔ یہ امر ذہن نشین رہے کہ خواجہ احمد عباس کی ناولیں، ڈرامے، بیشتر افسانے اور نظمیں (صرف ایک "نیا آدمی" چھوڑ کر) اس دہائی کے زیر مطالعہ نہیں آئیں لیکن اس عرصے میں انکی صحافت اور بالخصوص اردو بلٹز کے لیے آزاد قلم کے تحت لکھے جانے والے آخری صفحے کے حوالے سے اس دہائی میں انکی دانشوری کا جائزہ اس مقصد کے لیے لیا جاسکتا ہے۔

خواجہ احمد عباس بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی بنیادی طور پر ایک ادیب اور صحافی تھے۔ صحافت کا آغاز عبد طالب علمی سے ہی کیا۔ کئی رسالوں کے خود مدیر رہے اور قومی سطح کے موقر اخبار مثلاً "نیشنل کال سنڈستان" نامہ، "بایک کرائیکل" میں کام کیا۔ ۱۹۴۷ء سے ہفتہ وار بلٹز کے اجراء کے ساتھ تادم مرگ اردو ہندی اور انگریزی میں ان کا لکھا جانے والا آخری مضمون تہجی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ ملک کی مختلف زبانوں کے رسائل میں بھی انکی تحریریں شائع ہوتی رہیں مگر بلٹز میں اپنا کالم غیر منقطع طور پر اس شان سے جاری رکھا کہ "بلٹز کے ایڈیٹر سے یہ بھی منوالیا کہ وہ جو چاہے لکھے گا۔ لاسٹ پیج میں لکھے گا۔ اس میں کاٹنے چھلٹنے کی اجازت نہ ہوگی اور اس کا تادان وہ یہ دے گا کہ بہت کم معاوضے کا (بلٹز کے معیار سے) اور یہ شرط چالیس سال تک قائم رہی۔ خواجہ احمد عباس نے جو بھی لکھا، جس کے خلاف لکھا، جتنا سخت لکھا، بلٹز کو پالیسی کے موافق لکھا یا مخالف لکھا اسے جوں کا توں شائع کیا گیا۔"

"آزاد قلم" کی مقبولیت جہاں عوام میں تھی وہیں خود خواجہ عباس نے بھی اسے اپنی تمام تحریروں کا حاصل سمجھا اور جس پر انہیں استغناء و اعتماد تھا کہ انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ "آخری سفر کے وقت ان صفحات کو چادر کی صورت میں ان کے جسم پر لٹھا دی جائے۔" ان کی یہ جذباتی خواہش شاید اس لیے بھی تھی کہ انہیں، بالخصوص پر یہ احساس تھا کہ ان کی تحریروں یا نظمیں استغناء و سبوح طے میں نہیں پہنچ سکی ہوں گی جتنا آخری صفحے میں پیش کیے

جانے طے لگنے کے انھار تاثر و تاثر کا سبب بنتے ہوں گے۔ تقریباً ۳۳ برسوں تک لکھے جانے والا آزاد قلم اردو کا نام نگاری کی تاریخ میں اپنی مثال نہیں لگتا۔ یہ انصاف ہی کہ کیا موقوف انگریزی بلز کا سوٹ بیچ بھی طویل ترین عرصے تک لکھے جانے والے مصنف نے چند کالموں میں سے ایک ہے۔ صرف امریکہ کے آرٹ بلک ورلڈ اور ٹیلیفون کے کنکٹر لے ہڈن کو چھوڑ کر دنیا کے کسی زبان کے مصنف نے اس قدر لمبے عرصے تک کالم نگاری نہیں کی۔

یوں تو انگریزی بلز کا سوٹ بیچ بین الاقوامی ماحول اور اردو کا آزاد قلم ملکی معاملات کے لیے مخصوص تھا پھر بھی آزاد قلم میں اس درمیان قومی یا بین الاقوامی سطح پر کوئی بھی اہم موضوع نہیں جس پر خواجہ احمد عباس نے قلم اٹھایا ہو خاص طور پر ٹروس ممالک کے حالات پر اہل خیال محتاط ہے۔ لیکن یہ غرض ہے کہ آزاد قلم لکھتے وقت خصوصیت سے ان کے پیش نظر ملکی مسائل تھے۔ ان کے سامنے آنادی کے بعد کا وہ ہندوستان تھا جس کے لیے انھوں نے نہ جانے کون کون سے پسینے دیکھے تھے۔ ستیہ ادا ہنسنا، ترقی و نجات کے کتنے ارمان وابستہ کیے تھے۔ اتحاد و اتفاق کی کتنی مالا میں گوندھنے کی تمنا کی تھی مگر انھوں نے کہ یہ سب ایک کے بعد ایک اٹھنے ڈرانے سپنوں کی شکل میں سامنے آئے۔ اہل وطن غریب و غریب متغاد اور متضاد رجحانات سے دوچار ہیں جمیں تعمیر و ترقی کا حوصلہ بھی ہے اور رجعت و تخریب کی پسپائی بھی۔ خواجہ احمد عباس نے ان حالات کے خلاف قلمی جہاد چھیڑا۔ لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ ان کی بے راہ روی پر انگلیاں اٹھائیں۔ لوگوں کے کان ناموں پر داد اور بُرے کاموں پر تنقید کی۔ دبے کپلے عوام کی آواز کو ایوان اقتدار تک پہنچایا تو صاحب اقتدار کی بے راہ روی سے عوام کو روشناس کرایا۔ کسی کی پرواہ کیے بغیر رنج کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہتے رہے۔ غرض کہ آزاد قلم ایک ایسا جام جہاں تھا جمیں بدعنوانی، تشدد، تمام قسم کے تعصبات، افلاس، بے ہمتی، عدم مساوات، دہشت گردی، انتہا پسندی، شدت پسندی، اخلاقی جرائم، حکومت کی نااہلی، خواتین اور کمزور طبقات پر ڈھکے چھانے والے مظالم، توہم پرستی، مذہبی جنون، بنبد ہڑتال، قومی سالمیت و یکجہتی تحفظ آنادی کھسلاؤں کا مسئلہ، اسمگلنگ، منشیات کا استعمال جنسی امراض، اغوا، جاگیر دارانہ مزاج، تعمیش پسندی، ڈاکوؤں کی یورش ہائی جیکنگ، دفاع، ملکی بحیث، خوراک، قحط، سیلاب اور ان کے علاوہ بے شمار موضوعات کی جھکیاں ملتی ہیں۔ جن کے ذریعہ انھوں نے عصری آگہی سے بہرہ ور کیا جو ہر حال ایک مفکر اور دانشور ہی کر سکتا ہے ایک انداز سے کے مطابق خواجہ احمد عباس نے ۴۳ برسوں میں تقریباً ۶۰۴۲ آزاد قلم کے صفحات لکھے جو تاریخ صحافت میں ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ دہاں دہائی (جون ۸۷ء میں انتقال تک)

میں اسکی تعداد گنگ جنگ ۳۱۲ ہے۔ آزاد قلم کو خواجہ احمد عباس کی کالم نگاری 'بے باک' اور بے خوف صحافی کی کارکردگی بہتر کرنا نہیں پاسکتا بلکہ ان صفحات میں آزادی کے بعد کے ہندوستان کی تاریخ، اس کے نشیب و فراز، اسکی باہری دباؤ اور اندرونی انتشار، اس کے آئینہ نشی لمے اور اسکی ترقی کی ایک داستان محفوظ ہے یہ صفحات ایک ایسے دانشور کی فکر و نظر پر مبنی ہیں جس نے مرض کی علامت، بیماری، تشنیں بھی کی، دوا، توجیز کی اور پریز کی فہرست بھی دی۔ اس طرح انھوں نے کتنے ہی امراض کا انکشاف کیا جو ایک طغیانی موضوع ہے تاہم صرف اعلان دہائی سے 'آزاد قلم' کے چند عنوانات بطور نمونے پیش ہیں:

- ۸۔ جنوری ۱۹۸۳ء : نیگلے پن کا علاج ماسکویں۔
- ۱۵۔ : میرے دل کی بات سنو۔
- ۳۳۔ : لاپرواہی فیشن اور استحصال، لڑکیاں کہاں جا رہی ہیں۔
- ۳۹۔ : فلم اور قتل — فلموں سے جرائم کی تحریک۔
- ۵۔ فروری : اسٹیشن جلاؤ — آسام بچاؤ۔
- ۱۲۔ : اسلام اور انگریزیت — بین الاقوامی اسلامی عدالت۔
- ۲۹۔ : پھول دیوی کی کہانی۔
- ۱۲۔ مارچ : بجٹ کا چڑیا گھر۔
- ۱۹۔ : آخر جو اسر لال کی بیٹی ہی نکلی، کیا خدا غیبی کی سلامتی کے لیے کافی نہیں۔
- ۲۹۔ : جنگ سنت کبیر کے نام پر رہنمائی پر غم۔
- ۴۔ جنوری ۱۹۸۶ء : نشان زندگی پاتا ہوں پانی پت کی لہروں میں۔
- ۸۔ : یہ شروعات ہے دنیا کا خدا حافظ۔
- ۲۵۔ : تعمیر مشکل مخرب آسان۔
- یکم فروری : لیک ہرانی پنجابی۔
- ۸۔ : جموری اور جاسوسی — جیمز ہائڈ کے ہندوستانی بھائی بھائی بھائی۔
- ۲۵۔ : دال بھلت بھی منہ لگا۔
- یکم مارچ : ایک مندر کی چوبیس کی بیٹی۔ جسکی شادی میں سات ہزار مہمان آئے۔

- ۸ مارچ ۱۹۸۶ء : منزائے موت کے ہم خلاف نہیں لیکن۔
- ۲۲ : سستی شیعہ مجاہدین اور قبریں۔
- ۳ : جان بچانے اور جان لینے والی دوائیں۔
- ۱۰ : ہمارے نسلانٹ کیوں جیتے ہیں۔
- ۱۷ : لکھنؤ میں ترقی پسند معنفین کا گولڈن جلی جلسہ۔
- ۲۳ : شیواجی مہاراج کو بدنام کیوں کرتے ہو۔
- ۳۱ : یرنالا جو تیل کا رکھوالا۔
- ۵ جولائی ۱۹۸۶ء : الہ آباد میں آئندہ بھون۔ مگر شہر میں آئندہ نہیں۔
- ۲۲ : صلح و محبت کا پیغام۔
- ۲۹ : گجپون رام اور گاندھی جی کا سپنل۔
- ۸ ستمبر ۱۹۸۶ء : بین شکلی پروگرام۔ نام یا کام
- ۱۳ : ضیاء الحق کو گیتا کا تحفہ
- ۲۰ : ایک حق پسند ہندو بھائی کا انکشاف ایک سوجھی سمجھی سازش۔
- یکم نومبر ۱۹۸۶ء : بہت دور۔ درشن۔
- ۸ : واہ ری جمہوریت۔
- ۱۵ : کشمیر کی سیاست۔
- ۲۹ : ہندی یا ہوتا۔
- اب چند موضوعات پر ایک عمومی تبصرہ ملاحظہ فرمائیں۔
- خواجہ احمد عباس مذہب کے نام پر دھرم اور دھرموں کے سخت خلاف تھے۔ اس کے پس پرہ
- کس طرح جرم پتا ہے، اس سلسلے میں یہ دلچسپ اقتباس دیکھئے :
- اب حیدر آباد میں ایک نئی سنیا سن ملی ہے جو کہ پڑا ہنڈا اپنے دھرم کے خلاف سمجھتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ میں جس حالت میں پیدا ہوئی تھی اسی حالت میں رہنا چاہتی ہوں۔ جب وہ سنیا سن پیدا ہوئی تھی ویسی تو وہ نہیں ہے۔ جب وہ پیدا ہوئی تھی تو اپنی ماں

کا دودھ دیتی ہوگی اس کا اصول کے مطابق اُسے اب بھی ماں کا دودھ پلانا چاہیے۔ اب کھانا کیوں کھاتی ہے۔ پانی کیوں مانگتی ہے۔ یا صرف نہنگا بن ہی اُسے اپنے بچپن کی معصومیت کی یاد دلانا ہے اس کا کہنا ہے کہ اگر اُسے کچھ بھی پہننے پر مجبور کیا گیا تو اُسکی جان کا خطرہ ہے۔ (ننگے پن کا علاج ماسکو میں ۸ جنوری ۸۲)

”خواجہ صاحب یہاں سادھوؤں کے عجیب طور طریقوں اور ننگے رہنے والے سنیا سیوں کا ذکر اس بالواسطہ انداز میں کرتے ہیں کہ بدعت و اشکاف ہوتی ہے۔ جب کہ مذہبی جذبات کسی طرح مجروح نہیں ہوتے وہ مضحکہ اڑانے کا دلچسپ، ملل اور منطقی انداز اختیار کرتے ہیں۔ وہ تجویز کرتے ہیں سنیا سنیا کو ننگے پن کے علاج کے لیے روس بھیج دینا چاہیے۔ حیدرآباد کے بظاہر معتدل موسم میں ننگا پن بلائے جان نہیں بن سکتا۔ لیکن روس جیسے سرد ملک میں معمولی گرم کپڑے بھی کوئی کو زندہ اور فعال رکھنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ یہی نہیں وہ عجیب اطوار کے سنیا سیوں اور سنیا سنوں میں لوگوں کے ممکنہ اعتماد کو بعض پیوست مقامات کے ان کہے اظہار سے مزید ضعیف پہنچاتے ہیں مثلاً اس کا لم کا اعتنا وہ لیوں کرتے ہیں :

”اس سنیا سن پر ایک زمیندار کے قتل کا الزام ہے۔ کیونکہ مقدمہ ابھی چل رہا ہے۔ اس کے بااے میں کچھ کہنا لیکن خلاف قانون ہوگا۔“

”آپ محسوس فرمائیں گے کہ اس ایک جملے میں سنیا سن کے ڈھونگی ہونے کا اظہار کس درجہ ملفوف ہوا ہے اور شعر جیسے لطف کا حامل ہے۔“

دور درشن کی کارگزاروں پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مقام پر لکھتے ہیں :

”دور درشن صرف گورنمنٹ درشن ہے۔ جو چیز گورنمنٹ کے نہاں ہوگی جمہوریت میں جاننا ہے مگر وہ قانونی ہو، آئینی ہو لیکن دور درشن ایسی خبروں کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ جو وقت اس کے پاس ہے وہ کرکٹ یا کھیل دکھانے میں صرف ہوتا ہے۔ دور درشن کو قمر نہیں پر ائم منسٹر کے دورے کے حالات ظلماتے ظلماتے۔“

دور درشن زندہ باو!

دور درشن دور درشن!!

(بہت دور دور درشن یکم نومبر ۸۶)

دواصل اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جب فلمی دنیا کے تقریباً تیس ہزار عملوں نے تقریبی ٹیکس کے خلاف بھرتی میں ایک اجتماعی بلوس نکال کر مظاہرہ کیا۔ فلمی دنیا کی تلمیخ میں پہلی مرتبہ مکملے مام فلم اسٹار دیگر فلمی کارکن مکملے عالم سرک پر نکل آئے تھے۔ یہاں خواجہ احمد عباس کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ فلم دالوں کے بلوس کے منافع کو خواہ مخواہ پروکھنڈہ کا ذریعہ بنایا جاتا بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ فلمی دنیا کی پوری تاریخ میں ایک نادر واقعہ منظر کو بطور جزہ ضرورتی دی پرمیش کیلہا۔ اگر ان کا مقصد فلم دالوں کی طرف داری ہوتی وہ ان پر شو بزنس کے تحت "آزاد فلم" میں اسقدر زبردست حملہ نہ کرتے جیسا کہ ذیل کے سطور میں ہے :

"فلم دالوں کو نہ چلنے کیوں یہ خواہش رہی ہے کہ ان کو ایک انڈسٹری مان لیا جائے۔ حالانکہ دنیا فلم کو ایک آرٹ مانتی ہے جو ہنسنا ہے رلاتا ہے اور کبھی کبھی زندگی کی تلخ حقیقتوں کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتا ہے انڈسٹری تو کچھ بنانے کے طریقے کو کہتے ہیں جیسے پٹر بانے کی انڈسٹری، لوہا بنانے کی انڈسٹری، ٹیلی ویژن بنانے کی انڈسٹری۔ انڈسٹری کے لیے الگ الگ قاعدے اور قانون نہیں اس پر ٹیکس لگ سکتا ہے۔۔۔ اگر اپنے آپ کو انڈسٹری سمجھتے ہیں تو انڈسٹری کی طرح برتاؤ کیجئے۔ اگر ایک ایکٹر کو ایک کروڑ دے سکتے ہیں تو ٹیکس بھی دے سکتے ہیں۔ یا تو بڑا بل بھول جائیے یا اپنے آپ کو کسر نفسی سکھائیے۔ فلم کو سپاماندہ آرٹ سمجھئے جیسے سکت سکت نہیں ٹیکس دینے کی۔" (شو بزنس ۲۲ نومبر ۱۹۸۸ء)

لسانی تعصبات پر ضرب کاریاں لگاتے ہوئے "ہندی یا ہوتا" کے زیر عنوان ان کے مضمون کا ایک

انتباس ملاحظہ فرمائیں :

"ہم نے سنا تھا کہ ریاضی سب سے مشکل سبکٹ ہے مگر اب معلوم ہوا وہ بڑا نا خیال تھا۔ اب تو D.A.R. کے ایک ستائیس سالہ نوجوان نے خود کشی کی کوشش کی جب اُسے ہندی پڑھنی پڑی اور اس کا خوف دامن گیر ہوا۔ اس ڈر سے کہ ہندی پڑھنا اتنا بڑا ہے کہ اس سے خود کشی ہوتی ہے۔ اس لڑکے نے خود کشی کا ارادہ کیا خوش قسمتی تھی کہ خود کشی ناکام ہوئی نہیں تو ہندی کے نام پر کلنک لگ جلا کہ نوجوان نے خود کشی کو ہندی پڑھنے پر ترجیح دی گویا ہندی نہ ہوا ایک ہوتا ہوا۔" (ہندی یا ہوتا ۲۹ نومبر ۱۹۸۸ء۔)

خواجہ احمد عباس نے بلز کے آخری صفحے میں تنوع اور گونا گوں موضوعات پر نظر ہا خیال کیا۔ جو ایسی گہری فکر

دستِ علم اور فکری بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ ان کے خورد فکرو اور انہار خیال کے دائرے میں دنیا کے بیشتر اہم احوال کوائف ایڑھیں۔ بین الاقوامی سیاست، قومی سیاست، مذہب، مذہبی تفرقے، جدید سیاسی تحریکات، قوم پرستی، لسانی تعصب، مذہبی جنون، علاقائیست، انسانوں کا استحصال، ظلم و جبر، فرقہ وارانہ فساد، ذات پات کی منافرت قومی یکجہتی، عالمی اخوت، ادب و ثقافت، سائنسی ترقی، غرضیکہ بقول کنہیالال پورکس چیرکی کی ہے خواجہ تری گلی میں ”در اصل خواجہ احمد عباس صرف ایک صحافی نہیں تھے۔ صحافت تو ان کی شخصیت کا صوف ایک پہلو تھا جو ان کے لیے صرف ایک ذریعہ کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ صحافت برائے صحافت کے قائل نہیں تھے۔ ان کی صحافت کا ایک ماں مقصد تھا، رنج اور جہت تھی، یہ مقصد ان کی دیگر سرگرمیوں کا بھی محرک تھا۔ اس مقصد کو انہوں نے اپنی ادبی اور صحافتی زندگی میں گہرے مطالعے اور خورد فکرو سے حاصل کیا۔ اس کی تکمیل کے لیے وہ ناول اور افسانے لکھتے تھے، بلٹز کے آخری صفے لکھتے تھے، قلیں بناتے تھے، مضامین اور ڈرامے تحریر کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے پیش نظر صرف ایک مقصد یعنی انسان کو ظلم اور استحصال سے نجات دلا کر خوشحال، آسودہ اور تہذیبی سطح پر بلند بنانا تھا۔ طریقہ کار کے طور پر انہوں نے سوشلزم کو ذہنی طور پر سوچ سمجھ کر قبول کیا تھا اور یہ سوشلزم انہی طرز فکر پر مبنی تھا اس میں کسی قسم کی لغامی ریا کاری اور مغایرت پسندی نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے صرف اشتراکی فکر کا ہی مطالعہ نہیں کیا ہوگا بلکہ جیساکہ ان کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے وہ عالمی تاریخ اور ثقافت اور عالمی سیاسی تحریکات سے بھی پوری طرح باخبر تھے اور معاصر فکری اور سیاسی سرگرمیوں سے آگاہ بھی تھے۔

صحافی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ہر فن سے واقف ہوتا ہے لیکن ماہر کسی کا نہیں ہوتا۔ دراصل صحافی کا روزمرہ کام اُسے کسی ایک موضوع پر اختصاص حاصل کرنے کا موقع نہیں دیتا ہے اس لیے متفرق موضوعات پر عام معلومات کے تحت سرسری طور پر انہار خیال کرتا ہے مگر یہ بات خواجہ احمد عباس کے متعلق نہیں کہی جا سکتی۔ ان کا آخری صفو (آزاد قلم) علم و فکر کی گہرائی بھی رکھتا ہے اور ادب کی لطافت اور چاشنی بھی ہنگامی موضوعات پر لکھے جانے کے باوجود ان میں سے بہت سی تحریریں مستقل اور پائیدار اہمیت کی حامل ہیں اور آئندہ ادب اور صحافت میں ان کا استعمال حوالے کے طور پر کیا جائے گا۔

ایک عام صحافی کسی روزنامے یا ہفتہ وار اخبار میں کسی موضوع کے متعلق اطلاق یا معلومات فراہم کرتا ہے اور سرسری تبصرہ کرتا ہے مگر خواجہ احمد عباس کسی ہنگامی موضوع پر انہار کرتے ہوئے قاری کی فکر بیدار کرتے ہیں اور اس کے علم میں بھی اضافہ کرتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے رواں دواں پر خلوص بے تکلف اور

بے ساختہ اسلوب سے قادی کو ادب کے ذائقہ سے بھی آشنا کرتے ہیں، یہ خصوصیت بہت کم کام نویسوں کو حاصل ہے۔

خواجہ احمد عباس نے اپنی زندگی کا ایک نصب العین طے کیا تھا اور وہ تھا سماجی انصاف کے قیام کی کوشش۔ وہ جانتے تھے کہ موجودہ حالات میں ملک میں سوشلزم سماجی انصاف جمہوریت اور سیکولرزم اپنے صحیح معنوں میں رعبہ علی نہیں لایا جاسکتا۔ پھر بھی اسکے لیے ہر ذی شعور کو کوشش کرتے رہنا چاہیے چنانچہ انکی ادبی تحریریں اور فلمیں ان کی اس کوشش کا ہی نتیجہ ہیں۔ ان کا مقصد واضح اور متعین ہے اور ان کے ذرائع اظہار بھی واضح ہیں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انھوں نے اپنے تمام ادبی اور فلمی کام منصوبہ سازی کے تحت کئے۔ مثلاً انقلاب لکھنے سے پہلے انھوں نے جنگ آزادی کی تاریخ کا مطالعہ کیا حالانکہ بہت سے واقعات ان کی نگاہوں کے سامنے رونما ہوئے تھے اور وہ خود ان کے درمیان پہلے بڑھے تھے جن میں آزادی کی جنگ لڑی گئی تھی پھر بھی انھوں نے اس کے لیے اس کا بنیاد اور تفصیلی مطالعہ کیا۔ وہ اپنے تفصیلی کام کے لیے ضروری مطالعہ ممکنہ حد تک کرتے تھے۔ ایک صحافی اور فلم سازی حیثیت سے وہ بہت زیادہ معروف رہتے تھے اور اس سبب وہ اپنی ادبی تصنیفات کے لیے بھی وقت نکالتے تھے۔ وہ ہندستان کے مصنفین کی منتخب فہرست (Selected List) میں ہی نہیں عالمی سطح پر مقبول مصنفین کی فہرست میں بھی ان کا نام و مقام موجود و محفوظ ہے۔ دراصل ان کی تمام سرگرمیوں کے پیچھے ایک دانشور کا دماغ کارفرما ہے جو اپنے علم و دانش کے نتیجے میں اس نظام اور معاشرت کو بدلنا اور اسے نیا دے نیا دے جمہوری یعنی برائے انصاف اور عقلیت پسند دیکھنا چاہتا ہے۔ افسانہ نگار، ناول نویس صحافی اور فلم ساز کے پس پردہ وہ دراصل ایک دانشور تھے جو اپنی دانش سے دنیا کو بدلنے پر آمادہ نظر آتا ہے اور اسکی یہ دانشوری اُسے کسی دانش گاہ سے وابستہ ہونے پر آمادہ نہیں کرتی بلکہ اُسے جہاد زندگی میں اترنا سکتا ہے، اسے دنیا کے مشاہدے مطالعے اور کار تخلیق پر تیار کرتی ہے۔

چنانچہ بیسویں صدی کے موجودہ عشرے میں ہندوستان اور دنیا میں جو حالات و واقعات رونما ہوئے ہیں ان پر انھوں نے اپنے آزاد قلم میں بڑی دانشوری اور بصیرت سے خامہ فرسائی کی ہے۔ اس وجہ سے ملک کو بعض بدترین حالات اور معاملات سے دوچار ہونا پڑا۔ خواجہ احمد عباس نے ان مسائل پر عقلی نقطہ نظر سے روشنی ڈالی اور ایک وسیع القلب روشن خیال، جمہوریت پسند دانشور کی حیثیت سے لوگوں کو صحیح راستہ بتایا، لوگوں کے انہان کو روشن کیا، انہیں معاملات کو دیکھنے سمجھنے اور پرکھنے کی ایک ایسی بصیرت بخشی جس سے وہ آگے بھی کام

لے سکتے ہیں۔ وہ ہر طرح کی توہم پرستی، جمن، تعصب، ہجو و تشدد، شدت پسندی، ظلم و ستم، جیسے مسائل کو عقلی دلیلوں سے روک کر اس میں اور قارئین میں عقل سلیم اور صحیح ذہن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

حواشی

- ۱۔ خواجہ احمد عباس کی ترقی پسندی از: قمر نسیم آج کل خواجہ احمد عباس نمبر دسمبر ۸۸ ص ۵۷۔
- ۲۔ خواجہ احمد عباس کے اپنے بڑے چچا زاد بھائی۔
- ۳۔ سوانح عمری۔
- ۴۔ دیباچہ نئے دھرتی نئے انسان۔ از: خواجہ احمد عباس۔
- ۵۔ مجھے کچھ کہنا ہے۔ از: خواجہ احمد عباس۔
- ۶۔ من کہ... خواجہ احمد عباس آج کل دسمبر ۸۸ ص ۷۲۔
- ۷۔ میرے شب و روز، بیسویں صدی ۷۷ ع۔
- ۸۔ باچھو اور مجی۔ صالحہ عابدہ حسین۔ ایوان ادب، خواجہ احمد عباس نمبر ۷۷ ص ۲۵۔
- ۹۔ خواجہ احمد عباس ایک تخلیق کار صحافی۔ راج نارائن راز۔ آج کل ۸۸ دسمبر ص ۷۲۔

صحافت نسواں

انیسویں صدی کے چند گم شدہ اوراق

قوموں کی زبان اور اس کے مزاج کی تیسری سب سے زیادہ معاشرے کا اہم ہوتا ہے اور اس معاشرے کی توہین نسواں کے ہاتھوں میں جوتی ہے۔ جو باہول اور طرز زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ افراد کی نجی زندگی ایک خاص ماحول میں گزرتی ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں طبقہ نسواں کا تعلیم اس وقت شروع ہوئی جب سرسید کی اصلاحی تحریک کے اثرات سے زندگی کا کوئی شائبہ بچ نہ سکا۔ اگرچہ سرسید کی تحریک تعلیم نسواں کے لیے نہ تھی لیکن من حیث القوم اس کے اثرات بہت گہرے اور دور رس ثابت ہوئے اور جدید تعلیم کے ساتھ تعلیم نسواں پر بھی زور دیا گیا۔ اس نظریے کو فروغ دینے کے لیے مخصوص طریقہ اپنانے کی ضرورت تھی ایسے میں ادیبوں کے ذہن میں ایسی صحافت کا خیال پیدا ہوا جو ہندوستان کی عورتوں کی فلاح و بہبود میں ہاتھ بھی بٹائے اور تعلیم نسواں کی اہمیت کا احساس بھی اُجاگر ہو۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے انھوں نے رسائل کا اجرا کیا، جن سے برصغیر میں طبقہ نسواں کو ایک بلند مقام حاصل ہوا۔ اس دور میں ایسی صحافت پروان چڑھی جسے ”صحافت نسواں“ کا نام دیا گیا۔ فقہانِ میں یہ ایک نیا اصطلاح تھی جسے متعارف کرایا گیا۔ اگرچہ اس قسم کی صحافت کا دائرہ بہت محدود تھا لیکن اُس عہد کے تھانوں سے ہر ہنگ تھی اور اس نے اپنے مقاصد کو بطریق احسن تکمیل تک پہنچایا۔

نسوانی صحافت کے علمبردار رسائل اُس دور کی صحافت سے مختلف نظر آتے ہیں کیونکہ ان کے موضوعات طبقہ نسواں کی زندگی کو پیش کرتے تھے۔ عورتوں کے مشاغل، طرز زندگی، زبان اور گھریلو مشکلات میں جو نمایاں فرق ہوتا ہے اُس دور کی صحافت میں اُنہی مسائل پر تحریریں نظر آتی ہیں۔ ان رسائل کے اسلوب میں نسوانی رنگ جھلکتا تھا کیونکہ اکثر تحریریں خواتین کی جوتی تھیں اور ان کا انداز اور طرز نگارش بھی مختلف نظر آتا ہے اس سے اردو ادب میں مضمون نگار خواتین متعارف ہوئیں۔ انھوں نے جو ادب پیش کیا اُس کی زبان وہ تھی جو روزمرہ بولی جاتی تھی۔ نئے نئے محاورے نجی زندگی سے نکل کر اردو زبان میں داخل ہوئے اور بہت سی اصطلاحات منظر عام پر آئیں اور اسلوب نے نیا روپ پاتایا جس سے اُس دور کے طبقہ نسواں کے موضوعات اُبھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

نوائی صحافت میں سب سے پہلا اخبار رسالہ کون سا جاری ہوا؟ یہ ایک وضاحت طلب مسک ہے محققین
 کا لئے میں سید ممتاز علی کا تہذیب نسوان، پہلا تذکرہ اخبار تھا۔ لیکن راقم کی تحقیق کے مطابق اس سے پہلے بھی ایک
 اخبار ادھر کچھ رسالے منظرِ شہود پر پہنچے تھے۔ رسالہ اردو میں پندت برص ہونہ کچھ نے صحافت نسوان میں پہلا نمبر^۱
 کو پہلا رسالہ قرار دیا ہے جس کو فرنگ اصغر کے مؤلف مولوی سید احمد دہلوی نے یکم اگست ۱۸۸۴ء میں جاری کیا تھا۔
 بنگلہ امداد صابری نے بھی اس اخبار کا ذکر ۱۸۸۴ء میں کیا ہے لیکن ان کا کتاب میں "اخبار النساء" سے پہلے
 ایک رسالے کا ذکر ملتا ہے جس کا نام "رفیق نسوان" ہے۔ یہ لکھنؤ سے ۵ مارچ ۱۸۸۴ء میں جاری ہوا۔
 راقم کو عجائب گھر لائبریری سے ایک رسالہ "تعلیم نسوان" بھی ملا، جس کا ذکر کچھ تاریخ صحافت میں نہیں
 ملتا۔ اس کے ایک شمارے کے سرورق پر لکھا ہے کہ ۱۸۸۵ء میں دہلی سے جاری ہوا۔ اس کے بعد ۱۸۹۲ء میں مولوی
 محبوب حسین کار رسالہ "معلم نسوان" حیدر آباد دکن سے جاری ہوا۔
 راقم کو ایک اور رسالہ "شریف بیبیاں" عجائب گھر لائبریری سے ملا۔ اس کے اجراء کی تصدیق ایک
 کاغذ کی اس عبارت سے ہوئی ہے:

"ہندوستان کے مسلمان بیبیوں کا سب سے پہلا اخبار جو منشی محبوب

عالم نے ۱۸۹۳ء میں جاری کیا۔"

اس رسالے کا ذکر نہ تو آخر شہنشاہی میں ہے اور نہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی کتاب میں۔ امداد صابری صاحب
 کی تاریخ صحافت اردو جلد چہارم میں "شریف بی بی" کا ذکر ہے جو ۱۹۰۹ء میں لاہور سے نکلا۔ اسے منشی محبوب
 عالم کی سرپرستی حاصل تھی۔ راقم کی تحقیق کے مطابق "شریف بیبیاں" ۱۸۹۳ء میں جاری ہوا۔ ۱۹۰۹ء میں منشی محبوب عالم نے اس کا
 نام بدل کر "شریف بی بی" رکھ دیا۔ راقم کو یکم ستمبر ۱۸۹۳ء کا پہلا شمارہ ملا۔

سید ممتاز علی کا "تہذیب نسوان" ۱۸۹۸ء میں جاری ہوا۔ ان اخبارات اور رسائل کے بعد اردو صحافت
 میں کچھ نسوانی رسالے کا ذکر نہیں ملتا۔ لیکن راقم کو ایک اور رسالہ "صغیر قمر" کے دو شمارے ۲۵ ستمبر ۱۹۰۱ء اور ۲ نومبر
 دسمبر ۱۹۰۱ء عجائب گھر لائبریری سے ملے۔ یہ رسالہ نسوانی صحافت کا طبعی وار تھا۔

مولانا عبدالعلیم شرنے ۱۹۰۱ء میں "پردہ عصمت" نامی پندرہ روزہ رسالہ نکالا۔ یہ لکھنؤ سے نسوانی وقت
 کے فروغ کے لیے نکالا گیا تھا۔ ان تاریخی شواہد کے مطابق نسوانی صحافت کی ترتیب کچھ اس طرح ہوگی:

- پہلا رسالہ: "رفیق نسوان"، مارچ ۱۸۸۴ء • دوسرا اخبار: "اخبار النساء"، اگست ۱۸۸۴ء
- تیسرا رسالہ: "تعلیم نسوان"، ۱۸۹۳ء • چوتھا رسالہ: "معلم نسوان"، ۱۸۹۳ء • پانچواں رسالہ:

شریف بیباں، ۱۸۹۳ء • چھٹا اخبار: تہذیب نسوان، ۱۸۹۸ء • ساتواں رسالہ: سفیرِ قمر، ۱۹۰۰ء • آٹھواں رسالہ: پردہِ عصمت، ۱۹۰۰ء

ایسا ان اخبارات اور رسائل کا ترتیب جائزہ لیا جاتا ہے۔

یہ پندرہ روزہ رسالہ کھٹوسے ۵ مارچ ۱۸۸۳ء میں جاری ہوا۔ یہ عیسائی مشنریوں کا رسالہ تھا جو نسوانی صحافت کا علمبردار تھا۔ یہ اردو، ہندی، بنگالی اور درہا سنی زبانوں میں نکلتا تھا۔ اسے پادری کریون نے جاری کیا جو بارہ صفحات پر مشتمل مختلف زبانوں میں نکلتا تھا۔ اس کا مقصد عورتوں کی فلاح و بہبود تھا۔ غریبوں میں رسالہ مفت تقسیم کیا جاتا تھا۔

دس روزہ رسالہ کیم گسٹ ۱۸۸۳ء میں دہلی سے مولوی سید احمد دہلوی نے جاری کیا۔ اس دس روزہ رسالے کا مقصد عورتوں میں روشن خیالی پیدا کرنا اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا تھا۔

دہلی سے ماہنامہ "تعلیم نسوان" ۱۸۸۵ء میں جاری ہوا۔ اس کے مالک منشی احمد بیگ تھے۔ اس رسالے کے مقاصد کیا تھے؟ اس بات کا اندازہ اس کے مضامین سے لگایا جاسکتا ہے۔

• تعلیم نسوان پر زور دینا • عورت کے معاشرتی مقام کو بحال کرنا • عورت کو ترقی کی طرف راغب کرنا۔
اس رسالے میں ایک ریویو "اخبار النساء" کا شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ایک مضمون بعنوان "تعلیم نسوان" شائع ہوا۔ جس میں عورتوں کی تعلیم پر زور دیا گیا۔ مضمون نگار کا نام نہیں دیا گیا۔ اس مضمون کی ذیلی سرخیاں مندرجہ ذیل ہیں:

• فطرت • حیا • حالات و حوادث • جہالت • استقلال • وفاداری • خدا ترسی • رحمہ دلی • محبت • قوانین قدرت۔

اس طویل مضمون میں عورتوں کی تعلیم کی افادیت پر بحث کی گئی کہ مرد اور عورت فطرتاً برابر ہیں مضمون نگار کی رائے ان الفاظ سے واضح ہوتی ہے:

"فطرت انسانیت کی نسبت جتنی باتیں بیان کی گئی ہیں مرد اور عورت دونوں

میں یکساں علاقہ رکھتے ہیں۔ جس طرح مرد فتن مختار ہے اس طرح عورت۔ جیسے

مرد کو اپنی برائی بھلائی کا سبب مقرر اور علم پر موقوف ہے ایسے ہی عورت کو جیسے مرد

وَمَنْ يُؤْنِ كُنِ الْحِكْمَةُ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

سَلَا

تعلیم النساء

جسے انجمن عاجز قوم کی پوری تعلقہ کے ایک ہجرت دوست صادق مجدد
ممبر نے اپنی قوم کے بزرگوں کو تعلیم مستورات کی طرف توجہ دلانے
کی غرض سے بہ ثبوت دلائل منطقی و فلسفی یکپہر کے طور پر
مع جواب استفسارات و طرز تعلیم مشتمل درخواستی و نظائر
مفیدہ تصنیف فرما کر انجمن مذکور میں پیش کیا چنانچہ
مقبول عام و مفید نام ہونے کے باعث

۱۸۵۷ء

میں

مطبع نامی ارمان دہلی میں منشی احمد علی بیگ کے تہام و صحابہ

برقیت برکات دہلی

برقیت برکات دہلی

مفعول ہندو خردوار

اپنے اعمال کا دنیا میں اور خدا کے سامنے جواب دہ رہا۔ یہی ہے عہدِ صلح کا حال ہے۔ جسے
مرد فطرت کی رو سے نہ نیکی کرنے پر مجبور رہا اور نہ بدہمکار کرنے پر ایسے ہی عہد ہے۔

”علم نسوان“ اپنے عنوان کی مناسبت سے عورتوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لیے جاری کیا
اور اس کا یہ مقصد اس کے صفحات میں نمایاں نظر آتا ہے۔ اس رسالے نے انیسویں صدی کی صحافت کو متاثر کیا اور سادہ
اور سلیس انداز بیان کو پرتا ہے جو اپنے مقاصد کو بڑھایا لیکن اردو صحافت کی کسی بھی تاریخ میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔

حیدرآباد دکن سے مولوی محمد حسین نے ۱۸۹۲ء میں جاری کیا۔ یہ ماہنامہ صحافت
علم نسوان کے فروغ کے لیے نکالا گیا تھا۔ مولوی محمد حسین عورتوں کی آزادی اور انہیں

جدید تعلیم کے فروغ کے خواہاں تھے۔ ان کا نظریہ انتہا پسندانہ تھا اور انھوں نے اپنے اس نظریے کے فروغ کیلئے
رسالے میں ایسی تحریریں کا شاعت کی جو جدید تہذیب و تمدن کو پھیلانے میں مدد دیتی تھیں۔ انھوں نے خواتین کے
پردے کی سخت مخالفت کی اور اس سلسلے میں کئی مضامین بھی لکھے تاکہ طبقہ نسوان میں بیداری پیدا ہو سکے۔ ”علم
نسوان“ نے زمانہ لٹریچر کو بھی فروغ دیا اور تاریخ معاشرت، تنقید اور ادب جیسے موضوعات کو اپنے صفحات میں
جلو دی۔ راقم کو ”علم نسوان“ کا ایک فائل پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور سے ملا، جس میں اٹھ شمارے تھے۔ ان کے
مطالعہ سے معلومات اخذ کی گئیں ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

”علم نسوان“ میں سرسید احمد خاں، مولوی اشہری، فواب حسن الملک، مسید علی بلگرامی، خادم حسین اور
محمد عبدالقادر کی نگارشات شائع ہوئیں جن کا معیار بہت بلند تھا۔

”علم نسوان“ میں تاریخی شخصیات کا سوانح عمریاں شائع کیں اور تاریخی خواتین کے کارناموں کو اجاگر کیا۔ ان میں
سادگی اور اختصار ملتا ہے لیکن اس کے باوجود ان میں شخصیت کا تعارف اور حالات زندگی سے متعلق مواد فراہم کیا
جاتا تھا۔ مولوی اشہری کا مضمون ”نورجہاں بیگم کا حال“ شائع ہوا۔ اس میں مکر نورجہاں کی مکمل سوانح حیات ہدایت
سادہ اور سلیس زبان میں پیش کی گئی۔

محمد عبدالقادر کا مضمون ”مکہ جوسی نائیں“ چھپا۔ یہ پولین کی بیوی کے حالات زندگی کی مکمل تصویر کشی کرتا ہے۔
نمبر ۷ اور تنقید بھی ”علم نسوان“ کے موضوعات میں شامل تھے۔ ایک کتاب ”تذکرہ عرب“ جس کے مصنف
ڈاکٹر سادہ بان تھے اس کا ترجمہ علی بلگرامی نے اردو میں کیا۔ یہ فرانسیسی زبان کی تصنیف تھی۔ محمد حسین نے اس
پر تبصہ کیا جو بالآخر تاریخ حصوں میں شائع ہوا۔ محمد حسین کی رائے میں یہ اعلیٰ درجے کی کتاب تھی جس کی زبان

کھلائی تھی۔ اس میں ایسے الفاظ کا ترجمہ اردو میں کیا گیا تھا۔ اس کتاب کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ کئی قوم دہلیک کی زبان پر جس قدر عورتوں کا اثر ہے اس قدر مردوں کا نہیں۔ اس لیے قوم کی زبان اور کلام کی بنیاد ہے۔ مولوی محبوب حسین نے اس تبصرے کا عنوان ”زبان پر عورتوں کا اثر“ رکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”جس زمانے میں قوم روم کا عروج تھا تو اس قوم کی عورتیں اپنے بچوں کو مادری زبان کی تعلیم دیتے تھیں اور نکات فصاحت و بلاغت سکھاتے تھیں۔ رومی عورتیں زبان کے نئے نئے محاورے تراشتی تھیں اور نفیل الفاظ کو کھاٹ چمات کھو دست کو تھیں۔ فوجوان اشخاص ان کی سوسائٹیوں میں بیٹھ کر زبان کے عمدہ محاورے اور نئے الفاظ سیکھتے تھے۔ اس وقت ہمارے زمانے میں بھی محلات کی اردو زبان مستند سمجھی جاتی تھی اور دلی لکھنؤ کی شریف عورتیں اس کی محافظ خیال کی جاتی تھیں۔“

مولوی محبوب حسین کا ناول ”سیتا“ بالاقساط ۱۳۱۶ھ کے شماروں میں شائع ہوا۔ یہ ناول معاشرتی اصلاح کے پہلو کو لیے ہوئے تھا۔ ”معلم نسوان“ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ہر شمارہ شاعری سے شروع ہوتا تھا۔ اگر نثری نظموں کے ترجمے بھی اس میں چھپتے تھے۔ تدریقی مناظر اور معاشرتی مسائل پر بھی کئی نظمیں شائع ہوتی تھیں۔ اس کے صفحات میں نیچرل اور جدید شاعری کا رنگ بکھرا پڑا تھا۔ اس کے موضوعات ایسے ہوتے تھے جو زندگی سے قریب ہوں۔

”معلم نسوان“ اگرچہ نسوانی صحافت کا علمبردار تھا لیکن ادب میں اس کے معاشرتی اور ادبی مضامین بھی چھپتے تھے۔ اس جملے نے نسوانی صحافت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا اور اردو زبان و ادب میں زنانہ لٹریچر کو فروغ دیا۔ اس کی تحریروں نے اس بات پر زور دیا کہ قوم کی ترقی طبقہ نسوان کی ترقی میں نہیں ہے اس مقصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ”معلم نسوان“ کی تحریروں میں اہتمام پسندی کا رجحان ملتا ہے۔ اس کی دہر محبوب حسین کا وہ نظریہ تھا جس کے فروغ کے لیے انھوں نے یہ رسالہ جاری کیا تھا۔

۱۸۹۳ء میں لاہور سے منشی محبوب عالم نے ”ماہنامہ شریف بیبیاں“ جاری کیا۔ راقمہ کی نظر سے ۱۸۹۲ء اور ۱۸۹۵ء کے نو شمارے گزرے۔

ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خواتین کی تربیت اور تعلیم کے لیے لگا لگا تھا۔ "شریف بیبیاں" کے یہ شمار ہیں فشی محبوب عالم نے اس کو بڑی کرتے کے مقاصد یوں بیان کیے تھے۔

"رسالہ شریف بیبیاں" جاریہ کرنے سے غرض یہ ہے کہ ہندوستان کی لاکھوں بیبیان مخلوقات (صرفہ نسوان) کی خانہ داری کی تعلیم کے متعلق ایسے امور اس میں درج کیے جایا کریں کہ جس سے نہ صرف ہر ایک گھرانہ بہشت کا نمونہ بن جاوے بلکہ آئندہ نسل کی اونٹھان میں بھی اس سے مدد ملے۔ یہ ہے ہمارا ارادہ۔ اب خداوند کریم سے دعا ہے کہ اسے استقلال اور استحکام بخشے۔ آمین۔"

"شریف بیبیاں" میں ایسے مستقل عنوانات شائع ہوتے تھے جن کا تعلق فرقہ رسوں کا کارکردگی سے ہوتا تھا۔ یہ عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:

• ممتاز عورتیں • روئے زمین کی عورتیں • زنانہ بہادر کی مثالیں • معاشرتی موضوعات پر مستقل عنوانات میں دسترخوان • تربیت اطفال • استقام خانہ داری • سہلی (ناول) اور معاشرتی مضامین شامل ہیں۔ "شریف بیبیاں" میں ناول "سہلی" بالاقساط چھپا۔ یہ معاشرتی اصلاح کے لیے فشی محبوب عالم نے لکھا۔ پہلی قسط ستمبر ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئی۔ اس ناول کا تسلسل قائم نہیں رہ سکا کیونکہ جو شمارے دستیاب ہو سکے ان میں کئی پرپے موجود نہ تھے۔

تاریخی موضوعات پر ممتاز عورتیں مستقل عنوان تھا جس میں ہر شمارے میں کسی شہور عورت کے حالات زندگی اور کارناموں کو بیان کیا جاتا تھا۔ ان مضامین کا مقصد عورتوں میں کام کرنے کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ تاکہ برصغیر کی عورتیں بھی اپنی قوم و ملک کی صلاح کے لیے کام کریں۔ اس ضمن میں مضمون "نورینس ٹاٹ انگیل" چھپا۔ ایک اور مضمون "ممتاز محل" اسی شمارے میں شائع ہوا۔ اس میں راجپوتانہ یعنی شاہجہاں بادشاہ کی بیگم کے حالات زندگی کا ذکر کیا گیا ہے۔"

تفصیل کے لیے دیکھئے مقالہ "شریف بیبیاں" انیسویں صدی میں صحافت نسوان کا مطالعہ۔ حیدر آباد علی گڑھ یونیورسٹی تحقیقی

پژدہ ساز سہلی مجلہ شعبہ ادبیات جامعہ پنجاب لاہور جلد نمبر ۲۰ شماره ۲-۱۹۸۶ء

”مذہبوں کے موصوفہ پر بہت سے مضامین شائع ہوئے، جن کا مقصد ہندوستان کی عورتوں کی بہت مافوق کرنا تھا کہ وہ کچھ اعلیٰ زندگی میں بھر پور کر جاوا کر سکیں۔“

تاریخ نگاری ہی کے ضمن میں ایک اور مستقل عنوان ”روئے زمین کی عورتیں“ شائع ہوا تھا۔ اس کے تحت

فان قلت فانت حافظت للفتیہ

شریف بیبان

قیمت نہوان کا ماہوار رسالہ جس میں ہر ماہ دو لاکھ پانچ سو روپے شائع
کیجئے بی بی بی انڈسٹریز انڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ
نئے کی برسات بیج جاتی ہیں

جس پر چند روگیا روگیا کی المیہ سے فشی محبوب عالم ایڈیٹر
پیرا پیار لاپتہ نے مرتب کیا

عورت کو اپنی بیوی بنانی چاہیے جو جتن فہرست کر دینا چاہیے کہ کتنی بیوی بنانی چاہیے جو وہ نہ
فہم بنے کہ کوئی کوئی نہ کر دیتا رہتی رہتی ہیں کہ کتنی بیوی بنانی چاہیے جو وہ نہ
کوئی دسائرت کی گاڑی میں عورت کو نہ کر دیتا رہتی ہیں کہ کتنی بیوی بنانی چاہیے جو وہ نہ
کہ کوئی نہ کر دیتا رہتی ہیں کہ کتنی بیوی بنانی چاہیے جو وہ نہ

بابت ماہ مئی ۱۹۵۷ء

مکتبہ حادہ اقصیہ چٹا پور

قیمت ماہانہ معمولی ڈاک کے تحت کی جاتی ہے

مختلف ممالک کی عورتوں کے حالات اور طرز زندگی کے بارے میں معلومات کا میزبان ہر ماہ شائع کیا جاتا تھا۔ مثلاً:

• انگریز کی عورتیں، ستمبر ۱۸۹۲ء • معرک عورتیں، اکتوبر ۱۸۹۲ء • مکہ چین کی عورتیں، فروری ۱۸۹۵ء
 • نناز بہادر کی خاتونیں، عنوان کے تحت جو مولو سائے آنا اتحاد بہادر کی اور جرات کی حقیقی جاگتی مثالیں پیش کرتا تھا۔ مثلاً:
 • اسٹریٹیا کی عورت کی بچی بہادر، ستمبر ۱۸۹۲ء • ایک غیرت مند خاتون عورت، اکتوبر ۱۸۹۲ء
 اس رسالے کے سورتی کے بعد پہلے صفحے پر مستقل کالم ”شریف بیبیاں“ شائع ہوتا تھا۔ جس کے تحت
 معاشرتی مسائل پر منشی محبوب عالم کے مفاد میں شائع ہوتے تھے۔ تعلیم نسواں کیسی ہونی چاہیے؟ اپریل ۱۸۹۵ء
 • مذہب اسلام میں عورت کا سوشل رتبہ، مئی ۱۸۹۵ء • ہندوستان میں تعلیم نسواں، اگست ۱۸۹۵ء۔ یہ
 مضامین بہت مدلل اور پُر مغز تھے۔

”شریف بیبیاں“ ایک میماری رسالہ تھا جس کی نگارشات میں منشی محبوب عالم کا زبردست حصہ
 تھا۔ اس نے اپنے دور کی نسوانی صحافت کو کبھی متاثر کیا۔ لیکن اس رسالے کا ذکر اردو صحافت کی تاریخ میں کہیں
 نہیں ملتا۔ ”معلم نسواں“ عورتوں کی آزادی کا خواہاں تھا، لیکن ”شریف بیبیاں“ اعتدال پسند رویہ رکھتا تھا۔ عورتوں
 کی تہذیب و شناختگی اور علم کے فروغ کا خواہاں تھا لیکن اسلام کے حدود میں رہ کر اپنے مقاصد کو پھیلانا
 اس کا اسلوب بیان سادہ سلیس اور رواں تھا۔ اس رسالے کا سب سے بڑی خدمت یہ تھی کہ اس دور میں طبع
 نسواں میں تاریخ نگاری کو فروغ دیا اور تاریخی موضوعات پر میماری ادبی اور علمی درجہ کا مولا پیش کیا تاکہ خواتین تاریخ سے
 روشناس ہو کر اپنی زندگی کی تعمیر بہتر طور پر کر سکیں۔

یکم جولائی ۱۸۹۸ء میں سید ممتاز علی نے ہفت روزہ ”تہذیب نسواں“ ^{۱۴}جاری
 کیا۔ اگرچہ یہ ہفت روزہ تھا لیکن اس کی ساخت اور طرز رسالوں کی طرح
 تھی، اس لیے اسے رسالہ کہا جاتا ہے۔ یہ ۱۹۴۱ء تک جاری رہا۔ اس کی مدیرہ سردار محمدی بیگم تھیں۔ سید
 ممتاز علی نے ”تہذیب نسواں“ کا اجراء چند مقاصد کی تکمیل کے لیے کیا:

• عورتوں کے مسائل کا تدارک • تعلیم نسواں کی اہمیت اور فروغ • طبع نسواں میں تہذیب و شناختگی
 پھیلانا • خاتون کی اصلاح کرنا • معاشرتی اور تمدنی اصلاح کرنا • نسوانی تنظیم کو فروغ دینا۔

اس ہفت روزہ نے نصف صدی تک صحافت نسواں کے فروغ کے لیے کام کیا۔ حتیٰ کہ جیب میگزین
 علی ۱۹۲۵ء میں انتقال کر گئے تب بھی یہ جاری رہا اور ۱۹۴۹ء میں بند ہوا۔ ”تہذیب نسواں“ نے اپنے مقاصد کو پورا
 کیا اور نصف صدی تک عورتوں کی اصلاح اور بہبود کے لیے کام کرتا رہا۔

ماضی میں ہندو فیسوں کا سب سے بڑا متعدد تھا۔ اس نفاذ سے بہت سے مضامین ختم کیے
جن سے اصل کا پسند و نکتہ خالص کے بدلے پچھلے مضامین سے نسوانی طرز تحریر اور اس کے کتب خانہ و بیان کا پرستار ہے۔
یہ دس سالے کا تجربہ ہے کہ نسوانی طرز تحریر کو ادب میں مساوت کلا اور بہت سے ایسے الفاظ اور دوز موزونہ کی بے
جانتے تھے انہیں باوقار و بزرگوں اور زبان میں مثال کیا۔ خاتون کی زبان مردوں سے مختلف ہوتی ہے کیونکہ وہ گھر پر
زبان بولتی ہیں اور ان میں ایسے محاورے شامل ہوتے ہیں جو عام زبان سے مختلف ہوتے ہیں۔ "ہندو فیسوں" کے
مضامین میں بھی ایسے محاوروں کو استعمال کیا۔ اس طرح مضمون زندگی کے الفاظ اور زبان کی زینت بن گئے۔

"ہندو فیسوں" نفع مند تک اور دوزبان دلاب اور طبع نسوانی کی ہندو فیس کے نام کی گزشتوں کو نوب
کر رہا۔ اس نے نسوانی طرز تحریر کے فروغ میں کام کر رہا اور ان کا ادوار دوزبان میں بہت سے نئے الفاظ اور محاوروں
کا اضافہ کیا۔ محمد بیگ، سید عطاء علی، امتیاز علی خان اور حجاب منیل کی تحریروں نے اردو ادب و صحافت کو نوب
متاثر کیا اور نسوانی اسلوب کو ایک خاص و گہر پر ڈال دیا۔ اس دس سالے نے اردو میں کئی اضافہ نگار اور ناول نگار
خاتون کو متعارف کرایا۔ جن سے ہم نے ادب کی تاریخ روشن ہے۔ قرۃ العین حیدر اور حجاب امتیاز علی کا
نگارشات نے نسوانی ادب کے تقاضوں کو ارتقا کی طرف بڑھایا۔

"ہندو فیسوں" نے ماضی میں ہندو فیس، تاریخ، سماج و گادی، شو و شواری، تنقید و تبصرے، لسانی
غرض ہر موضوع کو اپنے عوام میں سمجھ دیا۔ نسوانی ادب و صحافت میں "ہندو فیسوں" کی خدمات سے کوئی انکار
کر سکتا ہے جس کے اثر کو ہم کی حجاب آج بھی ہم سے ادب پر گہرے اثرات قسمر کر رہی ہے۔

اس دس سالے کا ذکر اردو صحافت کی کسی تاریخ میں نہیں ہے یہ صحافت نسوانی کا طرز
صفحہ فیروز | تھا جو میرٹھ سے ۲۵ ستمبر ۱۹۱۹ء میں جاری ہوا۔ اسے فیض عام پریس میرٹھ سے
محمد زید سید نے جاری کیا۔ اس کے دائیں جانب "فیلم" اور بائیں جانب "نسوان" شائع ہوتا تھا۔ ان حروف سے اس
بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اس کے مقاصد میں تعلیم نسوان کا فروغ شامل تھا۔

نامہ کو چار گھر پریس ۱۰۰ روپے سے دو شہرے ۲۵ ستمبر ۱۹۱۹ء اور نومبر دسمبر ۱۹۱۹ء کے ۲۵ ستمبر
۱۹۱۹ء کے شمارے پر چلے (۱) اور شمارے (۱) درج تھا۔ جس سے اس کے اجراء کی تاریخ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔
اس شمارے کے آخری صفحے پر ایک اشتہار سے یہاں سے مقاصد کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

دستور العمل و سالہ صفحہ فیروز: (۱) رسالہ ہر ماہ ۱۰ ستمبر کی ۲۵ ایک طبع ہو کر پیر ناظرین

ہوگا۔ (۲) جو مضامین ترقی، تہذیب و تعلیم و مفید طبقہ نسواں شائع ہوں گے۔ (۳) علاوہ مضامین کے دفتروں اور ایک "مطب" بنے نظیر "دوسرا" ہدایت نسواں، ہر ماہ رسالہ ہذا کے ساتھ شائع ہوں گے۔ (۴) رسالہ ہمیشہ تعلیم نسواں کا معاون اور تربیت و ہدایت کا خیر خواہ رہے گا۔



”سیفِ تہیر“ کا ایک اہم مقصد عورتوں کی تعلیم پر زور دینا تھا۔ تاکہ طبقہ نسوان میں نیکو و دشمن پیدا ہو۔ اس کے علاوہ اس میں ادبی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ مولانا الطاف حسین کا ایک مضمون ”اردو لٹریچر اور تعلیم یافتہ مسلمان“ شائع ہوا اس میں بتایا گیا کہ اس دور میں اردو کا مقابلہ ہندی زبان سے ہے۔ ہندوستان کے تمام عوام اسے اپنی زبان سمجھتے ہیں اور ان کی خواہش یہ ہے کہ اردو زبان کو وسیع تر بنایا جائے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

”ہمارے مقاصد میرے نزدیک یہ ہونے چاہیں،

(۱) اردو لٹریچر کو ترقی دین (۲) عمدہ اردو لٹریچر سے واقفیت پیدا کریں۔
 کہا جائیگا کہ اردو لٹریچر، اسی کہاں ہے جس سے واقفیت پیدا کی جائے۔ میں افسوس کے ساتھ مانتا ہوں کہ ہمارا لٹریچر ایسا وسیع نہیں کہ کسی بڑی زبان کا مقابلہ کر سکے مگر میں یہ چھتا ہوں کہ ہم نے اردو لٹریچر کو بڑا بہت، جتنا کچھ اور جیسا کچھ ہے وہ دیکھ لیا ہے اور ہم کیا کریں۔ ہمارے سامنے دنیا کے اعلیٰ لٹریچر کے نمونے موجود ہیں۔ اس لیے اگر ہم کو شن کریں تو کچھ نہ کچھ ضرور کر سکتے ہیں“
 اس رسالے میں شر کے ساتھ شاعری کے لیے بھی صفحات مخصوص تھے اور ایسی نظمیں شائع ہوتی جن میں اصلاح کا پہلو دکھاتا تھا۔ ”سیفِ تہیر“ نے معاشرتی مضامین کو اہم مقام دے رکھا تھا۔ اس کے مضامین اعلیٰ درجے کے ہوتے تھے۔ جن میں معاشرتی اصلاح کا جذبہ کارفرما ہوتا تھا۔ ”چین کی عورتوں کی جہالت“، ”کندھن حریص لڑکیاں“ اور ”تعلیم نسوان“ جیسے مضامین شائع ہوئے جو اخلاقی اور معاشرتی پہلو لیے ہوئے تھے۔ نظیر فاطمہ کا ناؤں ”مطلب بے نظیر“ بالافراط شائع ہوا۔

”سیفِ تہیر“ کا اسلوب بیان اصلاحی اور مدلل تھا لیکن سادگی اور سلاست کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ اس کی تحریروں میں اس بات پر زور دیا جاتا تھا کہ تعلیم نسوان کو رواج دیا جائے تاکہ نسوانی لٹریچر کی ترقی ہو۔ ”سیفِ تہیر“ اعلیٰ پائے کا رسالہ تھا، لیکن ابھی تک محققین کی نظروں سے اوجھل تھا۔ اردو ادب و صحافت کی کسی تاریخ میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں مولانا الطاف حسین حالی جیسے بلند پایہ ادیب کے مضامین شائع ہوتے تھے۔

مولانا عبدالعلیم شر نے لکھنؤ سے پندرہ روزہ رسالہ ”پردہ عصمت“ ۱۹۰۰ء میں جاری کیا۔

پردہ عصمت | یہ نسوانی صحافت کے فروغ کے لیے نکالا گیا۔ اس کا مقصد عورتوں میں برے

کی مخالفت کرنا تھا۔ محمد حنین اور عبدالحلیم شرعیہ فیسوں کے بارے میں ہاتھ پستانداز رویہ رکھتے تھے اور عورتوں میں پردے کی سخت مخالفت کرتے تھے۔ شرعیہ پردے کی مخالفت اور طبقہ فیسوں میں آنادای اور سیداری کے فرق کے لیے اس رسالہ میں بعض مضامین شائع کیے تاکہ وہ جدید تعلیم حاصل کریں اور نئی تہذیب و تمدن سے روشناس ہوں پردہ عصمت کے مقاصد درج ذیل تھے:

"پردہ عصمت کو پائیس کیا ہے اور یہ رسالہ کس غرض کے لئے دنیا میں آیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس رسالہ میں شرعی پردے کی حمایت کی گئی ہے اور مردوجہ پردہ ہند کی مخالفت اور درحقیقت یہی مضبوط شرعی اور دینی تہذیب عورتوں اور ان کے قسمت کے مالکوں کے سامنے پیش کرنے کے لیے یہ رسالہ شائع کیا گیا۔۔۔ ہمارے غرض اس آزادی سے مرنے میں تدریج ہے کہ لڑکیوں کو اسکولوں میں جلنے دو۔ انہیں لیکچر ہالوں اور عمدہ صحبت ہائے وعظ و نصیحت میں شریک ہونے دو"

"پردہ عصمت" میں ایسے مضامین کثرت سے شائع ہوئے جن میں عورتوں کو آزادی کی تعین کی گئی تھی اور دلائل سے پردے کے نقصانات پر بحث کی گئی تھی ان میں سے چند مضامین یہ تھے:

- جب تک پردہ ہے انصاف نہیں ہو سکتا۔
- دنیا میں پردہ نہ ہوتا تو گناہ بھی نہ ہوتا۔
- جب تک پردہ ہے صفائی کا انتظام بیکار ہے۔
- پردے والیوں کا شہر۔
- پردہ نہ ہو تو مردوں کا اخلاق سنور جائیں۔

مندرجہ بالا مضامین میں پردے کی سخت مخالفت کی گئی ہے اور عورتوں کی آزادی کی حمایت کی گئی ہے اگرچہ اسلوب بیان نہایت سادہ ہے، مدلل اور عام فہم ہے لیکن بعض دفعہ الفاظ میں غامضانہ پن پیدا ہونے لگتا ہے اور انداز تحریر قاری کے ذہن پر اچھا تاثر نہیں چھوڑتا۔ ماسٹر کی مضامین میں بھی پردے کی مخالفت میں بہت کچھ نظر آتا ہے ایک مضمون بعنوان "پردہ نہ ہوتا تو گناہ بھی نہ ہوتا" کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"عموماً گناہ جاتا ہے اور ہمارے اکثر مہربانوں کو دعویٰ ہے کہ پردہ عورتوں کی عصمت و عفت کا محافظ ہے اور یہی انہیں گناہ سے بچاتا ہے۔ لیکن اگر انصاف سے دیکھیے اور فلسفیانہ حیثیت سے غور کیجیے تو بالکل اس کے خلاف ثابت ہو گا بلکہ پردہ بوجہ اس کے کہ گناہ و عصمت سے روکے اُٹھے اور گناہ کی جراثیم نہ مالتے

مچھو یہ ہے کہ پیرودہ ہی گنتا وناخرمانی کا گھوڑا ہے اور اگر وہی میں پیرودہ نہ ہوتا تو گنتا بھی نہ ہوتا۔

”پیرودہ عصمت“ میں ایسے تاریخی معانی چھپتے تھے جن میں خواتین کی بہادری کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ مثلاً رابعہ شامیہ، خدیجہ بنت الیقیم اور ام ابان۔ ان معانی میں تاریخ کے حوالے سے عورتوں کی بہادری جرأت اور شجاعت کا سبق دیا جاتا تھا تاکہ ہند کی عورتیں بھی تعمیری کاموں میں حصہ لیں اور مردوں کے شانہ بشانہ کام کریں۔

”پیرودہ عصمت“ اور ”علم نسوان“ کی پالیسی میں ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ اس نے طبقہ نسوان میں بیداری پیدا کرنے کے لیے بہت سے معانی شائع کیے۔ ”پیرودہ عصمت“ کے اسلوب بیان اور مقاصد میں انتہا پسندی ملتی ہے۔ تحریریں پردے کی مخالفت میں جو دلائل دیے جاتے تھے ان کو صحیح ثابت کرنے کے لیے گاہ بگاہ عامیاز الفاظ اور دلائل کا سہارا لیا جاتا تھا جس سے اس رسالے کی مخالفت شروع ہو گئی اور شریف گھڑانوں میں یہ مقبول نہ ہو سکا۔

انیسویں صدی کے ربع آخر میں صحافت نسوان کا آغاز ہوا۔ اور اس کا مقصد طبقہ نسوان کی اصلاح تھا۔ اس دور میں صحافتی اور ادبی اعتبار سے ”ہندیہ نسوان“ اذیت کا درجہ رکھتا تھا۔ لیکن اس کا عروج میسویں صدی میں ہوا۔ اس کے برعکس ”شریف بیبیان“ کا کردار بہت اہم تھا یہ اعلیٰ درجے کا معاشرتی مجاہد تھا۔ لیکن بد قسمتی سے اس رسالے کا ذکر تاریخ صحافت میں کہیں نہیں ملتا۔

اس دور کی صحافت نسوان زبان و بیان کے لحاظ سے بہت عمدہ تھی اور اس کا مقصد ہی اصلاح تھا کیوں کہ اس دور میں طبقہ نسوان میں تسلیم مفہوم تھی اس لیے سادہ اظہار بیان سے ابلاغ کے تقاضوں کو پورا کیا گیا۔ ”تسلیم نسوان“ اور ”سفیر قیصر“ ایسے رسائل تھے جو اس سے پہلے اردو صحافت کی تاریخ میں نظر نہیں آتے۔ ان کے صرف چند نمونے دستیاب ہوئے جن سے ان کے مقاصد نمایاں ہوتے ہیں۔

غرض صحافت نسوان نے انیسویں صدی میں اہم کردار ادا کیا۔ اس اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے راقم نے چند نایاب رسائل کا ذکر کیا تاکہ آئندہ جب کسی صحافت کی تاریخ مرتب کی جائے وہ ان رسائل کے تذکرے سے خالی نظر نہ آئے۔

حوالہ جات:

۱۔ کیفی، برجنی، دتا، پرنٹ، اب سے آدھی صدی پہلے کے اردو اخبار رسالہ (اردو) جلد ۱، شمارہ ۵۸۔

- اپریل ۱۹۳۵ء میں ۳۱ • (۲) ملاح صابری، تاریخ صحافت اردو۔ جلد سوم، ادبی، جدید پرچم پریس، ۱۹۶۲ء، ص ۲۷۵ • (۳) ایضاً۔ جلد چہارم میں ۷۷ • (۴) ایضاً۔ جلد سوم میں ۲۷۵ • (۵) کئی 'برجوشن' کا تکرار پنڈت۔ اب سے آدھی صدی پہلے کے اردو اخبار۔ رسالہ (اردو) جلد ۱۰، شمارہ ۵۸ •
- اپریل ۱۹۳۵ء میں ۲۰ • (۶) تسلیم النساء۔ ۱۸۸۵ء، سرورق کی عبارت • (۷) تسلیم النساء۔ ۱۸۸۵ء، ص ۳۹ (جلد اول، شمارہ دوم، تیسری) • (۸) تعمیر الدین، انجی۔ دکن میں اردو، کراچی: اردو گائیڈ، سندھ، ۱۹۶۰ء، ص ۶۲ • (۹) مسلم نسوان۔ جلد ۱۲، شمارہ ۶، محرم ۱۳۱۶ھ، ص ۱۲ • (۱۰) ایضاً جلد ۱۲، شمارہ ۳، ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ، ص ۲۲ • (۱۱) ایضاً۔ ص ۶ • (۱۲) تریف بیبیاں، ہمارا مقصد کیلئے، ستمبر ۱۸۹۳ء، ص ۹ • (۱۳) ایضاً، فروری ۱۸۹۵ء، ص ۱۰ • (۱۴) تہذیب نسوان۔ سرورق پر دوم عبارت • (۱۵) سفیرِ قیصر۔ جلد ۱، شمارہ ۱۰، ۲۵ ستمبر ۱۹۰۰ء • (۱۶) ایضاً۔ ص ۳۶ • (۱۷) ایضاً۔ جلد ۱، شمارہ ۲۰ • (۱۸) پردہ عصمت۔ جلد ۱، شمارہ ۲، یکم رمضان المبارک ۱۳۸۸ھ۔ ۱۹۰۶ء • (۱۹) ایضاً۔ ص ۷ • (۲۰) ایضاً۔ جلد ۲، شمارہ ۲، یکم صفر ۱۳۸۹ھ/۱۹۰۱ء، ص ۳ •

پروفیسر حکیم سید فضل الرحمن

تجارت ہاؤس، دودھ پورہ علی گڑھ

تاریخ طب کے مسائل و اصول تحقیق

گزشتہ صدی سے قبل تک تاریخ طب سے زیادہ تاریخ اطباء سے دلچسپی لی گئی ہے۔ علم کی تاریخ کو عام طور پر اس علم کے ماہرین کی تاریخ سمجھا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ طب، فلسفہ یا دوسرے علوم کی تاریخ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں بیشتر ان علوم کے مشاہیر کے حالات بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اسی لئے تذکرہ اور سوانح سے متعلق کتابوں کا کافی ذخیرہ ملتا ہے لیکن علوم کی تاریخ پر بہت کم سرمایہ کے ہم مالک ہیں۔ تاریخ طب کے نام سے عربی عہد زریں کی جو کتابیں ہمارے درمیان ہیں ان میں مثلاً تاریخ الاطباء اسحاق بن حنین، تاریخ العلماء ابن بطی، اخبار العلماء ابن قفطی، طبقات الامم قاضی صاعد اندلسی، طبقات الاطباء ابن ابی اصیبعہ کے ناموں سے مضمون کی نوعیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ قاموس، اعلام اور دائرۃ المعارف جو خاص مآخذ کے بطور مستعمل ہیں، اس سے زیادہ حیثیت کی حامل نہیں ہیں۔ کارلائل کا فلسفہ تاریخ بھی یہی تھا کہ بڑے آدمیوں کی سوانح اور تذکرہ لکھ دیا جائے، اس عہد کی تاریخ خود بخود تیار ہو جائیگی۔ اگرچہ اس نظریہ کے پیچھے انیسویں صدی میں نظریہ ارتقاء سے انسان کی روایتی عظمت کو جو صدمہ پہنچا اس کا اثر بتایا جاتا ہے۔ لیکن علم و فن اور عہد کی تاریخ کے بجائے اس نظریہ کے مطابق فرد ساری توجہ کا مرکز قرار پایا۔ ایک مکتب فکر اور شعوری کوشش کے طور پر انیسویں صدی کے نصف آخر تک یہ فلسفہ یورپ میں قائم رہا۔

ابن خلدون (۱۳۰۶ء-۱۳۸۲ء) پہلا شخص ہے جس نے علوم کی تاریخ پر بحث کی ہے بعد میں بیسویں صدی کی ابتداء سے بالخصوص یورپ میں تاریخ علوم کے مطالعہ کو فروغ ملا۔ اور آج طب کے مختلف موضوعات ادویہ، تشریح، جراثیم، حفظان صحت، معالجات، امراض جنم وغیرہ کی عہد بعہد ترقی اسی طرح مصری، باغلی، چینی، ہندی، یونانی، عربی اور ایرانی طبوں پر مغربی زبانوں میں قابل قدر مواد فراہم ہے۔

ایرانی اور ہندوستانی مورخین کا طرز، قدیم عربی مورخین سے مختلف نہیں رہا۔ اردو میں آج بھی لکھے جانے والے زیادہ تر مضامین سوانحی طرز کی حیثیت رکھتے ہیں جو ثانوی مآخذ کی

روشنی میں مرتب کئے جاتے ہیں۔ داخلی شہادت یا اصل مانعہ اور براہ راست فنی تصانیف کے مطالعہ کے بغیر محض دوسرے مصنفین کے بیانات کے مطابق اظہار خیال کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایران اور ہندوستان دونوں جگہ اطباء کے تذکرے بھی بد قسمتی سے زیادہ ترتیب نہیں دئے گئے۔ سہاں تاریخ طب کے مطالعہ کرنے والے کو شعراء، ادباء، صوفیاء، علماء اور دوسرے عام تذکرہ میں اطباء کے حالات کی تلاش میں سرگرداں ہونا پڑتا ہے۔ ایران میں سحید نفیسی، ذبیح اللہ صفاء، قاسم غنی، محمود نجم آبادی، محمد تقی میر، سائرل انگوڈکی کو شخصیں اس ضمن میں قابل قدر ہیں لیکن ان کا زیادہ کام گیارہویں صدی تک کے عربی و ایرانی اکابر علی بن طبری، علی بن عباس مجوسی، ابو سہل مسیحی، محمد بن زکریا رازی، ابن سینا وغیرہ سے زیادہ آگے نہیں بڑھ سکا ہے۔ گیارہویں صدی کے بعد کے مشاہیر فن مثلاً فیث الدین شیرازی، مرزا قاضی، نور اللہ، بہاء الاولہ جیسے بہت سے اطباء اور مصنفین طب پر قابل ذکر کام نہیں کیا گیا ہے۔

ہندوستان میں یہ صورت حال اور افسوسناک ہے۔ طبی تاریخ کے ہندی گوشہ پر کوئی باقاعدہ توجہ نہیں دی جاسکتی ہے۔ تاریخ فن پر تو کچھ سہاں اطباء کے حالات اور تذکرہ میں بھی بہت کم کتابیں تحریر کی گئی ہیں۔ رموز الاطباء، رموز حکمت، تذکرہ الاطباء، تذکرہ اطباء۔ عہد عثمانی، تذکرہ خاندان عزیزی، تاریخ اطباء بہار، اطباء عہد مظفریہ، قانون ابن سینا کے شارحین و مترجمین کے ہندوستانی حصہ، حکیم اجمل خاں اور ان کے خاندان پر چند تالیفات، حیات کرم حسین، گنجینہ سلیمانی (افسر الاطباء حکیم سید فرزند علی کی سوانح) اور پروٹیسر سید عبدالقادر، حکیم نیر واسطی، حکیم کوثر چاند پوری، حکیم عبدالوہاب غمپوری، حکیم محمود احمد برکاتی کے مضامین کے سوا ہمارے پاس سرمایہ نہیں ہے۔

ہندوستان کی طبی تاریخ پر مواد کی عدم دستیابی کے علاوہ کام میں دشواری کی دو اور بڑی وجہیں ہیں۔ ایک اس ملک کی وسعت ہے برصغیر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اس کے مختلف علاقے اور ریاستیں بجائے خود ایک مستقل تاریخ کی متقاضی ہیں۔ دوسرے اس کی آٹھ سو سالہ طویل مدت میں پھیلی ہوئی تاریخ، جس کے مختلف ادوار شاندار طبی روایات کے حامل ہیں۔

طب یونانی کے ابتدائی ہندوستانی عہد پر جسے عہد سلطنت سے تعبیر کیا جاتا ہے، کام تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ مظفریہ عہد کے اطباء اور بعد کے معروف مصنفین کے مختصر حالات ملتے

ہیں۔ مغل ہمد میں کھسی گھنٹیں تواریخ آئین اکبری، اقبال نامہ جہانگیری، بادشاہ نامہ، منتخب التواریخ، عمل صلح، طبقات شاہجہانی، تذکرہ قائم خانی، آثار الاسراء، آثار جمعی، میں دیگر ماہرین فن کے ساتھ ساتھ اطباء کے ناموں کی فہرست یا مختصر تذکرہ تو ملتا ہے لیکن ان کے تفصیلی حالات شاذ و نادر دستیاب ہوتے ہیں۔ نزہۃ الخواطر میں بہمنی ہمد کے دو طبیبوں حکیم نصیر الدین شیرازی اور حکیم علیم الدین حمیری کا تذکرہ کیا گیا ہے اور صاحب نزہت نے فرشتہ کو اپنا ماتخذ بتایا ہے۔ لیکن خود فرشتہ میں صرف ان کا نام ہی نام درج ہے۔ ان کی طبی یا فنی سرگرمیوں کا تذکرہ نہیں ہے اس سے اس وقت کا اظہار مقصود ہے کہ جو ہمارے اولین ماتخذ ہیں ان سے ہمیں کوئی خاص روشنی نہیں ملتی ہے۔ صرف قیاسی گھوڑے دوڑانے پڑتے ہیں۔ تاریخ کی ان کتابوں میں مثلاً اکبر نامہ میں بادشاہ یا دیگر امرا کے امراض صائبہ میں مسکلا ہونے کا ذکر ملتا ہے اور اس کے ساتھ ان کے علاج معالجہ کا بھی اور بعض اوقات اطباء کی حجاز کا بھی لیکن ہزار فیض ہزار صفحات کی کتابوں میں اس قسم کے تین چار واقعات کا ڈھونڈنا جس قدر مشکل ہے وہ ظاہر ہے۔ نہ صرف مخطوطات بلکہ پرانی مطبوعات میں آج کل کی طرح اشاریہ نہیں ہوتا۔ اشاریہ کی صورت میں ایک محقق کی در دوسری بہت کم ہوجاتی ہے۔ تاریخی کتابوں میں مذکور اس قسم کے واقعات کی اہمیت یہ ہے کہ ان سے فن کی تاریخ مرتب ہوتی ہے۔ ان مؤرخین نے اطباء کی تصانیف کی روشنی میں ان کے فکر و فن کے تجزیہ اور محاکمہ کی رحمت نہیں کی ہے، ظاہر ہے وہ اتنی کے مکلف بھی نہیں تھے۔ اس لئے کہ یہ منصب اطباء کرام کا تھا مگر وہ بھی اپنی خصوصی معلومات کو علم سفینہ کے بجائے علم سینہ بنانے رکھنے پر مصر تھے۔ جبکہ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان میں سے اکثر اطباء اپنے فن کے علاوہ تاریخی بصیرت سے بہرہ ور تھے سیر و تذکرہ کے علاوہ انہوں نے دیگر تاریخی موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ بہادر شاہی دور میں حکیم احسن اللہ خاں غالب کو تاریخی معلومات فراہم کرتے تھے اور مرزا ان کی روشنی میں کتاب ترتیب دے رہے تھے، عمیر دہلوی تلمیذ ذوق سے حکیم احسن اللہ خاں نے قصہ ممتاز لکھوایا اور انہوں نے اس قصہ کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔

طبی مخطوطات کا علم و حصول، ان کی تدوین و اشاعت، ان کے مشمولات کے تجزیہ کے ذریعہ فکری و فنی مرتبہ کا تعین، خدمات اور پھر ان سب امور کی روشنی میں فن کا ارتقاء۔ یہ وہ ضروری جہات ہیں جن کی طرف توجہ مبذول کئے بغیر ہندوستان کی طبی تاریخ پر کام انجام نہیں

پاکستان۔ عام طور پر تاریخ طب کے عنوان سے جو مضمون لکھے جاتے ہیں وہ عوام پسند Popular قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں اسما و اعلام کی ایک طرح کی کھوتی Listing ہوتی ہے یا زیادہ سے زیادہ مخلوط اور مصنف کے بارے میں ایسی معلومات کا اظہار جو بیشتر حالات میں سغلی ہوتی ہیں۔ مخلوط کا کلنگی تجزیہ اور جو طبی نظریہ اس میں پیش کیا گیا ہے اس کے ارتقا اور اس کے تاریخی تسلسل پر روشنی نہیں ڈالی جاتی۔ اسی طرح جس مصنف کے مخلوط پر کام کیا جا رہا ہے اس کے تاریخی مرتبہ کا تعین، علمی و فنی حیثیت، اس کے مآخذ، دیگر تصانیف، بعد کے مصنفین پر اثرات، مہم اور شخصیت کے بارے میں ضروری تفصیل، ان امور سے عموماً صرف نظر کیا جاتا ہے۔ علم و تحقیق کا مرتبہ بہت بلند ہو چکا ہے۔ اس کے اعلیٰ نمونے ہمارے سامنے موجود ہیں۔ تحقیق و تفتیش کے جو معیارات قائم اور تسلیم کئے جا چکے ہیں ان کا احترام اور لحاظ ہر حالت میں ضروری ہے تاریخ طب کے مطالعہ اور اپنے قولے کام کے دور ان علمی طریقہ اور اصول تحقیق کے تعلق سے جو باہیں اہمیت کے ساتھ سامنے آتی ہیں انہیں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ طب کی صحیح ہیئت اور حدود تک رسائی اور مواد کی فراہمی کے لئے مخلوطات کی تلاش سب سے ضروری اور اہم ہے۔ طب کا کلاسیکی لٹریچر بیشتر مخلوطات کی شکل میں ہے جو ملک کے مختلف حصوں اور بیرونی ممالک میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ مخلوطات جن کتب خانوں میں محفوظ ہیں ان کے علم کی بہت شکلیں ہمارے سامنے نہیں ہیں اگرچہ بعض کتب خانوں کی فہرستیں موجود ہیں لیکن ہر بڑے مشہور کتب خانہ کی فہرست حیار نہیں ہوتی ہے۔

۲۔ مشہور اور بڑے کتب خانوں کے علاوہ ذاتی ذخیروں میں جو بیش قدر سرمایہ پوشیدہ ہے اس تک پہنچ اور اس سے استفادہ کے ذرائع بہت محدود ہیں اور اس کا شکوہ کئے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ بعض مالکین اس باب میں تحقیق کے ساتھ ضروری تعاون میں تساہل برتتے ہیں۔ اس طرح مخلوطات کی عدم دستیابی اور ان میں مندرجہ مواد سے پوری طرح واقفیت کا فقدان تاریخ طب کی تدوین میں سب سے بڑی دشواری اور کمی کا باعث ہے کیونکہ مشہور ملکی اور غیر ملکی کتب خانوں نیز ذاتی ذخائر تک دسترس اور ان کے تفصیلی مطالعہ کے بعد ہی آثار فنیہ اور طب کی تہذیب و ارتقا کا صحیح طور پر جائزہ پیش کیا جاسکتا ہے۔

اس سلسلہ میں خدائش لا تیرری پٹنہ کی خدمت کا اعتراف ضروری ہے۔ ۱۹۸۴ء میں

مخطوطات طب پر اس کی طرف سے مستندہ جنوبی ایشیائی علاقائی سیمینار اس سمت میں چلے
بڑے اہدام کی حیثیت رکھتا ہے خدا بخش جرنل کا شمارہ ۳۱-۲۹ اور شمارہ ۳۵ اور اس کے بعد
کتابی شکل میں "طب اسلامی بر صغیر میں" اس سنی جمیل کا مطہر ہے۔

۳۔ مخطوطات کے تعارف کے لئے اگرچہ برکھان اور اس کے بعد فواد سید گین،
احمد مزوی، عارف نوشاہی اور اسی طرح بعض دوسرے اصحاب کی کوششیں نہایت قابل قدر
ہیں اور یہ ایک حد تک بہت سے مشہور کتب خانوں کی فہرستوں سے بے نیاز کرتی ہیں۔ لیکن
ایسا نہیں ہے کہ تمام موجود مخطوطات کا ان میں احاطہ کر لیا گیا ہے۔ اس لئے مختلف کتب
خانوں کی فہرستوں کو خود بھی دیکھنا چاہیے، یہ اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ کتب خانوں میں
مخطوطات کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے اور ان کا اندراج بروقت اور فوری طور پر خود
کتب خانہ کی فہرست میں نہیں ہو پاتا ہے۔

۴۔ جن کتب خانوں کی فہرستیں موجود ہیں ان میں نقائص اور کوتاہیاں پائی جاتی ہیں
براہ راست مخطوطہ کو دیکھے بغیر محض فہرست پر اکتفا کر کے تحقیق کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ کتب
خانوں کی توفیقی یا غیر توفیقی فہرستوں یا رجسٹروں میں عجیب عجیب غلطیاں پائی جاتی ہیں۔
مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے مخطوطات کے رجسٹر میں حکیم شریف خاں کی ایک کتاب
نوبادہ ریاض دانش کے نام سے نظر سے گزری۔ اس نام کو دیکھ کر میں خوشی سے چونکا اور اسے
ان کی تصانیف میں نیا اضافہ سمجھا۔ لیکن اصل کتاب دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ ان کی عام
کتاب علاج الامراض کا نسخہ ہے۔ کتاب کے مقدمہ میں نوبادہ ریاض دانش بڑھ کر فہرست نگار
نے اسے اصل نام سمجھ لیا۔

کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کی فہرست مخطوطات میں محمد ہاشم دہلوی کی کتاب کا
"حاشیہ نفیسی" کے نام سے اندراج ہے یہ دراصل ان کی کتاب کشف الاشکالات ہے اور یہ
برہان الدین نفیسی کی شرح موجز نفیسی کا حاشیہ نہیں بلکہ برہان الدین نفیسی کی شرح الاسباب
والعلامات کے مشکل مقامات کی توفیح میں ہے۔

خدا بخش لائبریری پٹنہ میں فروق الامراض کا موجود نسخہ اسماعیل بن سلیمان اسرائیلی سے
منسوب کیا گیا ہے حالانکہ وہ اسماعیل بن حنین کی تصنیف ہے۔ اسی طرح دو کتابیں کتاب فی الوباء
واسبابہ اور کتاب فی حفظ العصب وازالة المرض قسطنین لوقا کے نام سے محفوظ ہیں جب کہ حقائق

کی روشنی میں یہ احتساب درست نہیں ہے۔

۵۔ ہندستان سے باہر ایشیا اور یورپ کے کتب خانوں میں طب کا جو قیمتی اثاثہ محفوظ ہے، اس سے واقفیت بہت ضروری ہے۔ کافی اہم مخطوطات جو ہندستان میں موجود نہیں ہیں اور جن کے بارے میں خیال ہے کہ وہ ضائع ہو چکے۔ لیکن بیرونی کتب خانوں کی فہرستوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نسخے دہاں کی منت ہیں۔ اگر ان مشہور کتب خانوں کی فہرستوں سے طبی مخطوطات کی فہرستیں یکجا کر دی جائیں تو طبی محققین کو بہت آسانی ہوگی، اس کے بعد اگر ان کے نادر مخطوطات کے عکس کے حصول کی کوشش کی جائے تو نہ صرف تاریخ طب بلکہ طب کے علمی ذخیرہ میں ایک بیش قیمت اضافہ کا باعث ہوگا۔

۶۔ نگ شدہ کتابوں کی بازیابی کی کوشش ایک اور اہم ضرورت ہے۔ بہت سی کتابوں کے حوالے بعد کے مصنفین کے کہاں پیش کئے گئے ہیں، لیکن اصل کتابیں ناپید ہیں۔ ابتدائی عربی عہد کی طبی تحریروں اور اور کنائش کی دریافت کا بظاہر امکان نہیں ہے لیکن ہندستان میں عہد سلطنت میں طب پر لکھی جانے والی کتابیں جن کی کچھ عرصہ پہلے تک موجودگی کا نشان ملتا ہے ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ ان کی تلاش میں اپنے ذرائع و وسائل کو کام میں لانا چاہیے۔ طب فیروز شاہی تعلقی جسے سترہویں صدی کی مشہور تصنیف قریبا دین خان زمانی اور اسی طرح اٹھارویں صدی کی تصنیف مجمع البحرین (۱۱۴۳ھ / ۱۷۵۰ء) میں بطور ناخذ استعمال کیا گیا ہے، ہمارے درمیان سے غائب ہے اور اس اہم ترین کتاب کا ابھی تک سراغ نہیں مل سکا ہے۔

۷۔ کتب خانوں کی فہرست میں کتابوں کے غلط ناموں کے اندراج کی طرح ایک ہی کتاب کو مختلف ناموں سے موسوم کئے جانے کی عام شکایت ہے۔ اس کی وجہ سے ایک شخص متعدد کتابوں کا مصنف سمجھا جاتا ہے۔ حکیم باقر کی ایک کتاب میرے ذخیرہ میں رسالہ ادویہ مفردہ و مرکبہ امراض عین، نظامیہ طبیہ کالج حیدر آباد میں رسالہ اکمل و مقالہ اہمل، رضالائبریری راجپور میں مقالتان در مفردات محمد باقر کے نام سے ہے۔ موازنہ سے معلوم ہوا کہ الگ الگ کتابوں کے بجائے یہ ایک ہی کتاب کے تین نام ہیں۔ مراہم و شیالات حکیم باقر کے نام سے جس کتاب کے حوالے ملتے ہیں، اس سے بھی یہی کتاب مراد ہے، جس میں امراض عین کے مفردات کے ساتھ مراہم و شیالات کے نسخے درج کئے گئے ہیں۔ مجمع النعاس و تجلیۃ العرایس میں شامل حکیم باقر کا رسالہ سائنس اکمال اس کا پانچواں نام ہے۔ نسخ خطی پڑھکی ایران

میں یہ رسالہ کمالی ساختن اکمال و مراہم کے نام سے مندرج ہے۔

حکیم مرزا علی شریف لکھنوی کی کتاب اسرار العلاج و الطراز الوہاج کتب خانہ مدوۃ العلماء لکھنوی میں رسالہ فی الحیات کے نام سے مندرج ہے۔ تعلیقات علی حیات قانون کے نام سے بھی یہ شہرت رکھتی ہے۔

مؤلف طب اسلامی حکیم محمد یحییٰ خاں نے ادویہ مفردہ کی کتابوں کے شمار میں جامع الادویہ والاقدیہ المفردۃ ابن بیطار اور مفردات ابن بیطار کو علاحدہ کتابوں کے بطور بیان کیا ہے۔

اسی طرح کثیت اور عام کی وجہ سے بعض مؤلفین کو محتاط ہوا ہے۔ حکیم محمد یحییٰ خاں ہی نے طبقات الاطباء ابن جلیل اور طبقات الاطباء سلیمان بن حسان اندلسی دو کتابیں شمار کرائی ہیں۔ یہ الگ الگ مصنفین کی کتابیں نہیں ہیں۔ سلیمان بن حسان اندلسی ہی ابن جلیل کے نام سے معروف ہے۔

مخطوطات کے غلط اندراج کی طرح بعض مطبوعہ کتابیں بھی غلط نام سے طبع ہوئی ہیں۔ مطب علوی خاں کے نام سے نو لکھنؤ پریس سے ایک کتاب متعدد بار طبع ہوئی ہے۔ وہ دراصل علوی خاں کا مطب نہیں ان کی دوسری کتاب رسالہ قوانین علاج ہے جو غلط طور پر مطب علوی خاں کے نام سے طبع ہوتا رہا ہے۔ حالانکہ اس مطبوعہ کی تہذیب میں اصل نام قوانین علاج درج ہے، جس کا چھاپتے وقت کوئی لحاظ نہیں کیا گیا۔

۸۔ بہت سی کتابیں دوسرے مصنفین سے غلط طور پر منسوب کر دی گئی ہیں۔ بعض کی طباعت بھی اس غلط احتساب کے ساتھ ہوئی ہے۔ زیادہ مقبولیت و شہرت یا نام اور خطاب کی یکسانیت اسی طرح ہم عصری اور مشترک عنوان اس قسم کی غلط فہمی کا باعث ہیں۔ بقراط کے نام منسوب سب کتابیں اس کی نہیں ہیں۔ ڈاکٹر آڈمس نے اپنی تحقیق کے ذریعہ بقراط اور بقراطی ذخیرہ تصانیف کے درمیان فرق کیا ہے اور بقراط کی واقعی کتابوں پر عالمانہ جبرہ کیا ہے۔ جابر بن حیان، ثابت بن قرۃ، قسط بن لوقا، حسین بن اسحاق اسی طرح علوی خاں وغیرہ سے جو کتابیں منسوب ہیں ان کی صحت کا تحقیق کرنے والے جانہ جائزہ لیا ہے۔ اس قسم کی تحقیق کے لئے مواد، اسلوب، معاصرین، حوالہ جاتی کتب اور اس مہم کی عام معلومات سے رہنمائی ملتی ہے۔

ایران کے مشہور مصنف بہاء الدولہ کی کتاب خلاصۃ التجارب ہندستان میں علوی خاں

کے نام سے چھپی اور علوی خاں پر لکھنے والے اسے علوی خاں کی کتاب سمجھتے رہے۔ حکیم کوثر چاند پوری نے اطباء ہمد مستطیہ میں اسے علوی خاں کی تصانیف ہی میں شمار کر لیا ہے۔ میں نے صفوی ہمد کی علم تشریح کے مطالعہ میں اس کی نشاندہی کی تھی اسی طرح اتھذ الطیہ و البیاض الکلیہ علوی خاں کی کتاب سمجھی جاتی رہی حالانکہ وہ ان کی تصنیف نہیں ہے۔ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں خان زمان کی گنج ہاؤ اور دکا ایک باب ایک رسالہ کی شکل میں محفوظ ہے۔ ناقل نے اس رسالہ کو دار الشکوہ کی تصنیف قرار دے رکھا ہے۔

۹۔ تاریخی امور کی تحقیق میں صحیح متن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن طبی کتب کے سلسلے میں یہ اہمیت اور بڑھ جاتی ہے کیونکہ اس میں تساہل بجز غفلت کا مترادف ہو سکتا ہے کسی بھی کتاب کے مخطوطات میں اشکاف فراوان ہے۔ بدقسمتی سے طب کی چند کتابوں کو جو ذکر باقی مطبوعہ کتابوں کے سلسلے میں یہ افسوسناک صورت حال ہے کہ انہیں تحقیق کے تقاضوں کے مطابق مرتب و مدون نہیں کیا گیا ہے۔ اکثر کتابیں محض ایک مخطوطہ کو بنیاد بنا کر چھپ دی گئی ہیں اور بعض حالات میں دو سے زیادہ نسخوں کو سامنے نہیں رکھا گیا ہے، جبکہ ان کے متحدہ نسخوں کی موجودگی ثابت ہے اور ان کے حصول میں بظاہر کوئی دشواری نہیں تھی، پھر اس ترتیب میں جو محنت، عرق ریزی اور فنی شعور درکار ہے اس کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔

۱۰۔ دیگر موضوعات کی فہمی کتابوں کی طرح طبی کتب کے کچھ اپنے مستحکمات ہیں طبی مخطوطات کی ترتیب و محدو دین میں ان کا لحاظ ضروری ہے۔ مثلاً امراض کی اصطلاحوں کی وضاحت ادویہ کے غیر معروف ناموں کے مترادفات، قدیم اوزان و مکائیل کی مروجہ پیمائشوں سے نسبت، دواؤں کے نئے خواص یا نئے نظریے کی دوسرے حوالوں سے تائید و توثیق یا پھر مصنف کی ذاتی تحقیق و اضافہ پر روشنی۔

۱۱۔ مخطوطہ کا تجزیہ ایک ضروری امر ہے۔ کتابوں کے جمل اور حذف و اضافہ کی بہت سی مثالیں سامنے آتی ہیں۔ فہمی کتابوں میں کثمت کی جو غلطیاں پائی جاتی ہیں ان سے ہمواد قات منہوم کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے اور مصنف کی اصل تحریر سامنے نہ آنے کی وجہ سے اس کے افکار و نظریات کے بارے میں صحیح رائے قائم نہیں ہو سکتی اس لئے کاتب کی کم علمی، زبان و فن سے ناواقفیت اور فہم دور فہم کی وجہ سے افلاط پر نظر رہی ضروری ہے صرف مخطوطہ کے ظاہر

مطالعہ ہے ہی اس قسم کی غلطیوں کی تصحیح کی جاسکتی ہے۔ افسانوں کی جگہ افسانوں، نگر کی جگہ کدر، کبر کی جگہ کعبہ، سرخیم ہابی کی جگہ سنگ سرہابی، اسی طرح مرکب کے بعض اجزاء چھوٹ جانے سے کتنا نقصان واقع ہوتا ہے۔ یہ ستم ظریفی بھی ہے کہ اوپر کی دوا کے خواص کے تحت نیچے مذکور دوا کے خواص اس لئے نقل ہو گئے کہ نیچے کی دوا کا عنوان کامب سے چھوٹ گیا اور پھر یہ غلطی دہرائی جاتی رہی۔ اور بعد کے مصنفین کے یہاں دوسری دوا کے خواص پہلی دوا کے خواص کے ساتھ درج ہوتے رہے۔

۴۔ اگر کسی کتاب میں دوسرے مصنف کی کوئی عبارت نقل ہے تو محض اس پر اعتماد کافی نہیں اصل سے اس کے مقابلہ کی کوشش تحقیقی طور پر پسندیدہ ہوگی۔ متن اور عبارت کی نقل میں احتیاط لازم ہے بعض مرتبہ ایک عبارت مختلف انداز میں اس طرح نقل ہوتی ہے کہ اصل بات نہ صرف اوچھل ہو جاتی ہے بلکہ اس کا مفہوم بدل جاتا ہے۔ ترجمہ کی صورت میں اس کا لحاظ اور اصل سے مقابلہ خاص طور پر ضروری سمجھنا چاہیے۔

ایک مضمون نگار نے حکیم احمد اللہ خاں مدرسی کی کتابوں کا تعارف کراتے ہوئے ان کی ایک کتاب "نسخہ جات" کا ذکر کیا ہے۔ اس میں مذکور اطریش زانی کے تحت لکھا ہے کہ "تالیف حقیر کہ سمنی باسم والد خود ساختہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف مشہور حکیم زمانی کے فرزند ہیں"۔ یہاں مضمون نگار نے غلطی سے یہ سمجھا ہے کہ اطریش زانی کا نسخہ حکیم احمد اللہ کا تالیف کردہ ہے اور یہ کہ حکیم زمانی ان کے والد کا نام ہے، جبکہ اطریش زانی حکیم میر محمد مومن کی تالیف ہے جسے انہوں نے اپنے والد حکیم میر محمد زماں کے نام سے منسوب کیا ہے۔

۵۔ مصادر کا حوالہ یادداشت اور دوسروں سے سنی ہوئی بات کی بنیاد پر نہیں ہونا چاہیے۔ حافضہ کی بنیاد پر حوالوں میں غلطیاں ہو جاتی ہیں اور دوسرے لوگ اسے ماخذ بنا کر استعمال کرتے ہیں اور اس طرح نقل کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ حق کی ذمہ داری ہے کہ خود اصل ماخذ تک پہنچنے بصورت دیگر ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ثانوی ماخذ کی تصریح ضروری ہے۔

۶۔ سنین کے بیان کو خاص طور پر دیکھنا چاہیے۔ گورنمنٹ لائبریری مدراس میں موجود حمزہ خانی کے خطوط کے تعارف میں ایک مضمون نگار نے صاحب حمزہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

۱۰۹۰۲ء / ۱۳۹۹ھ میں شیراز گیا، جہاں جلال الدین دوانی سے حکمت و حدیث اور حماد الدین محمود سے طب کی کتابیں پڑھیں۔ اس سنہ کو درست تسلیم کیا جائے تو یہ حماد الدین کی پیدائش سے پہلے کا زمانہ قرار پاتا ہے اور شاگردی کی رولت مشکوک ہو جاتی ہے لیکن یہ دراصل اشتباہ ہے، جسے ۹۵۲ھ کے بجائے سمجھا گیا ہے۔

اسی طرح قطعات تاریخ سے جو تاریخیں برآمد ہوتی ہیں، ان سے بعض وقت بڑی غلط فہمی ہو جاتی ہے یہ تاریخیں حساب پر پوری نہیں اتریں۔ ان کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

ہجری اور عیسوی سنہ کی مطابقت میں عام طور پر محققین کو اشتباہ ہوا ہے۔ ہجری سنہ کو عیسوی سنہ سے مطابقت دیتے وقت صرف سال ہی نہیں دیکھنا چاہئے بلکہ تاریخوں اور مہینوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے اس تطابق میں غلطی اس وجہ سے بھی واقع ہوتی ہے کہ کوئی ہجری سال دو عیسوی سالوں پر محیط ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ان دونوں سنوں کا لکھنا ضروری ہے۔ مثلاً ۱۳۰۹ھ کو عیسوی سنہ سے مطابق کرتے وقت ۱۹۸۸ اور ۱۹۸۹ دونوں سنہ لکھنے پڑیں گے۔ اس لئے کہ ۱۳۰۹ھ ۱۹۸۸ء میں شروع ہوا تھا اور ۱۹۸۹ء میں ختم ہو رہا ہے۔

۱۵۔ بعض مخلوطات میں مصنف، سنہ تصنیف، فرمانروائے وقت یا دوسری منسلک شخصیتوں کا تذکرہ نہیں ہوتا ہے جس کی وجہ سے خطوط کا عہد ظاہر کرنا مشکل ہوتا ہے۔ سنہ کی تعیین کے ذریعہ اس عہد کی طبی معلومات کے جائزہ میں مدد ملتی ہے۔ اس کے لئے خطوط کے مواد کے بغور مطالعہ اور اس کے مضامین کے دوسری متعینہ عہد کی کتابوں سے مقابلہ کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچنا ممکن ہے۔ اگر نظر وسیع ہو تو اس سلسلہ میں محاصرہ شہاد میں، دیگر مصنفین کے بیانات اور کتابوں کے ماخذ اطلاع کا خاص ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔

۱۶۔ مشہور اور عام باتوں کے لیے سند کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن اہم اور نئی بات کے لئے حوالہ دینا چاہیے اگر کسی مصنف کا قول یا کسی کتاب کا متن نقل کیا گیا ہے تو اس کا حوالہ بھی ضروری ہے، حماد الدین محمود شیرازی کے بارے میں فہرست مشترک پاکستان میں تحریر ہے کہ اس نے بیس برس ہندستان میں گزارے اور دربار اودھ میں جگہ پائی، یہ نئی بات تحقیق کی روشنی میں درست نہیں ہے۔ اس کا ثبوت ضروری تھا۔

۱۷۔ مصادر تک رسائی کے لئے کتاب کے ماخذ کی فہرست پر خاص طور پر نظر ڈالنا چاہیے

اس کے ذریعہ ہمیشہ دو مصنفین کی بہت سی ایسی کتابوں کا سراغ ملتا ہے جو خواہ ہماری دسترس سے باہر ہیں لیکن ان کی وجہ سے کم از کم طبی تصانیف اور تالیفات کا اظہار ہوتا ہے۔ طب ہیبائی کے ذریعہ حوالہ جاتی کتب کے بطور مجموعہ محمدی، مجموعہ ملکی، طب علانی کے بارے میں ہم جاننے کے قابل ہو سکے ہیں اسی طرح بعض کتابوں کی بدولت ہمیں طب فیروز شاہی تعلق کا عام معلوم ہوتا ہے۔ جب کہ ان کتابوں کے نسخے ابھی تک دریافت نہیں ہوئے ہیں۔

ماخذ کے ملاحظہ سے قدیم مصنفین کے مرتبہ کا بھی پتہ چلتا ہے کہ کس طرح ان کے بعد آنے والوں نے ان کی علمی جلالت قدر کا اعتراف کیا۔ اور یہ کہ ایک کتاب نے بعد کے مصنفین پر کس قدر اثرات مرتب کئے اور اس طرح ایک مصنف مرنے کے بعد بھی کتنے عرصہ تک زندہ رہا یہ یقیناً ایک مصنف کی عظمت کا ثبوت ہے کہ اسے ایک مدت گزرنے کے بعد بھی ماخذ کے طور پر استعمال کیا گیا۔

۱۸۔ اسامی علوم و فنون پر جو ہمیشہ قرار کتابیں تصنیف کی گئی ہیں اور جو اپنے موضوع پر اعلیٰ انسانی کھوپڑیا کی حیثیت رکھتی ہیں مصادر کے لیے ان سے رجوع و استفادہ بہت مفید ہے۔ مثلاً الفہرست ابن ندیم، اقسام العلوم ابو زید علی تلمیذ الکندی، احصاء العلوم ابو نصر فارابی، مفتاح العلوم ابو سعید اللخارزمی، حقائق الانوار فی حقائق الاسرار فخر الدین رازی، نفائس الفنون فی عرائض العیون شمس الدین محمد بن محمود آملی، جواہر العلوم ہمایونی محمد فاضل قاضی سمرقندی، مفتاح السعادة طاش کبریٰ زادہ، کشف الفنون حلی خلیفہ، اسجد العلوم نواب صدیق حسن خاں اکتفاء القنوع، مباحو المطبوع، ان میں مختلف موضوعات کی ہزاروں کتابوں اور ان کے مصنفین کے اندراجات ہیں۔ ان میں طبی کتابوں اور اطباء کے بارے میں ایسی بہت تفصیلات پیش کی گئی ہیں جن پر دوسرے ذرائع سے روشنی نہیں پڑتی ہے۔ ان میں صرف سترہویں صدی کے مصنف حلی خلیفہ کے یہاں تقریباً ایک لاکھ چالیس ہزار پانچ سو کتابوں اور ان مصنفوں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ افسوس، اس کی ترتیب علوم و فنون یا مصنفین کے بنیاد پر نہیں ہے۔ کتاب کے نام سے یہ حروف تہجی کے مطابق مرتب کی گئی ہے اس لیے اس سے کسی ایک موضوع یا کسی ایک مصنف کی کتابوں کے بارے میں معلومات اخذ کرنا آسان نہیں ہے اس کے واسطے پوری کتاب پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے اگر اس کی ترتیب موضوع یا مصنف کے نام سے قائم کی جا سکے تو اس سے استفادہ کی آسان صورت

پیدا ہو سکتی ہے۔

۱۸۔ جس مہد کی طبی تاریخ کا مطالعہ مقصود ہو اس مہد کی عام تاریخ پر یا اس مہد کے مشاہیر پر جو مواد دستیاب ہے اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ اس کے ذریعہ نہ صرف طب سے متعلق معلومات سامنے آتی ہیں بلکہ علمی و تمدنی مزاج اور دوسرے علوم سے طب کے جو روابط رہے ہیں ان کی وجہ سے طبی نظریات و اعمال کے پس منظر اور ارتقائی شکل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ہندستان میں یونانی طب کی تاریخ کا جہاں کی عام علمی و فنی تاریخ کے وسیع مناظر میں مطالعہ درکار ہے۔ کوئی بھی علم و فن اپنے زمانے کے دوسرے علوم کی ترقیوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتا ان کے درمیان ہم آہنگی اور ترقی کا ایک شعوری یا غیر شعوری تعلق ہوتا ہے۔ تاریخ کے مطالعہ میں اس تعلق کی خاص اہمیت ہے۔ کسی بھی ملک کی علمی نشاۃ ثانیہ یا اس کے عہد زریں کا دائرہ کسی ایک شعبہ علم تک محدود نہیں رہتا۔ انسانی فکر و ذہن کی ترقی کا اثر پوری فضاۓ علم پر مرتب ہوتا ہے۔ دوسرے علوم کی خاموشی کا زمانہ طب میں بھی سنائے کا زمانہ ہے۔

۲۰۔ قدیم ماخذ اور حوالوں کے علاوہ متعلقہ موضوعات پر جو نئے مضامین اور نئے مباحث سامنے آئے ہیں، ان سے استفادہ ضروری ہے۔ ان نئی چیزوں کو پیش نظر نہ رکھنے اور دریافت شدہ جدید تحقیقی معلومات سے بے خبری کے باعث محض قدیم اطلاعات اور قدیم نقطہ نظر کی ترجمانی ہوتی ہے اور تحقیق جامع و مکمل نہیں ہو پاتی۔ میں نے ہندستان کے کتب خانوں میں طبی مخطوطات کے تعلق سے خدا بخش پٹنہ کو اطلاع دی کہ غزالدین فجندی کی کتاب الطروج الی اسرار التنقیح اور تنقیح المکنون ایک ہی کتاب ہے اور یہ میں نے اس تحقیق کے بعد لکھا تھا کہ فجندی نے پہلے اس کا نام تنقیح غلق المکنون رکھا پھر دوبارہ اضافہ کرتے ہوئے اسے الطروج الی اسرار التنقیح کے نام سے موسوم کیا۔ طب اسلامی برصغیر میں۔ تحقیق مزید اسرار اک کے عنوان سے میرے حوالہ سے اس کو طبع کیا گیا مگر ادارہ کی طرف سے حاشیہ میں یہ نوٹ لگایا گیا۔ کشف الطنون اور رضا لاہیری کیٹلاگ کی بنا پر دونوں دو کتابیں ہیں۔ دو علاحدہ کتابوں ہی کی تو میں نے نفی کی تھی مگر ادارہ نے کشف الطنون اور رضا لاہیری کے کیٹلاگ کو کافی سمجھا اور اس کی نظر ان سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ بحکم المولفین میں بھی ان کتابوں کو دو علاحدہ کتابوں کے

بطور بیان کیا گیا ہے۔ میں نے قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین میں اس پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

خدا بخش کے اسی اسرار اک میں میرے حوالے سے تحریر ہے کہ طب فاروقی شمار ۳۲۳ دراصل طب شہابی ہے۔ اس کے حاشیہ میں ادارہ کا دلچسپ نوٹ ملاحظہ ہو۔ آصفیہ کی فہرست میں ۹۵۸ پر طب شہابی کے دو نسخوں کا تذکرہ ہے پھر اسی صفحہ پر طب فاروقی کا تذکرہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فہرست نگار کے خیال میں دونوں جداگانہ کتابیں ہیں۔ یہاں پر لطف بات یہ ہے کہ یہ سارا فسانہ اس بنیاد پر ہے کہ میں نے شمار ۳۲۳ پر شبہ ظاہر کیا تھا جو طب موسیقی حکیم شہاب بن عبد الکریم کے نام سے درج ہے۔ ادارہ نے ۳۲۳ کو ۳۲۳ سمجھ کر اسے طب فاروقی سے ملا دیا۔ ظاہر ہے میں طب فاروقی از حکیم فخر الدین اور طب شہابی از حکیم شہاب بن عبد الکریم کو ایک کیسے قرار دے سکتا تھا، مگر ادارہ نے غلط نمبر پڑھ کر کسی تحقیق کے بغیر اپنی دانست میں میرے بیان کی تخطیط کر دی، بغیر تحقیق اس طرح کی بہت سی غلطیاں راہ پا جاتی ہیں اور ان کا غلط اتساب ہو جاتا ہے۔

۲۱۔ تاریخ کی عمومی کتابوں کے علاوہ مختلف علاقوں کے جو تراجم مرتب ہوئے ہیں مثلاً تذکرہ کاظمی، تذکرہ علماء فرنگی محل، تذکرہ علماء پنجاب، تذکرہ مشاہیر کاکورہ، مشاہیر اکبر آباد، تاریخ فرخ آباد، آثار العنایید، اردو ادب کی تاریخ میں مجموعہ پال کا حصہ، تاریخ قضاۃ و مفتیان بھوپال وغیرہ اسی طرح شعراء اور صوفیاء کے تذکرہ اور مشاہیر علم و فن پر جو عام کتابیں لکھی گئیں ہیں مثلاً نزہۃ الخواطر، الثقافۃ الاسلامیہ فی المحدث، تذکرہ علماء ہند، ان سے بھی تاریخ طب کے سلسلہ میں مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں ان سے جہاں طبیبوں کی سوانح اور خدمات پر روشنی پڑتی ہے وہاں غیر طبیبوں کے تذکرے میں بھی ایسی باتیں آجاتی ہیں جو اہم طبی اطلاعات پر مبنی ہوتی ہیں۔ تذکرہ کاظمی رامپور کے ذیل میں حکیم یعقوب کے دربار اودھ میں باریابی پانے کے بارے میں لکھا ہے کہ حکیم یعقوب کا تقرر قدسیہ محل کی سرکار میں ان کی توجہ سے ہوا۔ اس اہم اطلاع کا یہ واحد ذریعہ ہے۔

۲۲۔ اشاعتی اداروں کی فہرستوں سے بھی اس سلسلہ میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس سے نہ صرف ایسی طبع شدہ کتابوں کا حال معلوم ہوتا ہے جو نایاب ہیں اور جن کی طباعت کا عام طور پر علم نہیں ہے۔ بلکہ ان کی اولین اشاعتوں اور مرتب اور طابع و ناشر کا بھی پتہ چلتا ہے۔

ہندستان میں مطبع نامی، مطبع نوکشتور، مطبع نظامی اور دوسرے مطابع کی فہرستیں مصادر تک پہنچ کا خاص ذریعہ ہیں۔ ہندستان سے باہر پاکستان، ایران، ترکی، برطانیہ، روس اور مختلف عرب ممالک کا ہرہ، کتب، لبنان کی فہرست مطبوعات سے طب کی بعض ایسی کتابوں کی اشاعت سامنے آئی جن کے مطبوعہ کتب میرے علم کی حد تک ہندستان کے مشہور کتب خانوں اور طبی اداروں میں موجود نہیں۔ ان کے بارے میں علم کا واحد ذریعہ صرف ان اشاعتی اداروں کی فہرستیں تھیں۔ اسپین کے ایک کتبہ کی فہرست کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہوں گا، اس سے کتاب الحشائش دیستوریہ دوس، اختصار جالینوس ابن رشد، کلیات الاغذیہ ابن زہر، کتاب الاغذیہ سلیمان بن اسحاق اسرائیلی، تقویم الصغیر ابن بطالان جیسی کتابوں کی اشاعت کا علم ہوا۔

۲۳۔ عام تواریخ و تذکرے کے علاوہ سفرناموں، مکاتیب، ڈائری، روزنامے، پرانے اخبارات و رسائل اور ادبی تحریروں کو بھی استعمال کرنا چاہیے تاریخ طب سے براہ راست متعلق نہ ہوتے ہوئے ان میں بعض ایسے کوائف اور اندراجات مل جاتے ہیں جن سے تاریخ نگاری میں فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے عرب اطباء کی کان کی چھوٹی ہڈیوں کی دریافت کا کسی طبی یا تشریحی کتاب سے پتہ نہیں چلتا۔ الف لیلہ میں ایک کنیز تودہ کے واقعہ سے اس تاریخی حقیقت کا علم ہو سکا۔ عبداللطیف بغدادی کے سفرنامہ مصر سے علم تشریح کے سلسلے میں اس کے اضافات سامنے آئے اور قدیم ماہرین تشریح کی غلطیوں کی نشاندہی اور اصلاح جو اس کے صفحات پر رقم ہے، طب و تشریح کی کتابیں اس کی تفصیل پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ شفاء الملک حکیم عبدالحمید کی شخصیت پر انشاء ماجدی میں جس موثر ادبی پیرایہ میں روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کی فنی دانشوری کے بارے میں جس طرح اظہار خیال کیا گیا ہے، وہ کسی طبی کتاب کے ذریعہ بڑھنے میں نہیں آئے گا۔ خواجہ حسن نظامی کے روزنامے میں ان کے زمانے کے کافی اطباء کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مولانا قاسم نانوتوی کے مکتوب میں حکیم ابراہیم لکھنوی کا جس احترام سے نام لیا گیا ہے وہ ان کے فنی مرجع پر شاہد ہے۔ ۱۸۶۱ء کے بمبئی کے عمدۃ الاخبار میں حکیم احسن اللہ خاں کی آخری زندگی کے جو حالات ملتے ہیں ان کے متعلق جتنے کا ہمارے پاس کوئی اور دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔

۲۴۔ طبی بیاضیں اور نسخوں کے مجموعے جو ہندستان میں کثرت سے لکھے گئے ہیں اور بڑی تعداد میں محفوظ ہیں، اس لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کے ذریعہ اہم تاریخی معلومات

کے حصول میں مدد ملتی ہے۔ تاریخ طب کے طالب علم کے لئے علاج امراض سے زیادہ وہ واقعات دلچسپ کا باعث ہوتے ہیں جو شخصیت اور فن سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں صاحب طب کے اسفار، دوسرے شہروں کے قیام، اساتذہ، تلامذہ، اعزاء، احباب اور طبی سرگرمیوں کا ذکر ملتا ہے۔ مختلف فرمانروا، امرا اور دوسری نامور شخصیتوں کے لئے جو نسخے جوہز کئے گئے ہیں، ان سے اس مہد کی سلیقہ زندگی اور طبکی مختلف دالہنگیوں کا بھی علم ہوتا ہے۔ حکیم اسمعیل لکھنوی کا نوابان رامپور اور داہد علی شاہ سے علانی تعلق کا واحد ذریعہ ایک طبی بیاض ہے، جس میں ان اصحاب کے لئے ان کے جوہز کردہ نسخے نقل ہیں۔ اطباء لکھنؤ کے طب کے مجموعوں سے شاہان اودھ کی مختلف بیماریوں اور دربار اودھ سے وابستہ طبیوں کے نام یکجا کئے جاسکتے ہیں۔

۲۵۔ کسی تاریخی موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس سے متعلق مواد کی فراہمی کس قدر ہو سکتی ہے۔ بعض لوگ اس کا خیال نہیں رکھتے۔ اور اہم ناخذ ان کی نظر سے نہ گزرنے کی وجہ سے متعلقہ موضوع پر ان کا کام ناقص اور نامکمل رہتا ہے۔ تمام معلومات کے احاطہ کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن جہاں تک ممکن ہو کافی مطالعہ اور ممکن و میر ذرائع کے استعمال کے بعد ہی قلم اٹھانا چاہیے۔

۳۶۔ بعض مصنفین کی کتابوں سے ان کے بارے میں براہ راست واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اس داخلی شہادت کی تاریخ نگاری میں بڑی اہمیت ہے۔ خود مصنف کو پڑھ کر اس کی شخصیت و فکر کے ساتھ اس موضوع کی دوسری ایسی معلومات فراہم ہوتی ہیں جن کی روشنی میں مؤرخ کو آگے بڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ بعض ناپید کتابوں کے اہم حوالے، دوسرے اہل فن کے بعض اہم بیانات، اسی طرح بعض اہم فنی مباحث اور بعض اہم سراغ ایسے ہاتھ آتے ہیں جن کی طرف کسی دوسرے ذریعہ سے رہنمائی نہیں ہوتی۔

بعض مصنف اتنے بند اور خاموش ہوتے ہیں کہ نہ صرف ان کے تعلق سے بلکہ دوسرے اصحاب اور اور دوسری کتابوں کے تعلق سے بھی ان سے کچھ نہیں برآمد ہوتا۔ لیکن یہ رائے اور تبصرہ بھی اسی وقت ممکن ہے جب اصل کتاب پیش نظر ہو۔ مثلاً خود شیخ زمریس ابن سینا کبھی کھل کر بات نہیں کرتا دوسرے شہروں میں اپنی منتقلی کے بارے میں وہ صرف "دمی العزرة" ضرورت لائق ہوتی۔ کم کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح علانی و فنی اور اپنے مہد کے

دوسرے اہم واقعات کے اظہار میں اس کے یہاں گریز کا پہلو رہتا ہے۔ مصادر و منابع کے سلسلہ میں بھی یہی صورت حال پائی جاتی ہے۔

۲۷۔ ہر موضوع کی زبان و اصطلاحات الگ ہوتی ہیں۔ شعر و ادب، فلسفہ و تصوف، طب اور دیگر سہل و علی موضوعات پر لکھنے سے پہلے اس موضوع کے معجز مصنفین اور اساتذہ کے طرز نگارش اور اسلوب کا مطالعہ مفید ہوتا ہے۔ خطابت، جوش بیان اور آرائش سخن اسی طرح طرف داری یا مخالفانہ طرز فکر اور پہلے سے قائم کردہ ذہن تاریخی تحقیق کے لئے مناسب نہیں۔ واقعات کو اصل خود و خیال کے آئینے میں پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

۲۸۔ محقق اور تاریخ نگار کے لئے قطعیت اور قیصلہ کن انداز میں کچھ کہنا آسان نہیں ہے نتائج کے استنباط یا حقیقت واقعہ کے اظہار کے لئے محتاط الفاظ کے استعمال کی ضرورت ہے۔ مزید مواد کی دریافت ہر وقت ممکن ہے۔ خود ایک محقق کو نئی دریافت سلسلے آنے پر اپنی رائے اور اخذ شدہ نتائج سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے قطعیت اور تحکم سے گریز کرنا چاہیے۔

۲۹۔ تاریخ ایک ایسا مضمون ہے جس میں فرو گزاشتوں اور غلط نتائج کے استنباط کی غالباً سب سے زیادہ گنجائش ہے۔ اس لئے مؤرخین کے بیانات کو محرومی اور تنقیدی نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے نئے حقائق کی تلاش و دریافت سے زیادہ تاریخی کی موجودہ کتابوں اور معلوم شواہد کا گہرے تحقیقی شعور کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے ڈاکٹر سائلر الگوڈ نے جو تاریخ طب ایران پر سند کجے جاتے ہیں باقر کو عماد الدین محمود شیرازی کا باپ لکھا ہے حالانکہ وہ ان کا بیٹا ہے، صاحب فصول فیض اللہ خانی حکیم بلنزیہ، رحمت اللہ گنگوہی کے صاحبزادہ ہیں حکیم کوثر چاند پوری نے انہیں حکیم کبیر علی انصاری سنبھلی کا بیٹا لکھ دیا ہے، جبکہ حکیم کبیر علی سنبھلی بلنزیہ کے استاد تھے۔ مناظر حسن گیلانی نے ضیاء الدین نخشب کی کتاب الطلیات والجزئیات کے نام سے قانون ابن سینا سے اس کا رشتہ قائم کیا ہے جبکہ اس کا سرے سے کلیات کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۳۰۔ کسی فن کی تاریخ پر کام کرنے کے لئے اس فن کی پوری واقفیت اور جس زبان میں اس فن کی اہم اور نامزد کی کتابیں دستیاب ہیں اس زبان کا بخوبی علم ضروری ہے۔ فن اور زبان دونوں سے ناآشنائی تاریخ نگاری کے لئے نقصان کا باعث ہے۔ مؤرخ کے لئے لازم ہے

کہ ~~مفسون~~ مفسون میں اس قدر مہارت حاصل کرے اور اس کی پوری فضا، مزاج اور عہد سے اس قدر شناسا ہو کہ اس کی صحیح تصویر پیش کر سکے۔ کسی مؤرخ کی یہ خوبی ہے کہ جس عہد پر وہ نگاہ رہا ہے اس پر اس طرح قلم اٹھائے کہ قاری کی نگاہ کے سامنے اس کا پورا منظر آجائے۔

طب یونانی کی تاریخ پر ملک اور ملک سے باہر جو کام ہوا ہے اس کی قدر و قیمت کے اعتراف کے باوجود ایک تشنگی اور کمی کا احساس ہوتا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان مؤرخین میں تقریباً تمام فن طب سے عکس ناواقف اور ان میں سے اکثر ان زبانوں سے جن میں طب کی کتابیں ہیں، میری مراد عربی و فارسی سے ہے، نا آشنا ہیں۔ طب یونانی کی تاریخ ایسے مؤرخین کے قلم کی منتظر ہے جنہوں نے اس کی بالاعدہ تعلیم حاصل کی ہے اور جو اس کے مآخذ کی زبانوں سے واقف ہیں۔



بھاگ متی کا تاریخی وجود

بانی حیدر آباد محمد قلی قطب شاہ کے بھاگ متی سے معاشرے کی بات زبان زد عام ہے۔ یہ تاریخ اور روایت دونوں کا ایک حصہ بن کر رہ گئی ہے۔ میں نے تاریخ اور روایت کو یکساں اس لیے کیا ہے کہ عوام کو تاریخ نہیں ماننا چاہتا۔ کئی واقعات تاریخی تو ہوتے ہیں لیکن روایت نہیں بن پاتے کیونکہ ان میں رومان اور ڈرامے کا عنصر نہیں ہوتا۔ مثلاً انارکلی کی داستان روایت ہے، کیونکہ کسی مستند تاریخ میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ برعکس اس کے پورس کا سکندر کو جواب ایک ایسی ڈرامائی دلیری اور بلند کرداری کا حامل ہے کہ ایک تاریخی واقعہ ہونے کے ساتھ ساتھ روایت کا بھی ایک جز بن گیا ہے۔ بھاگ متی کی داستان بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ اس واقعہ میں رومان کا عنصر غالب ہے۔ ایک سلطان کا ایک عام عورت سے عشق کرنا قہج کی بات نہیں، لیکن اس کو بھانا مزور حیرانی کا باعث ہے اور اسی لئے قابل تعریف بھی۔ اس سے شادی رچانا اور بعد میں اس کے نام پر ایک شہر بسانا ایک ایسے تاج محلی شدید لیکن ثابت قدم جذبہ کا مظہر ہے جس پر ہم رشک بھی کرتے ہیں اور عشق عشق بھی۔ رشک شدت پر اور عشق عشق ثابت قدمی پر۔ حکمرانوں سے ایسی وفاداری اور ثابت قدمی کی توقع نہیں کی جاتی۔ ان کے حرم ایسی بد نصیب عورتوں سے اٹے پڑے ہوتے ہیں جو اوسطاً صرف ایک رات کی رانی ہی بن پاتی ہیں۔ مغلوں کے مورخ مہنی لال نے اپنی کتاب 'Mughal Glory' کے ایک باب میں مغلیہ حرم کے مکینوں کے المٹاک شب و روز کا ذکر کیا ہے۔ محمد قلی کا بھی ایک حرم تھا۔ اس میں بہت سی عورتیں اپنی زندگی کے دن کسی نہ کسی طرح گزار رہی تھیں۔ لیکن بھاگ متی جب تک زندہ رہی محمد قلی کے دل پر حکومت کرتی رہی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہی۔ اس میں بیویوں کے لیے ایک اشتداد ہے۔ میرے انداز سے کے مطابق بھاگ متی تقریباً ۴۰ سال کی عمر میں وفات پا گئی۔ محمد قلی نے ۴۶ سال کی عمر پائی بھاگ متی کی موت پر ہی عیش و طرب کے اس شہزادے نے غالباً ہجر اور فرقت کے وہ مشہور بند لکھے جو آج بھی حیدر آباد میں گائے جاتے ہیں بسہ

پیا باج پیا لہ پیا جائے نہ پیا باج یک تل گیا جائے نہ
کئے ہیں پیا بن مصبوری کرو کہا جائے اماں کیا جائے نہ

یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ اس مضمون کو لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم بھی آپ کے اس اعتراض کو بجا مانتے ہیں اور اسی لیے یہ مضمون لکھنے سے کافی دیر تک گریز کرتے رہے۔ کسی مسلمہ حقیقت کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے لیکن بات ایسے چلی کہ ۱۹۶۷ء میں حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی کے تاریخ کے پروفیسر مارونی خان شیروانی مرحوم نے یہ دعویٰ کیا کہ بھاگ متی نام کی کوئی عورت ہوئی ہی نہیں اور حیدرآباد کا نام کبھی بھاگ متی نہیں تھا۔ اب اگر شیروانی جیسا قد آور اور فاضل تاریخ دان کوئی نکتہ اٹھائے تو اس کا نوٹس لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ پیشتر اس کے کہ ہم شیروانی صاحب کی دلیلیں اور ان کے جواب پیش کریں، مناسب ہے کہ ہم بھاگ متی کے بارے میں چند تاریخی شواہد اور تذکرے اجمالاً بیان کر دیں۔

کہانی یوں ہے کہ محمد قلی ابھی شہزادہ ہی تھا کہ وہ ایک لعل بہند و حمینہ بھاگمتی کے دام محبت میں گرفتار ہو گیا۔ یہ لڑکی موسیٰ ندی کے پار ایک گاؤں چچلم میں رہتی تھی۔ روایت ہے کہ ایک رات وہ اسے ملنے کے لیے نکلا تو موسیٰ میں طغیانی آئی ہوئی تھی اور اس کے اوپر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ان نامساعد حالات کے باوجود شہزاد نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر گھوڑے کو دریا میں ڈال دیا۔ میرے خیال میں اس عمل سے شہزادے نے اپنی جان سے زیادہ گھوڑے کی جان کو خطرے میں ڈالا، حالانکہ گھوڑے کو عشق کا کوئی مرض لاحق نہیں ہوا تھا۔ شہزادہ اس طرح اپنی محبوبہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے والد سلطان ابراہیم کو جب خبر ہوئی تو اس نے بجائے شہزادے کو سمجھانے بجھانے یا ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے ندی کے اوپر ایک پل بنوا دیا۔ آجکل ایسے باپ کہاں ملتے ہیں؟ یہ ۱۵۷۸ء کی بات ہے۔ پل آج بھی قائم ہے اور کیونکہ موسیٰ پر وہ سب سے پہلا پل ہے اس لیے اسے پل ناہل کہا جاتا ہے۔ دو سال بعد جب ابراہیم کی وفات ہو گئی اور محمد قلی نے تخت و تاج حاصل کر لیا تو اس نے بھاگمتی سے شادی کر لی اور پھر اسی کے نام پر اس نے اس کے گاؤں چچلم کو مرکزی نقطہ مان کر ایک نیا شہر بسایا اور اس کا نام بھاگ متی رکھا۔ بعد میں بھاگ متی کو حیدر محل کا خطاب دے دیے جانے پر شہر کا نام بھی حیدر آباد میں بدل دیا گیا۔ اس کہانی میں سے اگر پُل والی بات نکال دی جائے تو باقی عنصر مستند طور پر تاریخی ہیں، البتہ شہر کے نام کی تبدیلی کے بارے میں بھی وثوق سے کہہ کہنا مشکل ہے۔

مورخ اس بات کو ماننے ہیں کہ ابراہیم کے عہد میں ہی گوکنڈہ قلعہ کی آبادی بہت بڑھ گئی تھی اس

سے قلعہ کا ماحول آلودہ ہو گیا تھا۔ غلامت سے آب و ہوا پر بھی مضر اثرات پڑ رہے تھے۔ یہ تجویز تھی کہ قلعہ کے باہر ایک نیا شہر بسایا جائے۔ ابراہیم نے اس معاملے میں کچھ پیش رفت بھی کی تھی جس کے نتیجہ کے طور پر ایک موضع بھی وجود میں آیا جسے آجکل ابراہیم پٹنم کہتے ہیں، لیکن یہ مقام مناسب ثابت نہیں ہوا۔ نئے شہر کو بنانے کے سلسلے میں ہندو دیریا کے اوپر پل بنایا گیا تھا تاکہ دریا پار آدہ و رفت کا سلسلہ شروع ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ محمد علی کا ایک طوفانی رات کو دریا پار کرنے کی کوشش کا پل کی تعمیر سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

سنہ ۱۵۸۰ عیسوی میں محمد علی تخت نشین ہوا۔ کیونکہ وہ ولی عہد نہیں تھا، اس لیے تخت کے حصول کیلئے اسے لازمہ کچھ ساز باز کرنی پڑی ہوگی۔ اس لیے اس کے شروع کے چند سال اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے میں لگ گئے۔ بیجاپور کے سلطان اور پینوکونڈہ (PENUKONDA) کے راجہ کے خلاف مہموں اور علی حوالہ جیسے باغیوں کی سرکشی میں وقت لگا۔ ان سے نہایت لینے کے بعد اس نے نئے شہر کے پراجیکٹ کی طرف توجہ دی۔ اس کام کے لیے اس نے اپنے نئے پیشوا امیر مومن کو جو ایک ہر گیر شخصیت کا مالک تھا ذمہ داری سونپی۔ ایران سے ماہران تعمیر اور مہاراجے گئے اور ایران کے نئے شہر اصفہان کی طرز کا ایک نیا شہر بنانے کا کام شروع کیا گیا۔

سنہ ۱۵۹۱ء میں شہر کی پہلی اور مرکزی عمارت چارمینار تیار ہو گئی۔ حیدر آباد کی تالیس سالہ ہی مانا جاتا ہے۔ شہر کو بھاگ نگر کا نام دیا گیا۔ ۱۵۹۶ء میں اسے مادہ تاریخ کی رو سے فارسی میں "فرخندہ بنیاد" کا لقب دیا گیا۔ اس کے معنی خوش قسمت یعنی بھاگ نگر ہی ہوتے ہیں۔

نہ صرف قطب شاہی دور کے بلکہ بعد کے تاریخ دانوں، وقایع نگاروں اور سیاحوں نے بھاگ نگر اور اس کی نسبت سے بھاگ نگر کا ذکر کیا ہے۔ ان میں چند کے نام اور بیانات ذیل میں دیے جاتے ہیں :-

فرشتہ (۶۱۶۲۳-۶۱۵۷۰) نے ۲۰-۱۶۱۹ء میں لکھی گئی اپنی تعریف جیسے عموماً "تاریخ فرشتہ" کہا جاتا ہے۔ لکھا ہے کہ :

"سلطان بھاگ نگر نامی ایک بازاری عورت کے بہت زیور لاشہ تھا۔ اس نے حکم دے کر کھا تھا کہ وہ جب بھی دربار میں آئے تو اسے کسی بڑے سے بڑے امیر سے کم تہ نہ دیا جائے۔ محمد علی نے قلعہ سے چار کوس دور ایک شہر قائم کیا۔ پہلے اس نے اس کا نام بھاگ نگر رکھا، لیکن بعد میں اسے اس پر چھتاوا ہوا اور اس نے شہر کا نام بدل کر حیدر آباد رکھ دیا لیکن عوام اسے بھاگ نگر ہی کہتے ہیں۔"

لے دیکھیے The Rise of Mohammedan Power in India جو BRIGGS کا فرشتہ کی تاریخ کا ترجمہ ہے۔

فیضی ۹۳-۱۵۹۰ء کے دوران احمد نگر میں شہنشاہ اکبر کا ریڈیٹ تھا اس نے اپنے ایک خطیر مراسلے میں اکبر کو لکھا کہ :

”بھاگتھی قطب الملک کی برائی معشوقہ ہے۔ (مغل قطب شاہی حکمرانوں کو ہمیشہ قطب الملک کے لقب سے پکارتے تھے، کیونکہ سلطان مغل کا خطاب بھی تھا)۔ سلطان نے ایک نیا شہر بسایا اور اس قلعہ کی نسبت سے اس کا نام بھاگ نگر رکھا۔“

فیضی کے ہی ایک اور ہم عصر وقائع نگار نظام الدین بخشی نے ”طبقات اکبر شاہی“ میں جو ۱۵۹۴ء کے آس پاس لکھی گئی تھی اس بات کی توثیق کی ہے۔ مغل مورخ خانی خان اور نپاوندی نے بھی اپنی تصنیفوں میں اس بات کا تذکرہ کیا ہے۔

تیورنیر (Tavernier) ہیروں اور جواہرات کا ایک فرانسیسی تاجر تھا۔ وہ دو بار ۱۶۴۸ء اور ۱۶۵۴ء میں گولکنڈہ آیا تھا۔ اپنے سفر نامہ میں وہ گولکنڈہ کے بارے میں کہتا ہے کہ :

”اس سلطنت کی راجدھانی کا نام بھاگ نگر ہے۔ لیکن عموماً اسے گولکنڈہ ہی کہا جاتا ہے، جو کہ قلعہ کا نام ہے۔۔۔ یہ شہر بادشاہ وقت (عبداللہ) کے دادا (محمد مغل) نے اپنی ایک بیگم کے نام پر بسایا تھا جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا اور جس کا نام ”نگر“ تھا۔۔۔ پہلے یہ صرف تفریح گاہ تھا اور سلطان نے یہاں بہت سے باغات لگوائے تھے۔ دریا کے قرب کی وجہ سے یہ جگہ محل بننے اور شہر بنانے کے لیے بہت موزوں تھی۔ اس لیے سلطان نے شہر کی بنیاد رکھی اور خواہش کی کہ اس کی بیگم کے نام پر اسے بھاگ نگر یعنی ”نگر کا باغ“ پکارا جائے۔“

ایک اور فرانسیسی تینو (THEVENOT) ۱۶۶۵-۶۶ء میں یہاں آیا تھا۔ وہ لکھتا ہے :

”اس سلطنت کے دار الخلافہ کا نام باگ نگر (BAGNAGAR) ہے۔ ایرانی لوگ اسے ”ایدر آباد“ کہتے ہیں۔“

گولکنڈہ کے تعلقات (RELATIONS OF GOLCONDA) نامی کتاب ۱۶۷۱ء کے قریب لکھی گئی۔ ڈی

لی ”واقعات فیضی“ by 'History of India As Written by her own Historian' by Elliot & Dowson, Vol. VI, page 147 کے ”طبقات اکبر شاہی“ میں ۱۶۴۳ء تک تیسری

Voyages. ۱۶۴۳ء تک تیورنیر Thevenot - Vol. III - ص ۱۳۱، ۱۳۲

ایسٹ انڈیا کمپنی کے مہاجر سکورر (SCHOERER) اور سورسٹ کی انگریزی فیکٹری کے صدر میٹھ ولڈ (METHWOLD) کی وہ رپورٹیں جو انھوں نے اپنے ملکوں میں افسران بالا کو بھیجی تھیں اس میں درج ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ:

” ہر سال اپریل کے مہینے میں ساری سلطنت کی طوائفوں کو بھاگ نگر جانا پڑتا ہے، جہاں وہ مسلمانوں کے پہلے بادشاہ کی تعظیم میں ناچتی ہیں۔۔۔“

اس تذکرے کے فٹ نوٹ میں اس کتاب کے مولف مورلینڈ (MORELAND) نے یہ وضاحت کی ہے:

” بھاگ نگر یعنی حیدرآباد کو لکھنؤ کا نیا دارالخلافہ“ لے

۱۶۶۷ء میں برنیئر (BERNIER) نے مغلیہ سلطنت کے سفر نامے میں بھاگ نگر کا دوبار ذکر کیا ہے۔ ۱۶۷۲ء میں ایبے کارے (Abbe Carre) کہتا ہے:

” یہ وسیع شہر۔۔۔ بھاگ نگر سوداگروں اور اجنبیوں سے بھرا پڑا ہے۔“ لے

۱۸۶۱ء میں ہنری جارج برگس (H.G. BRIGGS) نے اپنی دو جلدی کتاب ”دی نظام“ (THE NIZAM) میں لکھا ہے کہ:

” حیدرآباد کا ابتدائی نام ”بھاگ نگر“ تھا۔ اُسے محمد علی نے اپنی خاص محبوبہ بھاگ متی کے نام پر

بسیا تھا۔ ابھی بھی لوگ باگ اُسے اسی نام سے پکارتے ہیں خاص طور پر ہندو لوگ۔“ لے

۱۸۷۱ء میں کرنل فلپ میڈورٹیلر (COL. PHILIP MEADOWS TAYLOR) جس نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ حیدرآباد ریاست میں ہی گذرا، اپنی ۸۰۰ صفحات کی کتاب ”ہسٹری آف انڈیا“ میں لکھا ہے کہ حیدرآباد کا اصلی نام بھاگ نگر تھا جو سلطان کی محبوبہ خاص بھاگ متی کے نام پر رکھا گیا تھا۔ لے

۱۸۸۳ء میں سید سین بلگرامی اور سی۔ ویلموٹ (C. WILMOT) نے اپنی کتاب میں لکھا کہ نیا شہر

بادشاہ کی ایک ہندو محشوقہ کے نام پر بھاگ نگر کہلایا۔ ان کا مزید کہنا ہے کہ:

1 - W.M. Moreland: 'Relations of Golconda in the Early 17th Century

2 - Francis Bernier: Travels in the Mughal Empire Two Volumes, pages 65, 67. 3. Travels of the Abbe Carre in India & the Near East

1672-74. Tr. from mss. by Lady Fawcett Ed. by Sir Charles Fawcett

- 1947. 4. H.G. Briggs: The Nizam Vol. II page 242. 5 - Col. Philip

Meadows Taylor: The Story of My Life, Page 25.

موجود میں اس کا نام بدل کر حیدر آباد رکھ دیا گیا۔ لیکن پھر بھی یہاں کے رہنے والے اور
خصوصاً ہندو لوگ اسے بھاگ نگر ہی کہتے ہیں۔^۱

۱۹۸۸ء میں علی گڑھ کے ڈاکٹر نذیر احمد نے خدا بخش اور نیشنل پبلک لائبریری کے جرنل میں بھاگ متی اور بھاگ نگر
کے بارے میں بہت سے شواہد گنجائش کیے ہیں۔^۲

حوالے اور بھی دیے جھا سکتے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ اتنا ہی کافی ہے۔

فاضل اور مرحوم پروفیسر شیروانی کا عقیدہ ہے کہ بھاگ متی اور بھاگ نگر کا قصبہ من گھڑت ہے جو نصف
جاہلی خانوادہ کے ابتدائی دور میں غالباً قطب شاہوں کو بدنام کرنے کیلئے تراشا گیا تھا۔ جوہی اس نے زور پکڑا غلام
خالہ نے ۱۸۱۰ء میں "ماہنامہ" میں اس کی تردید کی۔ موصوف کا قول ہے کہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں بھاگ متی
کا خرافاتی موضوع پھر سے ابھرا اور تب سے یہ روایت بن گئی جس کے حق میں کوئی ثبوت نہیں۔

پروفیسر شیروانی نے اپنے دعوے کی تائید میں مندرجہ ذیل دلائل پیش کئے ہیں :

(۱) " بھاگ متی اور اس کے نام پر بسائے گئے شہر کا ذکر پہلی بار فیضی نے کیا ہے۔ فیضی کبھی احمد نگر

سے آگے نہیں آیا اور جو کچھ اس نے لکھا ہے، وہ محض سنی سنانی باتوں پر منحصر ہے۔ فیضی دکن کے
سلطین کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا اور فقط ایک جگہ جو اس نے محمد قلی کے تعلق سے لکھا ہے، تحقیر
سے لبریز ہے۔ وہ سلطان کی دلی و دماغی صلاحیتوں کو نظر انداز کر کے صرف اس کے ایک "نامحشہ کہنے"

سے تعلقات کا ذکر کرتا ہے۔ بھاگ متی کا نام ان سترہ محبوباؤں میں نہیں آتا جن پر محمد قلی نے تصدیق لکھے تھے۔

(۲) " فرشتے تلنگ کی تاریخ کے بارے میں غلط بیانی کی ہے۔ مثلاً اس نے محمد قلی کی تخت نشینی کی

تاریخ صحیح نہیں لکھی۔ ۱۰-۹-۱۶ء میں وہ گولکنڈہ کی راجدھانی بھاگ نگر بتاتا ہے۔ حالانکہ ہمارے

پاس بہت سے ایسے سکے موجود ہیں جو حیدر آباد میں تسلیک کئے گئے۔

(۳) " نیم سرکاری تاریخ " تاریخ محمد قطب شاہ " ۱۶۱۴ء میں مکمل کی گئی۔ اس میں بھاگ متی یا

بھاگ نگر کا کوئی ذکر نہیں۔ اسی طرح نظام الدین احمد سعیدی کی ۱۶۴۴ء میں نوشتہ حدیقہ السلطنہ

میں سے دارالخلاۃ کا تفصیلی تذکرہ ہے، لیکن اسے ہر جگہ حیدر آباد ہی کہا گیا ہے۔ تقریباً نصف صدی

1 C.Wilmont & S.H.Bilgrami ; Historical & Descriptive Sketches of H.H.

The Nizam's Dominions. 2 — Journal of the Khuda Bakhsh Oriental

Public Library, Vol.47 1988.

بعد کی لکھی ہوئی بوسما کی تصنیف ”مصدقہ“ میں شہر کی تاسیس کی مختصر تاریخ ہے، لیکن وہاں بھی بھاگ متی یا بھاگ نگر کا کوئی ذکر نہیں۔

(۳) ”محمد قلی کی کلیات میں جہاں اُس کی سترہ مہربانوں کا ذکر ہے۔ وہاں بھاگ متی کا کوئی تذکرہ نہیں اس ذمہ کا بھی کوئی جواز نہیں کہ اس کی شادی محمد قلی سے ہوئی اور اُسے حیدر محل کا خطاب دیا گیا۔ قطب شاہی مقبروں میں بھی بھاگ متی کی کوئی قبر نہیں ملتی۔ کلیات میں حیدر آباد کا نام تین بار آیا ہے، لیکن بھاگ نگر کا ایک بار بھی نہیں۔“

فاضل پروفیسر کے رائے میں محمد قلی جیسے راسخ العقیدہ مسلمان سلطان کے لیے عین واجب تھا کہ وہ شہر کا نام حیدر کرار کے نام پر ہی رکھے۔

۱۔ آخر میں انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ہم عمر تیلو گوادب میں کہیں بھی بھاگ متی یا بھاگ نگر کا ذکر نہیں ملتا۔

ان دلائل کے بعد شیروانی صاحب خود اس مسئلہ کا حل تجویز کرتے ہیں۔ ان کی دانست میں اس مسئلہ کے حل کی کئی فرانسیسی سیاح تیورنیر (Tavernier) (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) کے پاس مل سکتی ہے۔ تیورنیر نے شہر کا نام ”بھاگ نگر“ نہیں بلکہ ”باگ نگر“ لکھا ہے۔ رومن لپی میں لفظ BHAG میں سے H کا حرف حذف کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تیورنیر کا یہ بھی بیان ہے کہ یہاں باغات کی بہتات تھی۔ اس نے شہر کا نام ”باگ نگر“ یعنی ”نگر کا باغ“ رکھا ہے۔

— پروفیسر صاحب نے اس ضمن میں رفیع الدین شیرازی کے بیان کا بھی حوالہ دیا ہے، جس نے تیورنیر کی آمد سے نصف صدی پہلے لکھا تھا کہ ”سارا شہر ایک باغ ہے۔“ قصہ کو تاہ کہ شیروانی صاحب کی رائے میں نہ کوئی بھاگ متی تھی نہ بھاگ نگر۔ شہر کا نام ”باغ نگر“ تھا جو بگڑ کر بھاگ نگر بن گیا۔

اب ذرا موصوف کی دلیلوں کی جانچ پڑتال کی جائے تو خاکسار کی دانست میں اچھے پہلے دیکھتے جس میں انھوں نے فرشتہ اور فیضی کے بیانات پر اعتراض کیا ہے قابل توجہ نہیں لگتے۔ اور اگر بالفرض ان دو حضرات

۱۔ پروفیسر شیروانی کا نام لیکن ایک جگہ دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس کتاب میں:۔

کے بیانات کو نظر انداز بھی کر دیا جسے موبھاگ مٹی کے وجود کے کس پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن بہر حال فیضی پر شیروانی کے ایک عرض پر میں کچھ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ شیروانی کا قول ہے کہ فیضی نے تقریباً چار سو میل کی دوری سے لکھا تھا۔ نتیجتاً اسے حیدرآباد کے بارے میں کیا معلوم ہو سکتا ہے۔ میری ادباً نگارش ہے کہ فاصلہ فاصلہ ہوتا ہے، چلے وہ مکان کا ہو یا زمان کا۔ اگر فیضی اور محمد قلی کے درمیان چار سو میل کا فاصلہ تھا تو شیروانی اور محمد قلی کے درمیان چار سو سال کا بعد ہے۔ مقام کا فاصلہ ہم عصری کو متاثر نہیں کرتا۔ وقت کا فاصلہ اس کو ذرا اثر کر دیتا ہے۔ فاضل پروفیسر کا یہ نکتہ مجھے بہت کمزور لگتا ہے۔

مزید شیروانی صاحب کا کہنا ہے کہ کسی نیم سرکاری تاریخ میں بھاگ مٹی کا ذکر نہیں ملتا۔ کوئی مضائقہ نہیں ہمارا سوال ہے کہ کیا ان تاریخوں میں کسی اور بیگم کا ذکر ملتا ہے۔ یہ بات سب تاریخ دانوں کو معلوم ہے کہ تحفہ و تاج حاصل کرنے کے لیے صرف مصلحت کی بنا پر محمد قلی نے اپنے بڑے بھائی محسن قلی کی منگیتر جو پیشوا سلطنت میرٹھاہیر کی بیٹی تھی اسے شادی کی تھی۔ جہاں تک مجھے علم ہے کسی بھی تاریخ میں اس بیوی کا نام نہیں ملتا۔ اگر ان تاریخوں میں بھاگ مٹی کے بجائے کسی اور عورت یا بیگم کا ذکر ہوتا تو ہم تسلیم کر سکتے تھے کہ بھاگ مٹی نژاد ہے، لیکن اگر نام کے بارے میں ایسی تاریخ خاموش ہے تو اس کا فائدہ بھاگ مٹی کے حواریوں کو ہی پہنچتا ہے۔ سرکاری اور نیم سرکاری تو کیا ہم عصر تاریخوں میں بھی شاہی معاشقوں اور حرم سرا کے تذکروں سے قطعاً اور زکراً احتراز کیا جاتا ہے۔ ۱۹۹۰ء میں سعودی عرب میں میرے ایک مضمون میں میرا یہ جملہ کہ ”حرم بادشاہت کی بالائی یافتہ ہے“ سنسز کر دیا گیا تھا۔ قرن وسطیٰ کے تاریخ دان اور واقعہ نوین سیلف سنسز شپ کے عادی تھے۔

بادی النظر یہ صحیح ہے کہ محمد قلی کے کلام میں بھاگ مٹی کا راست ذکر نہیں ملتا۔ لیکن جس قسم کا ذکر اس کی دوسری محبوبہ باوند کے بارے میں ملتا ہے، اس سے یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہ قلم اندازی دانستہ طور پر احترازی لگائی ہوگی۔ ویسے ڈاکٹر زور مرحوم نے ایک آدھ نظم کے بارے میں کہا ہے کہ وہ بھاگ مٹی کے بارے میں ہیں۔ یہ رواج تو آج بھی ہے کہ بیک میں بیوی یا محبوبہ خاص کا ذکر برائے پاسداری نہیں کیا جاتا۔

پروفیسر مسعود حسین خاں کی رائے ہے کہ ”پروفیسر شیروانی نے اپنی تحقیق کے سلسلے میں محمد قلی کی کلیات کو بغیر غور و فکر کی تکلیف نہیں کی۔ بین السطور وہاں بھاگ مٹی کبھی ایم بی ایم، والی تلنگن کبھی ہندی، چھوڑی، کبھی پاتراوررقاص، اور کبھی حیدر محل اور مشتری بن کر بار بار جھلک دکھاتی ہے۔ حیدر محل خداداد محل کی ایک منزل کا نام بھی ہے۔ اور محمد قلی کی محبوبہ کا بھی۔۔۔ محمد قلی کی محبوبہ حیدر محل کے وجود کا اس سے

بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے۔ "حیدر محل" ایک مکان کا نام بھی ہے اور اس کے کھین کا بھی۔

عظ حیدر محل میں دائم حیدر کا جلوہ گاؤں

پروفیسر مسعود حسین کا نزدیک ہند ہے کہ وہی کی شہری "قطب و شہری" کو استعاری روایت ہے لیکن غالباً
"یہ در حدیث ہو گیا" محمد علی اور بھاگ پٹی کی عشقہ داستان کی روایتی شکل ہے یہ محمد علی کا یہ معرہ:

عظ پیاسوں کھلی نہ بہ استہال بن سوں

اور یہ شعر ہے

نہ بنے بن تھے دکھیا ہوں بچ در پر سر کہ پایا ہوں دولت اسی تھے کھین کا
محمد علی کا کہ سنی ہے ہی بھاگ پٹی سے عشق کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ،

"پروفیسر شیروانی کا منطقی استدلال صحت سے بعید ہے۔"

شیروانی صاحب کا یہ نکتہ کہ تہذیبی شہر کا نام "باغ نگر" لکھا ہے۔ بہت کمزور بلکہ گستاخی صاف
بہت زالا اور مضحکہ خیز لگتا ہے۔ تہذیبی شہر کا واضح طور پر یہ کہا ہے کہ سلطان نے یہ خواہش کی تھی کہ شہر کو اس کی
بیگم کے نام پر باگ نگر بنا کر لے جائے۔ وضاحت کرتے ہوئے اُس نے ہوا یہ کہا ہے کہ باغ نگر یعنی "نگر" کا باغ صاف
ظاہر ہے کہ اس نے عورت کے نام کو "نگر" سمجھ لیا۔ یعنی "بھاگ" اور "نگر" میں کنفیوژن ہو گیا۔ لیکن اس سے
بھی شہر کے نام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں بھی شیروانی صاحب کا استدلال بہت کمزور ہو جاتا ہے۔ لفظ
BHAG میں سے حرف H چھوٹ گیا۔ باقی بچا BAG۔ اس سے لفظ "باگ" بنتا ہے "باغ" نہیں۔ اگر لفظ
"باغ" بنانا مقصود تھا تو BAGH لکھنا چاہئے تھا۔ یہ بھی نوٹ کر نا فروری ہے کہ اگر تہذیبی شہر "بھاگ" حرف
H نکال دیا تو "حیدر آباد" کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا ہے۔ اگر اس منطق کو ذرا اور کھینچا جائے تو یہ کہا جاسکتا
ہے کہ شہر کا نام باگ نگر تھا کیونکہ اس میں باگ بھی شیر تھے۔ غریبوں نے نوکیلا چند ستانوں نے بھی مختلف
ناموں کے ہجوم کو مختلف طریقوں سے لکھا ہے۔ مثلاً ایک ولندیزی مہاجر واقعہ یوسٹین (VAN RAVESTEYN)
نے ۱۶۱۴ء میں قطب شاہ کو COTEBEXIA لکھا ہے۔ میری رائے میں یہ نکتہ مسجید نہیں اور ایک علامت بحث
میں بے جا لگتا ہے۔

اگر پروفیسر شیروانی فیضی کو غیر معتبر سمجھتے ہیں تو اس کے بھائی ابو الفضل پر بھی شک کیا جاسکتا ہے اس نے

”اگر تندر میں ایک مرتبہ کا ذکر کرتے ہیں، بھاگ نگر کا ذکر کیا ہے۔

شیرانی صاحب کا ایک اعتراض یہ ہے کہ تیلوگو شاعر میں بھاگ نامی بھاگ نگر کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اکتوبر ۱۹۹۰ء میں سالار جنگ میوزیم حیدرآباد کے زیر اہتمام حیدرآباد کے ۱۰۰ سالہ جشن کے سلسلہ میں ایک سمینار منعقد کیا گیا تھا۔ اس میں کے ایس آر مورتی نے ایک مقالہ پڑھا تھا۔ اس میں انھوں نے وجہ نگر کی تاریخ کے ماہر مرحوم پروفیسر وینکٹ رامیا (VENKATARAMAYYA) کے حوالے سے کہا ہے کہ ریا وایکلو (Riyavayiklu) (۱۵۵۵ء) (۱۵۵۵ء) نامی کتاب سولہویں صدی کے آخری دہے میں لکھی گئی تھی۔ یہ وجہ نگر کے دو حکمرانوں ویرنر سہا اور کرشن دیو ریا کی روزمرہ کی زندگی پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں یہ لکھا ہے کہ بابا بای پنتولو نامی شخص وجہ نگر میں ”بھاگ نگر“ کا سفیر تھا۔ اس کتاب کے دو خطوط ایک کل اور دوسرا نامکمل تامل ناڈو کی پڈوکوتائی (PADDUKOTAI) لائبریری میں موجود ہیں۔ اسی زمانے کی ایک منظوم تصنیف ”نرسمہ اولاسمو“ (NERASIMHA VILASAMU) میں تین بار ”بھاگ نگر“ کا ذکر آتا ہے۔ محمد قلی نے جٹ پرول جاگیر کے جاگیردار کو ”کٹاری رام رایہ“ کا خطاب دیا۔ اس ضمن میں شاعر محمد قلی کو ”بھاگ نگر ادھی نادی“ (BHAGYANAGAR ADHI NADHI) اور بھاگ نگر یعنی بھاگ نگر کا حکمران کہتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور حوالہ محمد قلی کے تیلوگو شاعر اعظم سرنگوتیمیا (SARANGU TIMAYYA) کی نظم میں ملتا ہے۔ جب اُس نے اپنی پہلی نظم ”وجینتی ولاسمو“ (VIJYANTI VILASAMU) لکھی تو اس نے اپنے آپ کو گوکنڈہ کا محاسب حکم بتلایا۔ دوسری تعریف چھپے تک وہ وزیر بن چکا تھا۔ اس نظم میں وہ بھاگ نگر کا نام لیتا ہے۔

امید ہے کہ مندرجہ بالا حوالوں سے پروفیسر شیرانی کا اعتراض کہ تیلوگو ادب میں بھاگ نگر کا ذکر نہیں ملتا، ختم ہو جاتا ہے۔

اب میں آپ کو اپنا ”کلمہ“ دیکھاتا ہوں۔ ابھی حال ہی میں آندھرا پردیش کے دفتر اسناد (A.P. ARCHIVES) میں قطب شاہی دور کی ایک دستاویز ملی ہے۔ اس پر تصدیق کے لیے جوہر لگی ہے اس

۱. K.S.R.Murthy: 'Reference to Bhagyanagar in the Contemporary Telugu Literature of the Qutb Shahi Period', Page 7. Papers presented at the Seminar on the fourth Centenary Celebrations of Hyderabad, S.J.Muram, Oct.1990.

کے الفاظ ہیں: ”ظہیر الدین قاضی بھاگ نگر“ حرف ہی ایک دستاویز اس مباحثے کی ساری دلیلوں کا جواب
 خلیفی کا کام کرتی ہے۔ اگر یہ دستاویز آج سے ۲۰ سال پہلے دستیاب ہو جاتی تو ہو سکتا ہے کہ یہ بحث شروع
 ہی نہ ہوتی اور بھاگ نگر کے وجود پر شک کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔

لیکن ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا۔ کیونکہ یہ مناقشہ شروع ہوا تھا اس لیے کئی تحقیقوں نے اس موضوع پر
 تحقیق کی۔ اس پر کتنے محالے چھپے رکھنے سمجھنا ہوئے۔ کتنے لوگوں کی روزی کا انتظام ہوا۔ ذرا غور کیجئے، اگر یہ
 سلسلہ اٹھتا تو میں آج اس معزز عدالت میں بھاگ نگر کے وکیل کی حیثیت سے حاضر کیسے ہو پاتا۔

افسوس کی بات حرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ اس مباحثہ کا فیصلہ محترم برادری شریانی کی زندگی میں نہ
 ہو سکا۔ اگر وہ آج حیات ہوتے تو مجھے یقین ہے کہ وہ سب سے پہلے ٹھنسی ہوئے جو اپنے دعوے کو واپس لے لیتے۔
 شریانی صاحب ایک بلند پایہ تاریخ دان اور محقق تھے۔ اس کے علاوہ بلند کردار انسان اور شفیق دوست بھی
 تھے۔ مجھے ان سے شناسائی کی سعادت نصیب ہوئی۔ بعد از مرگ ہی سہی میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان
 کے اعتراض کی وجہ سے مجھے بھاگ نگر جیسی حسینہ کا تعاقب اور اس کے بارے میں سرخ رسائی کرنے کا بہانہ
 ملا۔ اور آخر اسے ڈھونڈ نکالنے میں کامیابی ہوئی۔ محمد قلی نے اُسے اپنا لیا تھا۔ خاکسار نے اسے جلا کر اُسے اُسی
 کی شہر کے بایوں کو واپس کیا ہے۔ اپنی محبوبہ کے لیے جان کی بازی لگانا کوئی خاص بات نہیں، لیکن کسی اور کی خوشی
 کے لیے اپنا من اور دھن لگا دینا بڑا کام ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ کام میرے نصیب میں آیا۔

فرانسیسی والٹر Voltaire نے ایک بار کہا تھا کہ اگر خدا نہ بھی ہوتا تو اسے ایجاد کرنا پڑتا۔ یہی
 قول بھاگ نگر پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ وہ اتنی خوبصورت اور دلپذیر روایت کی حامل ہے کہ بالفرض اگر وہ نہ بھی
 تو اسے ایجاد کرنا پڑتا۔ وہ یہاں کی گنگا جمنی تہذیب کی ضامن ہے۔ یہاں کے مشترکہ کلچر کی علامت ہے۔ شکریہ ہے کہ وہ
 کبھی تھی اور نہ حرف تھی بلکہ امر ہے۔ جیسا کہ خدا نے کہا تھا۔

شہر باقی ہے محبت کا نشان باقی ہے دلبری باقی ہے دلدار ہی جہاں باقی ہے

سرفروست نگار ان جہاں باقی ہے تو نہیں تیری چشم نگراں باقی ہے

اب میری مورخوں، محققوں، برادریوں، ریسرچ اسکالروں اور ہر قسم کے شوقینوں کو اس سے مؤیدانہ گزارش ہے کہ بھاگ نگر کو
 جیسا کہ تیرہ سوئے دیں اور مجھے جگہ ایسے معنون لکھنے میں مدد دے کہ کسی اچھے تخلیقی کام کو حرف واپس جاننے کی اجازت دیں۔

نہ۔ بیکٹرک مورخین اور دانشور جانیلا کی تقسیم کے بارے میں ہماری کتاب ”جنگ بھارت“ میں اس کی تاریخ اور چابی درج ہے۔ ۱۹۷۴ء
 ۱۹۷۷ء میں آج کل کی حکومت کے آرکائیو میں دستیاب ہوئے۔ یہ خط جو نہ خود میری لکھی ہوئی بلکہ میری طرف سے منسوب ہوئی ہوگی۔ ۱۹۷۹ء

[illegible]

منتخب التذکرہ — ایک جائزہ

بنگال اردو فارسی زبان و ادب کا ایک ایسا قدیم مرکز ہے، جس کا وقار و معیار قائم کرنے میں مسلمانوں کے علاوہ مقامی بنگالی ہندوؤں کا بھی حصہ ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد ۱۹ ویں صدی میں بنگالی ہندوؤں نے خاص طور پر اردو زبان و ادب کی طرف توجہ کی، جس کے نتیجے میں کئی ایسے بنگالی ہندو عالم اور ادیب و شاعر پیدا ہوئے، جنہوں نے اردو میں گراں قدر علمی و ادبی کام کیے۔ جن سے جے مترومان (۵ اکتوبر ۱۸۹۶ء - ۲۵ اگست ۱۸۶۹ء) کا شمار ان ہی بالکالوں میں کیا جاتا ہے۔

عبدالغفور نساج کے تذکرہ سخن شعرا کے مطابق ارمان جگتا استاد حافظ اکرام احمد ضمیم کے شاگرد تھے۔ انہوں نے روایتی عشقیہ شاعری کرنے کے علاوہ شعرائے اردو کے دو تذکرے بھی مرتب کیے، ان کا پہلا تذکرہ ”منتخب التذکرہ“ محرم ۱۲۶۶ھ / نومبر ۱۸۴۹ء میں تالیف ہوا، جب کہ دوسرے نسخہ ”دلکشا“ کی تالیف ۱۸۵۲ء اور ۱۸۵۴ء کے درمیان ہوئی۔ نسخہ دلکشا، نامکمل حالت میں چھپ کر ۱۸۸۰ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ اور کسی طرح ارمان کا مجموعہ شہر مشہور مستشرق گارساں دتاسی تک پہنچ گیا، جس کا ذکر اس نے تاریخ ادبیات ہندوی و ہندستانی میں کیا ہے۔ اس کے برخلاف ”منتخب التذکرہ“ گوثرہ بنگالی میں پڑا رہا۔ ارمان کے ہندستانی ہم عصروں میں صرف عبدالغفور نساج نے اپنے ”تذکرہ سخن شعرا“ میں گول مول لکھا ہے:

”... ان کا ایک تذکرہ شعرائے اردو نظر سے گذرا۔“

بعض تذکرہ نگاروں نے جہتی لکھا ہے لیکن ارمان کی زندگی میں نامکمل طبع ہونے والے تذکرہ ”نسخہ دلکشا“ میں ان کا نام بھی ہے، اس لیے راقم الحروف نے اسے ترجیح دی۔ مے تفصیل کے لیے راقم الحروف کی کتاب ”جئے جے مترومان“ حیات و خدمات دیکھیں جاسکتی ہے۔ مے مطابق ”تقوم بحری و عیسوی“ مرتبہ ابو الغفر محمد خالدی مطبوعہ اردو تصویف شنگ و کس، دہلی، ۱۹۷۷ء۔ مے راقم الحروف نے مے تفصیل قاری کرتے ہوئے اپنی کتاب ”جئے جے مترومان“ حیات و خدمات، مطبوعہ ۱۹۸۵ء میں ۱۹ سال تالیف ۱۲۶۶ھ کو قاریوں نے پہلا نسخہ ۱۸۵۰ء درج کیا تھا لیکن اس تقوم میں مے سے کا کوئی حساب نہ تھا اس لیے تقوم بحری و عیسوی کی بنیاد پر نومبر ۱۸۴۹ء ہی کو درست سمجھنا چاہیے۔ مے سخن شعرا، ص ۲۱۔

اس مختصر اور مبہم بیان سے واضح نہیں ہوتا کہ نساخ نے دونوں میں سے کون سا تذکرہ دیکھا تھا پھر نثر
ارمان سے اپنی راہ رسم کا بھی انہوں نے ذکر کیا ہے، اس لیے یہ بات خارج از امکان نہیں کہ انہوں نے "مختوب
التذکرہ" کا قلمی نسخہ دیکھا ہو۔

نساخ کی طرح دتاسی نے بھی ایک جگہ "نسخہ دلکش" کی تفصیل پیش کرتے ہوئے ایک مبہم جملہ لکھا ہے:

"بابویم جی متر کا نیا تذکرہ جس کا نام نسخہ دلکش ہے، معتقد شائع ہونے والا تھا۔" ۱

یہاں "نیا تذکرہ" قابل گرفت ہے۔ قیاس ہے کہ شاید دتاسی کو "مختوب التذکرہ" کا علم ہو گا، اسی لیے اس نے
دوسرے تذکرہ "نسخہ دلکش" کے لیے لفظ "نیا" استعمال کیا۔ اشتباہ کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ارمان کے
بیٹے راجندر لال متر سے دتاسی کی خط و کتابت تھی۔ ممکن ہے راجندر لال متر نے ضمنی طور پر کہیں پہلے تذکرے
یعنی "مختوب التذکرہ" کا ذکر کر دیا ہو۔ پھر بھی دتاسی کی ترجمہ شدہ تحریروں میں اس کی باضابطہ نشاندہی
نہیں ہوتی، اس لیے ایک لفظ کی بنیاد پر رد و ثبوت سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

"مختوب التذکرہ" کم و بیش سوا سو سال تک پردہ خفا میں رہا۔ اردو دنیا میں اسے پہلی بار شانی نون
سہا چاریہ نے متعارف کرایا تھا۔ لیکن یہ تعارف اتنا سرسری تھا کہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری طرح طرح کی غلط فہمیاں
اور غلطاطے میں مبتلا ہوئے۔ مثلاً

۱۔ "... مختوب التذکرہ میں ارمان کے سال وفات ۱۸۶۹ء تک کے شعرا کا ذکر آیا ہے۔" ۲

۲۔ "... مختوب التذکرہ نسخہ دلکش ہی کے انتخاب کا مبیعہ ہے۔" ۳

ڈاکٹر موصوف کی مجبوریوں کی بنا پر ان قیاسات سے صرف نظر کیا جاسکتا ہے لیکن کلکتہ کے ڈاکٹر

جاوید نہال کا یہ بیان بہت ہی عجیب ہے:

"ارمان کا ایک اور تذکرہ بالکل معمولی نوعیت کا ہے جس کا خطی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی

کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کا نام ... ہے۔" ۴

مذکورہ قلمی نسخہ بھی کلکتہ میں ہے، لیکن موصوف نے اس کا نام درج کر کے نہ کوئی کیفیت۔ جو دنیا کے تحقیق
میں کفر سے کم نہیں۔

۱۔ مقالات گارماں دتاسی (جلد اول) ص ۳۰، مطبوعہ انجمن ترقی اردو، چنڈ، دہلی ۱۹۴۳ء۔ جگالی ہندوؤں کی اردو
خدمات سے اردو شرا کے تذکرہ اور تذکرہ نگاری ص ۴۰۲ء۔ ایضاً ۵۰ جگالی کا اردو ادب ص ۲۶۶ء مطبوعہ ۱۹۸۴ء۔

”منتخب التذکرہ“ کے متعلق مختلف دور کے ادیبوں کے مذکورہ تراجمات سے قطع نظر جب قلمی نسخے کا جائزہ لیا جاتا ہے تو سب سے پہلے یہ سلسلہ سامنے آتا ہے کہ ایک سو باسٹھ صفحات کے اس نسخے پر کہیں بھی مولف کا نام درج نہیں ہے۔ شاعری دکن بٹھا چار یہ سے پہلے کسی ادیب نے اس کا باضابطہ ذکر بھی نہیں کیا ہے۔ یہاں تک کہ خود ارمان نے اپنے دوسرے تذکرے ”نسخہ دلگشا“ میں اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ ایسی صورت میں مولف کے سلسلے میں فیصلہ کرنے کے لیے صرف دو شہادتیں رہ جاتی ہیں، پہلی یہ کہ شاعری رنجن کو قلمی نسخہ ارمان کے پڑ پڑتے کے یہاں دستیاب ہوا تھا اور ان کے پڑ پڑتے ہی نے اسے تحفظ کے نقطہ نظر سے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے حوالے کیا۔ دوسری شہادت یہ ہے کہ اس میں دیباچے کے خاتمہ پر لکھا ہے :

” ۱۲۶۶ ہجری تاریخ ماہ محرم ۱۲۵۸ھ بمقام سنوڑا شہر کلکتہ میں ترتیب پائی۔“

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنوڑا (کلکتہ) کے کسی شخص نے اسے ترتیب دیا ہے۔ اگر اس سلسلے میں بنگال کے ادبی منظر نامے پر نظر ڈالی جائے تو ۱۹ ویں صدی میں شیور (کلکتہ) کے واحد ادیب و شاعر ارمان ہی ملتے ہیں اور ان کا تذکرہ ”نسخہ دلگشا“ بھی موجود ہے، اس لیے انہیں ”منتخب التذکرہ“ کا مولف تسلیم کرنا غلط نہیں۔

نسخے میں ایک الجھاؤ یہ بھی ہے کہ تذکرہ جس صفحے سے شروع ہوتا ہے، اس کے اوپری سرے پر مسودہ دریم لکھا ہوا ہے۔ جس سے گمان ہوتا ہے کہ اس کی ایک ان نقل ہو گئی جس میں یقیناً مولف نے اپنا نام بھی درج کیا ہوگا لیکن کافی چھان بین کے باوجود کسی نقل کا علم نہ ہو سکا۔ ایسی صورت میں دو ممکنہ نتائج سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہو سکتا ہے نقل زمانہ برد ہو گئی ہو۔ دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ ارمان نے اپنے دوسرے تذکرے ”نسخہ دلگشا“ جو پہلے سے نسبتاً بہتر ہے، کو ”مسودہ اول“ قرار دیا ہو۔

بہر حال ارمان نے دیباچے میں ماخذوں کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے :

”... تذکرہ مصحفی اور تذکرہ فتح علی اور تذکرہ میر حسن اور دیوان جہاں اور دیگر دیوانیات

جو کہ دستیاب ہوئیں ان سے شاعروں کا نام اور احوال اور غزلیات و دیباچیات و فردیات و محاسن

جسے دلچسپ پایا او سے چن لیا ...“

اس بیان میں مندرجہ اخذ تذکروں اور منتخب التذکرہ کا فنی تقابلی منظر ہے کہ ارمان نے ماخذ تذکروں کے تراجم اور اشعار دونوں سے بھرپور استفادہ کیا ہے، لیکن اس سلسلے میں کوئی مخصوص طریق کار یا اصول نہیں اپنایا ہے۔ وہ کبھی تراجم، کبھی کلام اور کبھی دونوں سے خوشہ چینی کرتے ہیں، مگر ان کی ایک خوبی ہے کہ وہ استفادہ

ادوقل کے فرق سے اچھی طرح واقف ہو کر وہ عموماً یہ لحاظ رکھتے ہیں کہ استفادہ نقل و سنی نہ ہی جائے، اور انہیں محض انتخاب کنندہ یا نقل نویس متعارف دیا جائے۔ اسی لیے انہوں نے ماخذ تذکروں کے تراجم یا اشعار میں اکثر ترمیم و اضافہ کیا ہے اور اپنے تذکرے کو تیار رنگ روپ دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

ماخذ تذکروں میں ”دیوان جہاں“ سے اخذ و استفادہ کچھ زیادہ ہی ہے۔ خاص طور پر نمونہ کلام میں کئی کئی غزلیں اور اشعار اسی سے ماخوذ ہیں۔ بعض اوقات اشعار کی ترتیب یا تعداد میں قدرے رد و بدل بھی ہے۔ ”دیوان جہاں“ میں اکثر شعرا کے نمونہ کلام میں کئی کئی غزلیں ہیں، جس کی وجہ سے بعض محققوں نے اسے ”مجموعہ“ یا ”گلدرست“ قرار دیا ہے۔ مگر اربان نے اپنی تراجم کی تعلید نہیں کی۔ دیوان جہاں کے علاوہ دیگر ماخذ تذکروں سے بھی نمونہ کلام بعینہ نقل کیا ہے جس سے ان کی ترتیب کاری کی صلاحیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور فن تذکرہ نگاری کی بہتر آگہی کا بھی۔

اربان نے شعرا کے اندراج میں بعض مقامی شاعروں کو بھی شریک کیا ہے جس سے مرشد آباد اور گلگت سے تعلق رکھنے والے چند نسبتاً کم معروف شعرا بھی اس میں محفوظ ہو گئے ہیں۔ بنگال کے مقامی شعرا کی طرف کسی تذکرہ نگار کی یہ پہلی کوشش ہے۔

”منتخب تذکرہ“ کے سلسلے میں یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ بنگال کے کسی فرد کا یہ پہلا تذکرہ شعرا ہے۔ یقیناً حقائق اور حالات کی بعض خامیاں اس میں موجود ہیں، لیکن یہ اس نقش اول ہے جس کی بنیاد پر نسخہ دلکش اور نسخہ کا ”سخن شعرا“ لکھا گیا۔ اس لیے ”منتخب تذکرہ“ کی اہمیت و وقعت بے اہکار ممکن نہیں۔

پروفیسر طلحہ رضوی برق

صدر شعبہ اردو و فارسی

یچ۔ ڈی۔ جین کالج، اے

ثنوی قصہ سودا ماں

میرے بچی کتب خانہ میں ایک منظر ثنوی قصہ سودا ماں کا بھی دستیاب ہے۔ برسات میں پانی ٹپکنے کی وجہ سے کچھ گٹا ہیں جیگ گئی تھیں ایضاً میں یہ نسخہ بھی نم ہو گیا اور اس کے اوراق گوندلی سیاہ روشنائی کی وجہ سے ایک دوسکڑ میں بری طرح چپک گئے تھے۔ مشکل بیشتر صفحات کو الگ کیا جاسکا مگر چند اوراق ہنوز سسے رہ گئے ہیں۔

کاغذ کہنہ و وسیدہ اور کرم خوردہ ہے۔ کل ۲۲ صفحات پر تقریباً ۷۸۵ اشعار میں یہ ثنوی گویا مکمل ہے۔ موجودہ صفحہ اول پر ۸ اشعار ہیں۔ صفحہ ۲ پر ۱۳ اور صفحہ ۳ پر صرف ۵ اشعار پھر صفحہ ۴ تا صفحہ ۲۴ اشعار کی تعداد فی صفحہ ۱۸ ہے۔ سات سات اشعار دو کالمی ترجمے لکھے گئے ہیں اور درمیانی جگہ میں چار اشعار کھڑے لکھے گئے ہیں۔ رسم خط اردو اور تحریر شکستہ ہے۔

ثنوی کے آخری اشعار سے آنا پتہ چلتا ہے کہ یہ ثنوی آج سے ایک سو چوراسی سال قبل ۱۲۲۴ء میں لکھی گئی تھی۔ کہاں لکھی گئی اور کس نے لکھی معلوم نہ ہو سکا۔ تاریخ و سن تصنیف ان اشعار سے ظاہر ہیں:

بتاریخ شش، ماں بھادوں ہنوز مہ شوال و پنجشنبہ کا روز
و سن یک ہزار و دو صد بست و چار گوند چلے یہ کیا ہم نے موتی کا ہار
اس کے معاً بعد کے شعر میں مصنف کا نام تاجو کرم خوردگی کے باعث پڑھانہ جاسکا۔ نامکمل شہر ہے:
زباں فارسی با سحر۔۔۔۔۔ کہا۔۔۔۔۔ نے یہ ثنوی
زہ الطاف عطا ط صاحب کلام غرض یافتہ ثنوی اختتام

سوداماں کے قصہ کو کہے ختم قلم نے دھرا اب خدا اپنے دم
یہ سوداماں جی، شری کرشن کے بچپن کے دوست تھے اور ان کی بال لیلیاؤں کے شریک۔
سوداماں غریب اور مفلس تھے، شری کرشن امیر و کبیر۔ بہار کے راجہ جواسنہ نے متواتر متھرا پر حملہ
بول کر شری کرشن کو متھرا چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ متھرا چھوڑ کر مہلاشٹر کے دواریکانامی شہر چلے
گئے اور وہیں راج پاٹ قائم کر لیا تھا۔ سوداماں اور کرشن دونوں سمسہ پن نامی شے کے چلے تھے۔
رکنی اور ستے بھاکرشن جی کی دو زبانیاں تھیں۔ سر و تم داس نے سترہویں صدی عیسوی میں بربان
برج "سوداماں چتر" نام کی مشہور کتاب لکھی جس میں سوداماں جی کے حالات، مراتب اور کردار پر
تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ میرے دوست پروفیسر راج رام بین فرماتے ہیں کہ سوداماں چتر میں یہ
بتایا گیا ہے کہ وہ گیان اور معرفت کے بہت اپنے مقام پر تھے۔ ایک بار سوداماں نے شری کرشن کی دھوکا
کی اور جو کچھ روکھا سوکھا سیر تھا پیش کیا۔ کرشن جی نے اس دعوت میں تین تھے نوش جاں فرمائے۔ ہر
لغزہ فرد ہوتے ہی ان پر ایک نئے لوک (عالم نو) کا انکشاف ہوا۔ اس طرح ان تین نعموں میں انھیں
تروک کا پرن گیان پراپ ہو گیا۔

پیش نظر ثنوی میں انھیں سوداماں جی کا قصہ نہایت دلچسپ انداز میں نظم کیا گیا ہے۔ اشعار کے
مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اشاعر موزوں طبع ضرور ہے مگر علمی حیثیت کوئی خاص نہیں۔ اظہار اور
الفاظ کے تلفظ کی غلطیاں کم سادی کی چٹلی کھاتی ہیں۔ پنجابی اور دکنی شعراء اردو کے یہاں تلفظ کے
سطحے میں حرکت و سکون الفاظ کا اختلاف بہت ملتا ہے۔ ممکن ہے اس ثنوی کا مصنف بھی علاقائی
اثر سے مخدور ہو۔ بہر حال سنی طور پر کچھ کہنا فی الحال مشکل ہے۔ ثنوی کا آغاز حسب ذیل اشعار
سے ہوتا ہے۔

سکھن سنج دانائے معنی بھار	کریں اپنی چوتھی میں یوں آشکار
کوئی یک برہمن تھے اک نہیں میں	سبھی نام ان کے سوداماں کہیں
سدا رام کا نام چت لاوئے	گوں آباد گو بنہد کا گھانے
نیکہ بات کا سوچ دل میں رکھیں	رہیں رات و دن پوجہ و پاٹ میں
رہی جھونپڑی ایک ٹوٹی مڑی	پورانی بہت دن کی حد بھر مڑی

سودااں اسی ٹوٹی ٹری میں جاڑاگری برسات اپنے دن گزارتے۔ قند و مول قند اور
ساگ چٹنی پر گندھارا کرتے۔ کبھی قلعے کی فوجت بھی آجاتی۔ ان کے ساتھ ہی ان کی بڑی تپستوی
استری بھی رہتی تھی، بہت حسین اور خندہ دو۔ زرو زبور اور دھن دولت سے بے نیاز ایک
پرانا بستر ان کا سامان راحت تھا۔ شاعر اس کا تعارف یوں کرتا ہے:

نہیں زرد و زبور صرف ہر کانام کہیں ہر بھجن اٹھ کے صبح اہ شام
سدا کنت کی اپنے داری رہیں نہ کچھ کام میں ان کے آس کرین
سجورگ سے ان کی زندگی میں بروگ ہوتا ہے۔ رادی کہتا ہے کہ استری نے بہ امرار
سودااں جی کو شری کرشن سے ملنے دواریکا بھیجا اور ناد راہ کے طود پر چٹائی کی موٹی اور نئے ہوس
پنے ساتھ دیے۔ سفر پر روانگی سے قبل سودااں اور ان کی استری میں جو گفتگو ہوئی ہے اسے نظم
مکملے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ اہم علامہ رموز معرفت اور جبر و قدر نیز تقدیر و تدبیر جیسے ادق
مسائل پر دراصل ایک منطقی بحث ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں، ہر چند کہ زبان معمولی اور سلی ہے
بلکہ سقم و شکست سے پر۔ روانی بیان سے تیزی طبع کا اندازہ ہوتا ہے اور بس۔
استری کہتی ہے:

سودااں کہتے ہیں: سناو مری بات کو کان دھر
پر شرم بنا سکھ بھی ملتا نہیں
کرد کچھ مہاراج مجھ پر نظر
بنا دھن کے دھرم ہوتا نہیں

نہیں مال مال استری کا سبب
کرد سکھ بھجن رام کا بیڑ کر
اسی عقل سے ہوئی سیتا ہرن
کہاں خاک چھانوں میں جا در بدر
کہے جب سودااں بعد اضطراب
دیا استری نے پھر اس کا جواب
جواب یوں ہے:

کہا سنجہ دن کی نہ تقصیر ہے
غرض سب جگ اپنی تقدیر ہے
سودااں کہتے ہیں:

جو قسمت میں میرے لکھا ہوتا دکھ
کہاں مل سکے دواریکا بیچ سکھ

ہنیں دھن دکھا مگر مے ہلک میں کہاں مل سکے مجھ کو پرہگ میں
استری کا جواب منطقی دلیل کے ساتھ ملاحظہ ہو:

بہی یہ سبجہ کر زن ہوشمند
بچن آپ کا مجھ کو آبا پسند
اگر ہنس ساگر میں جا کر گرے
کہو کیے وہ ہنس مجھ کے مے
اودے سوت کا جس گھڑی ہو پرکاش
کہو کیونکہ جائزہ ہودے ہر اس
جہاں جوت پرکاش ہو ایک بار
کہو کیے کر کے رہے اندھکار

الغرض شئی اسی طرح مادی نقطہ نظر اور روحانی نظریات کی بحث و تمحیص سے کسکے بڑھتی ہے اور
سوداماں جی بالآخر دوا ریکلے کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ شئی میں مہاراج، مہادیو، ہری اس
سورج ناگر، چکر دھر، کھڑک دھاری، پرہلاد، گوبند وغیرہ دیوالائی نام علاقہ طور پر رکے ہیں۔
بحث و گفتگو میں ہر جگہ مادی نظریے پر گمان اور عرفان کو غالب دکھایا گیا ہے۔ دنیا مایا ہے اور
مہایا، عرفان حقیقت ہی سب کچھ ہے۔ یہ فلسفیانہ اور صوفیانہ باتیں ہندو مذہب کے دیوالائی تصور
اور کبتولہ سے ماخوذ ہیں جن سے کوئی بحث یہاں مقصود نہیں۔

ملکوں کا سفر، حق کی تلاش، جی کا جو کھم میں ڈالنا اور مقصد برآری یہ سب فقے شئی کے
مئے ہیں۔ سوداماں دوا ریکلے کے بلے سفر میں کیا کچھ دیکھتے ہیں اس کا تفصیلی بیان شئی کی جان ہے۔
کرشن جی کے عمل کا ذکر یوں ہوا ہے:

جب خوش نما ایک موتی محل
کہ سورت اسے دیکھ ہووے بیکل
ہزاروں کھڑے دوا پر چو بدار
سپاہی پیادہ بہت بے شمار
برابر کھڑی ہاتھیوں کی قطار
کرے گھوڑا و جھڑا ... سوار
کسی کو وہاں رتھ اور پالکی
برابرے موٹیں دھرے شال کی
کھڑے صف بہ صف ہیں امیر و وزیر
لکے ہر طرف باغ و باغچہ و گل
دھنقان پاکیزہ میوہ بہشت
بڑی دھوم تھی بلبسوں کی تہل
پھلے پھولے در باغ میوہ سرشت

یہ بیان رواں دواں اور منظر آفرینی کی اچھی مثال ہے۔ باغ کے بیان میں تقریباً سارے پہلو

بیوں کا ذکر ہے کہ وہاں ان کے درخت موجود تھے اور بار بار مثلاً انجور، ناشپاتی، بھیڑیہ
پستہ، انجیر، بیوں، انار، کیلا، امرود وغیرہ یہاں تک کہ آم اور کھنکھی۔

پھلتے تھے وہاں تاریکی کیونلا
عن اناس خساہراں پھیلا دکتا
ہر اک طرف سے پوست جامن تمام
بہت میوہ آؤلا و کھنکھی و آم
کہاں تک کروں میوہ سب کا بیاں
وہ گوچے کے گوچے تھے جھاڑ کے
مٹائی سے میوہ کی تر ہے زباں
اسی طرح جہاں گلوں کا ذکر آیا ہے ہر موسم کے پھولوں کی ایک ساتھ پھولاری کھلا دی ہے۔

قسم تا قسم کے درختان گل
وہ انواع واقسام کے شدر و گل
جمیلی کھلی اور وہ روپ سنبری
درختان زرگس کی آنکھیں بھری
کنارے پیٹھہ کھلے ہیں گلاب
کھڑی سیڑی اس کی حاضر جواب
سورج مکھ کھلا دیکھ جھلے کنول
سنگر پار کنڈل میں ہو کر نخل
گل آس مہدی بھی دیکھ رنگ
دسیو کا نیلا دو پہری کا رنگ
شکل دیکھ چپا کلی مور جانی
گروہ دیکھ سنبھل گمہ چچ کھائی
کہوں میں نہ کچھ حال شمشاد کا
کھڑا مارسیں سرو آزاد کا
پھولا ٹیسو دانوں میں بس رنگ رنگ
جئے خوش نا جیسے اوڈھل کارنگ
صنوبر کہیں دیکھ پھتاوتے
بٹا دھاری کچھڑ میں شرماوتے
وہ سرسبز گل رنگ بارغ و بہار
وہ باغچہ موزوں نہر کی پکار
وہ بلبلیں کی ایک بارگی کی پکار
وہ فوارہ کا چھوٹا ایک بار

اس تفصیلی بیان کے بعد طبع و مرغان جن کا ذکر ہے۔ مثلاً

وہ کوئل کی کورلی وہ پھر ناچ مود
وہ تندر کا چلنا پیسہ کا شدر
مہر اک طایروں کی عجب گفتگو
ہنیں دھنکھو مکھ سکوں موہو

پھر جے سہلے بار بار کانتہ پیش کیلے ہے اور جہاں ہر بات کا بیان۔ مراثی اور بڑاڑہ کے لیے بھی اشعار
لکھے ہیں :

معنا سبھی لوگ بازار - میں
پھر میں زرد زور و پوشاک میں
بڑی دھوم کی چوک ٹانگ لگی
وہ میرا جواہر سے تھی جگ بجی
میں نظارے کے بعد سوداآں کے اسامات کی تر جانی کی گئی ہے:

جو دیکھی سوداآں نے یہ رنگ اس
غرض اڑ گئے چپے ان کے حماس
یہاں پر شوی کے چند صفات سے رہ گئے ہیں اور اشار پڑے نہ جاسکتے کی وجہ سے قصے کا ارتقا بدل گیا
رہ جاتا ہے۔ بعد کے اشعار سے سوداآں کی حیرت و استعجاب کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاید سوداآں کی اس سز
سے مراد ہے:

نہ وہ جگہ دیکھی نہ وہ جمو پڑی
نہ وہ بعد دیا ہے نہ وہ استری
کہا دل میں یہ کون مارگ آگیا
کہ آئے بھولا کر کے پھر دواریکا
سوداآں تھے اس فکر میں بے خبر
پڑی رام جی کی اچانک نظر
اب یہاں روایتی انداز میں شاعر نے ساقی کو مخاطب کر کے شوی کو نیا موڑ دیا ہے:
پلا ساقیا مجھ کو شربت دھال
کہ ملے کوہ میں آگے دو ٹونہال
سوداآں ایک دوسرے عالم میں پہنچتے ہیں یا پہنچائے جاتے ہیں۔ طبع محل کا منظر ہے، رانی ہے اور
اس کی سہیلیاں:

سبھی ناز میں، خوب رو، خوش ادا
جسے دیکھ ہو چاند سودا سودا
سوداآں وہاں راجا کی طرح جلتے ہیں اور رانی ان کا ہاتھ پکڑ کے کہتی ہے:

کہو گیت ہے خیریت اپنی
بہت ہو رہی ہے بیل کامنی
یہ سن کر سوداآں نئے اضطراب
بہت چرخ کھا کر دیا یہ جواب
کہا سندری گیت کس کو کہو
وہ رانی مئی کامنی کس کی ہو
کہا ہنس کے رانی نے اسے سام ناتھ
وہی گیت ہے ہم گئے جس کے ہاتھ
اب رانی سوداآں کے ساتھ جانا چاہتی ہے۔ سوداآں چرخ و تاب کھا کر کہتے ہیں:

سنو مجھے اب تم خدا میری بات
میں کھویا بھلا حرم میں اپنی فات
تجھے کیا کریں رکھ کے ہم اپنے ساتھ
مثل ہے کہ جوی دے جوار کو ہاتھ

دانی بھند ہو کر دکانداری کا پیشہ دلاتی ہے، تنگ اگر سودا ماں کہتے ہیں :

بھٹکی سے ابو نہاں سیل میں بھولا قی ہو دانی جی کس کیل میں
بھولا کر کے کس کا یہ پکڑے ہو ہاتھ کسے بھول کر کے یوں کہتی ہو ہاتھ

یہاں پر دانی بھید کو کہتی ہے :

تہیں بھی ذرا کچھ اگر دھیان ہے تہیں گپت اپنے کا پہچان ہے
اور اچانک سودا ماں کی نظروں سے جہاںات دور ہو جاتے ہیں، حقیقت نظر آ جاتی ہے،
یہ سن کر سودا ماں خوشی سے بھٹے مئے دسے دانی کے جلدی پٹ
گویا انتریا کی کوکیاں پر پات، ہوا اور عرفان ذات کی منزل نظر آئی۔

آخر شنوی میں ویدانت کا فلسفہ ہے ہم وحدت الوجود سے قریب جلتے ہیں اس طرح

بیان چلے ہے :

تہیں برج ناگر تہیں برج لال	تہیں برج دوہا تہیں برج پال
تہیں گوال پوجن تہیں سند لال	تہیں ہنس دھر اور گر دھر گو پال
تیرو نام ہے شام سند کہیں	تیرو نام مرلی منوہر کہیں
کہاتے ہو تہیں مادھو کرشن	تہیں چکر دھر اور تہیں ہرکشن
تمہارے اوپر بھار سنسار کا	تہیں جرم ستیا گنہ کار کا
تہیں دین بندھو تہیں دین پال	تہیں سلچے بھگوان تہیں کت پال
کے سانچ جگت بیج تیرے دھاف	کیا ہر کوئی تم نے تقصیر معاف
تہیں ہو خطا بخش صاحب غنہ	کرو معاف تم اب ہمارا قصور
غرض کہ کے ہر طرح منت سماج	سودا ماں لکے کہنے سب کام کاج

ظاہر ہے یہ قصہ ہندی کتابوں سے ماخوذ ہے۔ اس کی حقیقت اور شنوی میں بیان شدہ قصے کے ربط سے بحث نہیں۔

جہاں تک زبان و بیان کا سوال ہے، مصنف فارسی اور ہندی یعنی اس وقت کی کھڑی بولی سے آشنا معلوم ہوتا ہے مگر جا بجا ٹکڑی الفاظ پنجابی تلفظ کے حال ہیں مثلاً نہر کو تھر نہرٹ

ت، تذرو کو تذرو وغیرہ۔ قاعدے کے اعتبار سے یہی غلط اضافت کہیں عدم اضافت کہیں غلطے نامزدوں ہیں۔ تذکرہ دانیث کی غلطی بھی ہے۔ اس کے باوجود بعض شعرا اور مصرعے بالکل فارسی ہیں مثلاً ہے

زن زیرک و بیک روشن قیاس سخن بخ و دانا و مردم شناس
مقرر یہ کہ ثنوی سودا آں کوئی بہت معیاری فن پارہ نہیں ہے۔ چونکہ ایک سو چار اسی سال کی لکھی گئی اس ثنوی کا کوئی تذکرہ کسی کتاب میں نظر سے نہیں گزرا لہذا تعارفی اہمیت تو مزور رکھتی ہے۔ مخطوٹ میں کوئی ترقیم نہ ہونے کے سبب یہ بھی کہنا مشکل ہے کہ یہ مسودہ کس کی تحریر میں ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ نسخہ اصلی نہیں نقل شدہ ہے۔
بہر حال ثنوی نگار کے پیش نظر اردو کی دوسری ثنویاں بھی رہی ہوں گی جن کا اثر نمایاں ہے۔

پروفیسر محسن احسان

ایسکی ماہیت پروفیسر اسلامیہ کالج پشاور (پاکستان)

اسلامیہ کالج پشاور کا کتب خانہ

۱۹۰۹ء میں جب سر صاحبزادہ عبدالقیوم اندر سر جان روس کیپل کلکتہ جاتے ہوئے علی گڑھ میں آئے تو وہاں کے پٹھان طالب علموں نے ایک سو روپیہ کا چندہ اس استاد کے ساتھ پیش کیا کہ اس رقم کے ساتھ مزید رقم جمع کر کے علی گڑھ کالج میں صوبہ سرحد کے پٹھان طلباء کے لیے ایک ہال تعمیر کرا دیں یا پھر صوبہ سرحد میں ایک کالج بنادیں صاحبزادہ صاحب بہت خوش ہوئے اور طلباء کو بتایا کہ صوبہ سرحد میں ایک کالج کے قیام کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اور یہ سو روپیہ کی رقم اس چندے میں شامل کر لی جائے گی۔ جنوری ۱۹۱۰ء میں علی گڑھ کالج کے منتظم علوم دینیات مولانا محمد عبداللہ انصاری خاص دعوت پر پشاور آئے۔ اور دودن کے صلاح مشورے کے بعد اسلامیہ کالج کے لیے مناسب جگہ پر زمین حاصل کرنے کا فیصلہ ہوا۔ خیر حضرات نے دل کھول کر چندہ دیا۔ مئی ۱۹۱۱ء کے آخر تک آٹھ لاکھ بارہ ہزار روپے سے زیادہ رقم جمع ہو چکی تھی۔ ۱۲ مارچ ۱۹۱۲ء کو اسلامیہ کالج کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور ایک شاندار عمارت چند سالوں کی محنت کے بعد زمین سرحد پر ابھری جو اپنی طرز تعمیر، دلکشی اور خوبصورتی کی وجہ سے نہ صرف پرکشش ہے بلکہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی یاد تازہ کرتی ہے اس طرح صوبہ سرحد کو صاحبزادہ قیوم کی صورت میں ایک سرسبز امداد خان میسر آیا۔ جس نے اہل سرحد کی زندگی میں ذہنی الفت تلاب پیدا کر کے علم و شعور کے دھوانے ان پروا کر دیئے۔

اسلامیہ کالج کا کتب خانہ کالج سے الگ ایک خوبصورت عمارت میں واقع ہے۔ اس عمارت کا منغل طرز تعمیر اپنی دلکشی و کشادگی اور ذخیرہ کتب کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اس میں اس وقت مختلف جدید و قدیم علوم و فنون کے بارے میں تقریباً ایک لاکھ سے زیادہ کتب موجود ہیں۔ جن سے طلباء کی نہایت استفادہ کرتی ہے۔ کتب خانے کے السنہ شرقیہ کے گوشے میں میدانِ علم میں انسانی ذہنی کاوشوں کے بعض ایسے نادر و نایاب موتی موجود ہیں جن کی چمک ابھی پورے برصغیر میں نہیں بھیلی۔ ان میں سے بعض بہت قدیم مخطوطات ہیں بعض فنِ خطاطی

ہت ہر ذفرہ مع ہو گیا۔ مولانا کتب حروف تشکک علم کو دکھاتے۔ وہ ہر س ناکس کی ان تک رسائی تو کیا دیدار بھی ممکن نہ ہوتا۔

بدقسمتی سے مولانا حافظ غلام جیلانی اولاد نرینہ سے محروم تھے۔ مولانا کے انتقال کے بعد ان کی اہلیہ اور ایک دختر اس عظیم الشان کتب خانے کی عیادت ٹھہری۔ اس وقت افغانستان کے حاکم جلالت آباد حبیب اللہ خاں نے اس بے بہا اور بیش قیمت علمی ذخیرے کو دارالسلطنت کابل میں اپنے پاس رکھنے کی خواہش کا اظہار کیا اور ان قوانین کو مبلغ ڈیڑھ لاکھ روپے کی پیشکش بھی کی کہ وہ پاک سیرت اور نیک دل خواتین اس ذخیرہ علم کو مال و دولت سے زیادہ بیش قیمت و افضل جانیں۔ اس لیے انھوں نے اس پیشکش کو ٹھکرادیا۔ تھوڑے عرصے بعد دارالعلوم اسلامیہ کے قیام کی تجویز کو علی ہلہ پہنایا گیا اور اسلامیہ کالجیٹ اسکول اور اسلامیہ کالج پشاور کی بنیاد رکھی گئی۔ تو اس ادارے کے بانی سر صاحبزادہ عبدالقیوم اور دیگر ارباب مل و عقد نے ان نیک دل خواتین کو دارالعلوم کے کتب خانے کے لیے اس بے بہا علمی خزینے کو وقف کرنے کی ترغیب دی تاکہ اس سے اہل علم و دانش فیض حاصل کریں اور یہ صدقہ جاریہ مولانا غلام جیلانی کی یادگار رہے۔ مولانا کی اہلیہ اور دختر نے اسے قبول کر لیا اور کتب خانہ کو رہا ہوا تمام خاص اسلامیہ کالج پشاور کے قائل کر دیا گیا۔ یہ تمام مخطوطات اپنی قدامت خوشحالی اور کیا بی کی وجہ سے بڑے اہم ہیں۔ بعض کتب ایسی اہم ہیں کہ شاید ہر صغیر کے دیگر کتب خانوں میں نہ کا دوسرا نسخہ موجود ہو۔ حافظ الملک حکیم محمد اعلیٰ خاں دہلوی نے ۵ دسمبر ۱۹۱۵ء کو اس کتب خانے کا معائنہ کیا تھا۔ ان کی رائے میں بعض مخطوطات درنا باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

چونکہ اس ذخیرہ کتب میں زیادہ تر مخطوطات عربی اور فارسی کے ہیں اور اردو نایاب ہے اس لیے میں صرف چند ایک فارسی نسخوں سے آپ کو متعارف کروانا ضروری سمجھتا ہوں۔ مگر ہر صغیر کے اس دور افتادہ اور سنگاٹ علاقے کے باشندوں کے ذوق علم اور شوق کتب بینی سے آپ واقف ہو سکیں۔

حدیقہ حکیم سنائی: حکیم سنائی غزنوی کے تین مخطوطات ہیں دو نظم اور ایک نثریں۔ اس کا کلام سات مثنویوں اور ایک دیوان پر مشتمل ہے جن میں سے مثنوی مدیقہ سب سے زیادہ مشہور ہے۔ بقول کاتب یہ ایک مستند نسخہ سے نقل ہے۔ اور تصحیح میں ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ آغا خان اشعار سے ہوتا ہے۔

باب اول بیان حمید است محض تخریب و مرف تو حمید است
باب ثانی ثناء و نعت رسول و آن بہر چار یار کشتہ قبول

باب ثانی و معطل کو ہم من
باب رابع ز مسلم و خواندن مسلم
زانکہ گنجہ در و مجال سخن
گفت غوام نفعے دانش و علم
یہ قلمی نسخہ ہے سائز میں اچھی حالت میں ہے اور خوش ہے۔

مجموعہ شرح گلستان : ۱۲۱۳ھ میں حافظ کمال الدین کا لکھا ہوا ہے باریک قلم میں ہے اور بے حد خوش خط ہے اس مجموعے میں حسب ذیل کتابیں شامل ہیں۔ شرح گلستان، قرنگ گلستان، سلطانہ شریعت گلستان، حل خطرات گلستان۔ یہ سب ایک جلد میں محفوظ ہیں۔

قرآن السعیدین : امیر خسرو نے یہ نظم سلطان معز الدین کی تعداد والی دہلی اور اس کے والدین کے بھراؤ والی بنگال کی مدح میں لکھی۔ یہ نسخہ ۱۱۰۸ھ میں لکھا گیا ہے۔ خوش خط و درکش ہے۔
شبستان خیال : یہ بھی ملائیشا پوری کی تصنیف ہے ۹۷۶ھ میں لکھی گئی قلم باریک مگر خوش خط ہے۔
قصائد الفوری : خوش خط و محفوظ ہے۔ اچھی حالت میں ہے۔ اغلب خیال ہے کہ ۱۰۷۵ھ کا ہے۔
نصاب الصبیان : یہ بدر الدین ابو نصر فرائی کی تصنیف ہے۔ فارسی کے الفاظ متداولہ کی فرونگ ہے اسے بچوں کے حفظ کے لیے تالیف کیا گیا۔ خوش خط ہے۔

دیوان ظہیر : ظہیر قاریابی، رشیدی کا شاگرد تھا۔ الوری کا معاصر اور حریف تھا۔ یہ قلمی محفوظ بھی خوش خط ہے۔
دیوان واقف : واقف لاجپوری کا نام نور العین تھا، قاضی کا بیٹا تھا۔ سراج علی خاں آرزو مصنف چرخ بڑا کام مصر تھا۔ ۱۱۹۰ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ یہ قلمی نسخہ اوسط درجے کی لکھائی میں ہے۔
دیوان خاقانی : افضل الدین ابراہیم بن علی شروانی نلقانی، خاقان منوچہر، والی شروان کے عہد میں تھا۔ خاقان کا لقب بادشاہ نے دیا۔ اسے سلطان الاشعرا کہا جاتا تھا۔ بقول مصنف خزاں اصلین ۵۹۵ھ میں فوت ہوا لیکن عام طور پر ۵۸۲ھ مشہور ہے۔ یہ قلمی نسخہ اچھی حالت میں ہے اور خوش خط ہے۔

تحفۃ العارفین : خاقانی شروانی سفر حج کے لیے جب عراق عرب عراق عجم کے گزرا تو وہاں کی کیفیت کو اس نے منظوم کیا اور اس کا نام تحفۃ العارفین رکھا۔ یہ قلمی نسخہ، نسخہ معونی الجملہ خوش خط ہے۔

کلیات بیدل : مرزا عبدالقادر بیدل کے تمام کلام نظم و نثر کا مجموعہ ہے۔ یہ محفوظ خط شکستہ ہے پڑھنا آسان و سوار ہے۔ کس سہ میں لکھا گیا کچھ اندازہ نہ ہو سکا۔ دیوان بیدل کا ایک اور نسخہ بھی اسی خط میں موجود ہے۔

بہار دانش : دو جلدوں میں عزت اللہ شیخ دہلوی کی تحریر ہے۔ یہ خط قلمی نسخہ ہے۔ عبارت فارسی

نشاہروادی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اس میں دلچسپ قصوں کی صورت میں عورتوں کی مکاری و میاری کا حال بیان ہے۔
 نغمات الانس : مولانا عبدالرحمان جامی کی تصنیف ہے۔ اس میں صوفیانے کرام کے حالات اور ان کے محفوظ
 ہیں۔ یہ خطوط طلائع جدول میں ہے۔ ۹۶۲ء میں لکھنے کے مقام پر یہ لکھا گیا۔
 مجموعہ قدیم دانشوران : اس بلیک قلم سے لکھے ہوئے نسخے میں دو کتابیں ہیں۔ یہ مسائل تشبیہ اور بدائع
 کلام پر مشتمل ہے۔

دیوان عرفی : یہ خوشخط قلمی نسخہ قطع خود میں ہے۔ ۱۰۱۸ء میں لکھا گیا۔ عرفی کا انتقال ۹۹۹ء میں ہوا۔ اس کا
 مطلب یہ ہوا کہ عرفی کی وفات کے ۱۹ برس بعد کا نسخہ ہے۔

مجموعہ دواوین خمسہ : اس مجموعے میں پانچ مشہور اور مستند شطرنج کے دیوان ہیں۔ (۱) دیوان مغربی (۲) دیوان
 بنیہ الدین (۳) دیوان استاد عبدالواسع بمبلی (۴) دیوان استاد ابو الفتح اور دیوان علیم قطران، یہ بھی نسخہ نہایت
 خوشخط ہے۔ دوسری طلائع جدول ہے۔ ایرانی خط کی دکھائی اور جدولوں کی نزاکت و نفاست قابل دید ہے۔ ۱۱۳۲ء
 میں موس کے مقام پر یہ نسخہ لکھا گیا۔

دیوان میرزا آصف : یہ قلمی نسخہ خاصا خوشخط ہے۔ میرزا آصف قلم کا باشعور تھا شاہ بہاں شاہ کے عہد میں
 ہندوستان آیا تھا۔

تحفہ نصاب مع بیخ گنج فارسی : یہ ایک چھوٹی سی منظوم کتاب ہے جس میں نہایت دلپذیر اور مؤثر نعتیں
 ہیں۔ اکثر دیندار مسلمان اپنے بچوں کو پڑھاتے تھے۔ یہ تالیف سید سعد الدین کی ہے جن کا لقب راجو خاں تھا۔
 ان کا انتقال ۸۰۶ھ بمطابق ۱۴۰۳ء میں ہوا اور ضلع ملتان میں مدفون ہیں۔

نثر طاہر وحید : یہ قلمی خوشخط نسخہ طاہر وحید مرزا ابن حسین خاں تھریانی کی تحریر ہے۔ طاہر عام طور پر واقعہ نویس کی
 حیثیت سے مشہور تھے کیونکہ یہ شاہ عباس ثانی کے عہد میں واقعات قلمبند کرنے پر مامور تھے۔ شاہ سلیمان کے
 عہد میں دہلی کے عہدے تک پہنچے، مرزا صاحب کے معاصر تھے۔ ۱۱۰۸ھ / ۱۶۹۶ء میں انتقال ہوا۔

دیوان حافظ : دیوان حافظ کے دو قلمی نسخے موجود ہیں۔ دونوں خوشخط اور عمدے ہیں۔ دوسرا نسخہ مع رباعیات
 عمر خیام ہے۔ یہ اعلیٰ طائے جدول میں ہے۔ حافظ کی ہر ایک غزل کے ساتھ ایک رباعی عمر خیام کی طرح کی گئی ہے۔
 ۹۸۶ء کا لکھا ہوا نہایت صحیح نسخہ ہے۔

یوسف زلیخا نے ناظم ہروی : یہ قلمی خطوط اوسط درجہ کی خوشخطی میں ہے۔ ناظم ہروی، بہارت کا نامور شاعر تھا

گیا یہی صدی چری میں ہوا۔ اس تصنیف سے وہ ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء میں فارغ ہوا۔ یوسف ذلیخ کے علاوہ قادیانک دیوان کی اس کی تصنیف ہے۔

شرح امیات مشنوی مولانا روم : جو اس کتاب سے ظاہر ہے یہ مشنوی معنوی کی شرح ہے۔ شارح کا نام نسخے پر نہیں لکھا گیا۔ ۱۰۱۲ھ کی تحریر ہے۔

بوستان سعدی : یہ نسخہ مولانا غلام میلانی کی فرمائش پر زرد افشاں کاغذ پر ۱۲۵۱ھ میں لکھا گیا۔ اسے کاتب محمد سلیم نے کشمیر میں تحریر کیا۔

دیوان معتمد : یہ خطوط کاشان کے مشہور شاعر معتمد کاشانی کا ہے۔ اس نے صباغیہ، شبابہ اور جلالیہ کے نام سے تین دیوان لکھے ہیں۔ علاوہ اس کے ایک دیوان ائمہ اطہار کی مدح و ثنا کے قصائد پر مشتمل ہے جس میں تقریباً آٹھ ہزار ابیات ہیں۔ تاریخ گوئی اور معجزات میں معتمد کو خاص مہارت حاصل تھی۔ شاہ اسماعیل صفوی کی تخت نشینی کے موقع پر اس نے جیسا سہ مصرع کا ایک قصیدہ لکھا تھا جس کے ہر ایک مصرع سے اس کا سال ۹۸۳ھ نکلتا تھا۔ دیوان معتمد کا یہ نسخہ میرزا ابوالحسن بن محمد رضا قافون گوئے کشمیر نے ۱۱۱۱ھ میں لکھا۔

الوان نعمت : یہ فارسی نظم و نثر کے مختلف رسائل کا ایک ضخیم مجموعہ ہے اس قلمی نسخے کا شکستہ خط قابل ہے۔ سنہ کا انداز نہیں ہے۔

تحفۃ الجیب : یہ مختلف شعرائے فارسی کی نثریات پر مشتمل ہے۔ خوشنوی اور وسط درجے کی ہے جلال الدین اکبر بادشاہ کے عہد کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔

قصہ کلیلہ و دمنہ : ابوالفضل علّامی کا یہ نسخہ ۱۰۶۵ھ کا نوشتہ ہے۔ نہایت خوش خط ہے۔

کلیات آفریدی : (قاسم علی تھان آفریدی)۔ اس کلیات کو قاسم علی تھان آفریدی کے ایک عقیدتمند میر کلام الدین نے ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء میں لکھا۔ اس پر جاجیا مصنف کی اپنی مہر ثبت ہے۔ شروع کتاب میں چند اوراق ناقص ہیں۔ یہ تیراہ کے ایک آفریدی کا دیوان ہے۔ اس کا خاندان اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ترکہ کر کے ہندوستان میں سکونت گزیر ہوا قاسم علی تھان آفریدی نے میر جعفر والی بنگال اور بعد میں کپنی سرکار انگریزی کی ملازمت کی۔ یہ کلیات پانچ کتابوں پر مشتمل ہے (۱) ترک آفریدی : اس میں اس نے اپنا اور اپنی خاندان کا حال فارسی زبان میں لکھا ہے۔ (۲) دیوان آفریدی : یہ پشتو زبان کا پختہ اور مصوفانہ کلام ہے۔ (۳) دیوان آفریدی بزبان اردو : یہ آفریدیوں کی ذہانت اور اردو زبان کے ساتھ دلچسپی اور رغبت کا اصلی نمونہ ہے۔

(۴) قصائد آفریدی: قدسی اور شہسوار کی چند قسمیں لکھی گئیں ایک خواب نامہ ہے یہ پشتونان میں علم تعمیر خواب کے جن نام نکلتے ہیں۔ (۵) فرنگ آفریدی: اس میں مصاحف فارسی اور چند ایک اسرار جامہ کے پہلو پہلو پشتو، اردو، کشمیری اور انگریزی کے مولف الفاظ لکھے ہیں۔

قاسم علی نہاں آفریدی کی اردو غزلیات، زبان پر کامل عبور اور فن پر مہارت قدرت کی عمدہ مثال ہیں چند اشعار آپ کی دلچسپی کے لیے پیش خدمت ہیں۔

عنان صبر ٹوٹی گویا تمکس وقار اپنا	گروہ عاشقان میں جب کیا ہم نے ٹھالنا
بھوکو نگر بسو اس طرح سے روزگار اپنا	اگر پہلو میں ہمارا مدعی کے بیٹھیا را اپنا
جلائے شمع کو شادیدہ آہ پر شرار اپنا	ہماری شب کسے گا کون روشن دلاں ہے
وہ بھوکو ذوق کتاب ہے بھر کر کتاب اپنا	خجل ہوتا نہیں ہے بے گنہ کے قتل سے ہرگز
قدم پر مرکوز کھڑکوں پر ننگ اختیار اپنا	پتی عذر گنہ ناک وہ میں بھی روزِ عشر کے
نہ کھو تو مجلسِ مستان میں اگر اعتبار اپنا	سو نہ نہمت پڑھ زاد خود میں مرے لگے
جو آفریدی کو پوچھے کوئی اہل خاکسار اپنا	نظر کر مجھ پر قدر حسن گر چاہے تری کو میں

قاسم علی نہاں آفریدی کے کلام کا ایک نمونہ برٹش میوزیم میں بھی محفوظ ہے۔ نمونہ مذکور سے آفریدی کے اردو دیوان کو کچھ عرصہ پہلے پشتو لکھنوی پشاور نے شائع کیا ہے۔

پشاور کے آرکائیو میں ایک نسخہ اردو کا "آب حیات" کے نام سے موجود ہے۔ نمبر ۳۶ ہے۔ اس "منقول آب حیات" کے آغاز یا اختتام پر مصنف یا مولف کا نام یا سن تحریر درج نہیں۔ کاتب کا نام بھی نہیں لکھا ہوا ہے۔ شروع میں حکمت کے چند نسخے ادا دیات کے نام درج ہیں۔ نہایت ستمی کتابت میں ہے کوئی حاشیہ نہیں۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد نظم کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے۔

دے ہدایت مومنوں کو یا ربی	حمد حق کے بعد ہے نعت نبی
باخبر ہو موت آئی عنقریب	باب اول ہے نصیحت کا عجیب
گر ترے میں بجا بجا انصاف ہے	نہیں ہے کوئی راہ سیدھی صاف ہے
جز خدا کوئی نہیں ہے دوستدار	کلام اپنے دیکھ کر ہو زار زار
توفیقیت بلوچ اب باقی ہے دم	کی دفا گئی عمر کی اب ہے سو کم

تو جیسا ہے جس قدر دنیا ہی کیسا ظاہری کا درد و غم پیتا ہی کیسا
 خوب نمی فطرت میں گھوٹا زندگی وقت ہے اب کر خدا کی بندگی
 اب سفر بھی کر تو زاد و راحلہ کیا چلا ہے قافلہ پر قافلہ
 مال تیرا دوست تیرے نیک نام اس سفر میں نہیں تجھے آتے ہیں کام
 دیکھتا ہے رات دن عالم کا حال کیسے کیسے ہو گئے ہیں پائمال
 اس کے بعد حکایت سکندر کی موت کی ہے پھر دنیا کی بے وفائی اور ترک دنیا کا ذکر جیسے اشعار
 ملے ہیں۔ اس کے بعد پھر حکایت ہے پھر حکام اخلاق کا بیان ہے پھر دو حکایتیں اور بیان خوبی انصاف ہے۔
 ظلم و بدعت سخت نامحسوس ہے عدل و احسان آدمی کو خوب ہے
 رب طرف ہے ایک دن تجھ کو نظر کر نظر کاموں پہ اور انصاف کر
 اہل دل کو رات دن انصاف ہے اس سبب سے سینہ ان کا صاف ہے
 دل میں جب انصاف نے پایا تمہور آئینے سے دل کے ہو تب رنگ دور
 جن کیا انصاف سے دل کو صفا ہے وہ مقبول خدا اور مصطفیٰ
 باب دوم میں حمد ثنائے رب کے سلسلے میں ۱۲ اشعار ہیں۔ پھر بیان شریعت و طریقت و
 حقیقت کے سلسلے میں پانچ اشعار ہیں اور ان کے سلسلے میں ایک حکایت ہے۔
 ایک دن پوچھا نبی سے یوں بتول بولتے کس کو شریعت لے رسول
 ہیں طریقت اور حقیقت ہے سو کیا فاطمہ سے یوں کہے جب مصطفیٰ
 ہے شریعت جو کہا ہوں میں پیام ہے طریقت جو کیا ہوں میں سو کام
 میں جو دیکھا ہوں حقیقت اسکا نام معرفت ہو اس سے حاصل واسلام
 راہ لیوے من خلاف مصطفیٰ اسکو ہرگز نہ ملے راہ صفا
 پھر بیان نئی بنائے اسلام ظاہری و باطنی، بیان چہاں طریقی، بیان توبہ و مقام توبہ، بیان منزل
 جبروت، بیان منزل لاهوت، بیان مصوری، بیان رضا وغیرہ ہے۔ ساتھ ساتھ حکایت میں انکی وضاحت
 و تشریح ہے۔ باب سوم میں بیان سوال اربعہ، کیفیت ظہور حقیقت اعیان، سوال و جواب آئینہ اور مشاہدہ
 نظری ہے۔ یہاں بھی دلچسپ منظوم حکایات ہیں۔

باب چہارم کا آغاز بسم اللہ کے بعد لوں ہوتا ہے ۔
 ہے خدا موجود باقی سب عدم در حقیقت ہی سوا اللہ نہیں سو ہم
 ہے محمد روح اعظم اس کا نام ہیں مظاہر اس کے ہر اک خاص عام
 باب پنجم میں تعریف ذکر خدا ہے ، نفس کامل کی تعریف ہے عالم ارواح کا بیان ہے ۔ پھر
 بیان عروج و نزول روح انسانی ہے ۔

ذات کی اول تجلی روح نام ہے سواد فیض مقدس والسلام
 روح انسانی سو یک شے ہے بسیط دو جہاں پر ہے ہمیشہ ادھیجیٹ
 روح کیا نور مجسّد ہے سواد روح کیا نور محمد ہے سواد
 روح ہے سو مظہر ذات وصفات روح کی جانو مظاہر کائنات
 ذات میں جو کچھ لیا مجل قرار روح میں ان سب کا ہے تفصیل وار
 پھر ایک حکایت ہے جس میں تمثیلی انداز میں روح انسانی کی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے
 اس کے بعد چند صفات شکستہ خط میں ہیں جو خستہ حالت میں ہیں ۔ پھر فارسی غزل کے پانچ اشعار اور
 ایک مصرع ہے ۔ مطلع ہے ۔

شے در خود نظر کردم جمال کبریا دیدم پے گرچوں بخود رنتم ہمہ ملکش بقا دیدم
 چوتھا اور پانچواں شعر یہ ہیں ۔

تجلی کرد نور قدس روشن شد مرا دیدہ نظر در ہر چہ می کردم بر عالم خدا دیدم
 در آں مستی و مدہوشی اتالیق گفتم ام آنجا وصال دوست شد حال طفیل مصطفیٰ دیدم
 آخری صفحے پر فارسی کی ایک اور غزل کا اندراج ہے ۔ کاتب کا نام اور سنہ تحریر موجود نہیں ہے ۔ اردو
 کا یہ واحد نمبر جسے پہلے بیان کر چکا ہوں پشاور آرکائیوز میں موجود ہے ۔

فہرست مخطوطات

کتب خانہ پونا کا جامع پونا کتب خانہ بھارت اکاس سنشودھک منڈل پونا کتب خانہ دکن عبدالحق پونا

ردیف	نام کتاب	نام مصنف	ورق	ردیف	نام کتاب	نام مصنف	ورق
۱	دبستان المذہب	محمد حسن خانی	۲۰۰	۱۶	مثنوی محتوی	مولانا جلال الدین رومی	۲۰۰
۲	چند تہمان حکیم	ابن احمد محمد	۱۸	۱۷	گہستان سعدی	سعدی شیرازی	۲۰۰
۳	نخلدین	ابن احمد محمد	۳۰۰	۱۸	خاقانی شیرازی		۷۴
۴	محقق القلوب	عبدالرزاق اصحابی	۱۷۸	۱۹	فرہنگ فارسی		۲۰۰
۵	دیوان طہیر فاضل	طہیر فاضل	۲۰۰	۲۰	زنگی پس از مرگ	جمال الدین علی بن محمد	۲۰۷
۶	واقعات ایام محمدیہ	نعمت خان عالی	۲۹	۲۱	النفقہ الاکبر	امام جعفر	۱۰۰
۷	سکندرنامہ	نظائی	۲۹۰	۲۲	طریقہ نامہ نویسی	یوسفی	۲۵۰
۸	ہرچ رقعہ و بینا بازارو	ظہوری	۵۰۰	۲۳	شفاخانہ	عبدالکریم ناگوری	۴۰۰
۹	حسن و عشق		۱۲۰۰	۲۴	راگویت کمار	راگویت کمار	۱۰۰
۱۰	زاد المسافرین و قصیدہ		۱۰۰	۲۵	کتاب شفا	ابوعلی سینا	۲۰۰
۱۱	مفتی الصلوٰۃ		۱۰۰	۲۶	مفتاح القلوب للفرس	قاضی حسن ابن محمد علی ظاہر	۴۸
۱۲	دیوان نسیم	نسیم میر حسین	۱۵۰	۲۷	عیار دانش	شیخ ابوالفضل	۲۵۰
۱۳	دیوان خدائی	خدائی	۱۶۶	۲۸	صفات شلمان	سایہ بان ہماراج بند	۳۰
۱۴	پندنامہ	عطار	۷۰۰	۲۹	تاریخ امام حسین	حسین واعظ کاشفی	۳۰
۱۵	طہران حافظ	حافظ شیرازی	۲۰۰	۳۰	چہرہ افضل کشمیر	مہاکشمیری	۲۰
	قرآن		۳۰۰	۳۱	صوف و نحو فارسی		۳۰

نمبر شمار	تکلمت بکتاب	تلم مصنف	صف	نمبر شمار	تلم کتاب	تلم مصنف	صف
۳۲	عیار دانش	ابو فضل	۲۲۶	۵۲	داستان امیر حمزه	-	۵۰
۳۳	انشاء یوسفی	یوسفی	۲۰۰	۵۳	منطق الطیر / ۵۴۳	شیخ فرید الدین عطار	۲۳۰
۳۴	تهذیب الاخلاق	کاشفی / امیرکبیر	۱۵۵	۵۴	پندنامه	سعدی شیرازی	۵۰
۳۵	نجات المسلمین / ۳۳۶	عبدالحی	۵۸	۵۵	لیل و مجنون	نظامی گنجوی	۱۵۰
۳۶	حیرات الجمال / ۱۱۲	میرزا صاحب	۲۵۱	۵۶	دیوان شفا	مبارک قدس	۱۴۲
۳۷	دیوان حافظ	حافظ	۲۰۰	۵۷	تواریخ	محمد سلیمان	۵۰
۳۸	تراو المعاد / ۱۲۹۴	محمد صالح	۲۰۰	۵۸	دیوان مبین / ۱۱۵۰	-	۳۰۷
۳۹	مدر نظام	نوروز ابن کاردوس	۸۲	۵۹	دیوان خواجوی کرمانی / ۱۳۳۷	خواجوی کرمانی	۲۵۰
۴۰	بوستان	سید شیرازی	۱۵۰	۶۰	منطق الطیر / ۱۳۵۱	شیخ فرید الدین عطار	۱۵۰
۴۱	مجموعه اشعار	-	۵۰	۶۱	شفا الصغیر / ۱۲۹۵	شفا خان	۱۰۰
۴۲	فرضیات نام / ۱۲۱۶	داراب ابن فروغی	۷۶	۶۲	قدوری	شیخ عبدالحمید	۳۰۰
۴۳	بحر الانوار / ۱۲۳۲	شیخ کمال محمد	۱۲۷	۶۳	توصیف کشمیر	شاه نراق محمدی	۲۰۰
۴۴	دیوان وحشی	وحشی	۷۰	۶۴	لب التواریخ	-	۳۰
۴۵	احکام الصلوة	-	۱۰۰	۶۵	اوصاف اشرف	-	۴۰
۴۶	شرح تمکین	ابراهیم یعقوب کشیری	۸۰	۶۶	خود داستا	-	۱۵۰
۴۷	مکتوب قنبری / ۱۳۲۱	شیخ شریف قنبری	۳۰۰	۶۷	کامنگر نوین / ۳۰۶۶	نوروز ابن کاردوس	۱۰
۴۸	مجمع الدنیا / ۱۰۶۲	حسین ابن محمد	۱۰	۶۸	تسعة المسلمين	محمد حسین	۲۵۰
۴۹	خوان خلیل / ۱۵۵۸	طه جوری	۱۵۰	۶۹	عین الحیوة / ۱۰۰۰	امام محمد باقر علامه خجسته	۲۵۰
۵۰	فتوحات عباسی	موسی بن بهاء دغان	۱۰۰	۷۰	مشکلات الفلسف	-	۲۵۰
۵۱	تراو السافرن	محمد مهدی	۱۵۰	۷۱	صد شتر / ۱۳۸۱	-	۵۰

نمبر شمار	نام کتاب / تاریخ	نام مصنف	صف	نمبر شمار	نام کتاب / تاریخ	نام مصنف	صف
۷۲	قرابادین بن ذوق الحجاز / دشت شاه میری	مصطلحات بهار عم	۹۲	۳۰۰	۸۰۰		
۷۳	منابر الهی انگیر / ۱۰۸۱	تاریخ جهانگشای نادری / میرزا احمد کاتانی	۹۳	۲۰	۳۰۰		
۷۴	احباب اشعلر میل / ۱۰۸۱	قاموس اللغة / ۱۲۷۵	۹۴	۱۰۰	۳۰۰		
۷۵	تبره العوام / ۱۰۸۰	احسن القصص	۹۵	۲۵۰	۲۰۰		
۷۶	رساله حسنیه / ۱۵۸۰	روضه الصفا / ۱۲۷۷	۹۶	۷۰	۹۰۰		
۷۷	قالنامه	کتاب الجنان	۹۷	۳۰۰	۳۰۰		
۷۸	رقعات میرزا قنیل / ۱۲۶۰	مکاتبات ابوالفضل / ۱۲۷۰	۹۸	۲۰۰	۳۰۰		
۷۹	در ناد / ۱۲۸۰	تاریخ بدایت شیعه / ۱۲۱۳	۹۹	۳۰۰	۳۰۰		
۸۰	حصان الجنان	اسکندرنامه / ۱۲۱۳	۱۰۰	۸۰۰	۳۰۰		
۸۱	دیوان صائب	طب موزون / ۱۲۷۱	۱۰۱	۲۰۰	۱۲۰		
۸۲	دیوان کلیم	شعبشیر آسمانی / ۱۲۷۵	۱۰۲	۲۰۰	۳۷۰		
۸۳	رقعات جامی / ۱۲۱۷	اسکندرنامه	۱۰۳	۲۰۰	۳۰۰		
۸۴	شاهنامه / ۱۰۳۰	دایرة النجوم / ۱۲۱۱	۱۰۴	۲۰۰	۳۰۰		
۸۵	کتاب الصلوة / ۱۳۱۳	دیوان حافظ	۱۰۵	۱۰۰	۳۰۰		
۸۶	کلیات سالک	کتاب فدوی / ۱۲۷۲	۱۰۶	۱۵۵	۱۰۰		
۸۷	قرابادین مظفر	فتادی قاضی خان / ۱۸۳۵	۱۰۷	۱۵۵	۱۰۰		
۸۸	غریب الطبیہ	توزک جهانگیر / ۱۲۹۳	۱۰۸	۲۸۴	۳۳۰		
۸۹	تاریخ تیمور	کتاب اللطیف	۱۰۹	۸۰۰	۳۰۰		
۹۰	اختیارات	حیوة القلوب / ۱۲۱۰	۱۱۰	۳۰۰	۵۰۰		
۹۱	وقایع نعمت خان عالی / ۱۲۸۰	کلیات انصاری	۱۱۱	۱۲۰	۳۰۰		

نمبر شمار	نام کتاب / تلخیص	نام مصنف	صف	نمبر شمار	نام کتاب / تلخیص	نام مصنف	صف
۱۱۱	چهل حدیث	-	۵	۱۳۰	قرآن / ۱۱۱۷	-	۳۰۰
۱۱۲	نعمتہ الرجال	-	۲۰۰	۱۳۱	عقول عشرہ / ۱۳۹۷	محمد بلازی	۴۰۰
۱۱۳	لیل و مجنون / ۲۲۵	نظامی	۳۰۰	۱۳۲	تاریخ کشمیر	امیر الدین حکیم دال	۶۰۰
۱۱۴	صفات المم و احکام مملوک	-	۵۰	۱۳۳	اشعار	-	۱۰۰
۱۱۵	باقی الحسنی المحسان / ۱۱۱۹	مرحوم القلوب	۳۰۰	۱۳۴	بہار گل انعام / ۱۷۷۱	محمد امین الدین رفیعی	۸۰۰
۱۱۶	مصطلحات بہارِ محرم / ۱۸۵۳	-	۹۰۰	۱۳۵	حکایات / ۱۳۵۲	محمد علی	۴۰۰
۱۱۷	علیہ المستعین / ۱۱۲۶	مولانا محمد علی باقر	۱۲۳۰	۱۳۶	ادعیہ	محمد زکی قدوسی	۲۰۰
۱۱۸	زاد المعاد / ۱۱۱۵	محمد باقر ابن محمد تقی	۴۰۰	۱۳۷	ادبی	-	۱۵۰
۱۱۹	شاہنامہ	فروغی طوسی	۱۵۰۰	۱۳۸	ہفت آسمان / ۱۸۷۳	مولوی آقا احمد	۱۷۳
۱۲۰	مواہج النبوت فی	درویشی	۱۰۰۰	۱۳۹	اوستا	-	۴۰۰
۱۲۱	مدائح القوت / ۱۰۸۶	محمد رفیع	۱۰۰۰	۱۴۰	غزلی	-	۳۰۰
۱۲۲	برہان قاطع	-	۶۱۵	۱۴۱	غزلی	-	۲۲۲
۱۲۳	برہان القاطع / ۱۰۶۱	محمد حسن بہانی	۶۰۰	۱۴۲	فرنگ پہلوی / ۱۸۵۲	لاؤنچی نویش و ان	۲۲۶
۱۲۴	مؤید الفضل	علی محمد	۲۰۰	۱۴۳	ہفت پیکر / ۱۹۳۶	نظامی گنجوی	۳۰۰
۱۲۵	- - - / ۱۳۲۷	شیخ محمد صدیق بہانی	۳۰۰	۱۴۴	روشتہ الصفا	-	۳۰۰
۱۲۶	ذخیرہ خواہر مشاہیر / ۱۳۲۸	اشعید ابن حسن ابن محمد	۱۰۰۰	۱۴۵	روشتہ الصفا	-	۳۰۰
۱۲۷	طب	-	۳۰۰	۱۴۶	غنائی الائی و طب	اسماعیل ابن احمد زحانی	۱۵۲
۱۲۸	غزلی / ۲۰۰	-	۲۰۰	۱۴۷	غنیۃ الاطباء / ۱۲۶۳	غیرالتفصیل آبادی	۲۰۰
۱۲۹	غزلی	-	۱۵۰	۱۴۸	گلستان / ۱۳۰۵	شیخ سعدی	۱۵۰
		-		۱۴۹	آیات الانشاء	-	۳۰۰

نمبر شد	نام کتاب / مکتب	نام مصنف	صف	نمبر شد	نام کتاب / مکتب	نام مصنف	صف
۱۵۰	صمد / ۱۱۳۲	رستم ابن بگرام	۱۰۰	۱۴۹	دیوان حرفی / ۱۰۵۵	رفی شیازی	۲۰۰
۱۵۱	غزلیهای گوناگون / ۱۱۳۳	حسین دویگن	۵۰	۱۴۰	روضة الصفا / ۱۰۳۴	محمد بن خدابخش	۴۰۰
۱۵۲	اوستا	—	۲۰۰	۱۴۱	صافی نامه گبری	طالعیری	۱۵۰
۱۵۳	کشکول / ۱۰۵۷	—	۴۰۰	۱۴۲	سند / ۱۲۵۷	کمال ملایک بن خدی	۴۰
۱۵۴	مفتاح التواریخ	—	۱۵۰	۱۴۳	خوفزاری	خواجه موسی	۷۰
۱۵۵	مخزن الاسرار	نظای گنجی	۱۵۰	۱۴۴	سکند نامه / ۱۲۵۲	نظای گنجی	۷۰
۱۵۶	قدوری / ۱۱۰۰	عبدالمسین احمد	۲۰۰	۱۴۵	پهلوی حق / ۱۸۵۹	نوروزی گنگا	۲۲۰
۱۵۷	قرآن / ۹۳۱	سید حسین (کاتب)	۳۰۰	۱۴۶	فتاوی قاضی خان / ۱۸۸۵	مولوی محمد مراد	۵۰۰
۱۵۸	دیوان سنائی	حکیم سنائی	۳۰۰	۱۴۷	نیرنگستان	—	۳۰۰
۱۵۹	مخزن الاسرار	نظای گنجی	۱۰۰	۱۴۸	خط پهلوی	—	۵۰
۱۶۰	یوسف زینهار / ۱۱۳۹	عبد الرحمن جلی	۱۵۰	۱۴۹	وندیداد	—	۳۲۰
۱۶۱	فردنامه صفایات جدید / ۱۳۳۸	—	۲۰۰	۱۵۰	وندیداد / ۱۱۳۶	—	۴۰۰
۱۶۲	خسرو و شیرین / ۱۲۳۹	نظای گنجی	۲۷۰	۱۵۱	وندیداد /	—	۴۰۰
۱۶۳	عجب التافه فی	احمد بن محمد	۲۵۵	۱۵۲	وندیداد	—	۴۰۰
۱۶۴	اخبار تیمور / ۱۸۸۸	—	—	۱۵۳	وندیداد	—	۳۵۰
۱۶۵	مثنوی معنوی / ۱۲۶۶	جلال الدین رومی	۳۰۰	۱۵۴	مجمع الجوامع	—	۷۰۰
۱۶۶	مدح القروض / ۱۳۶۲	ابو خض محمد طاهر حسری	۳۰۰	۱۵۵	شاهنامه	فردوسی	۱۰۰
۱۶۷	علین الحیات	سید محمد علی شیرازی	۲۰۰	۱۵۶	مرشد الاوام / ۱۲۰۳	ابوالقاسم نوری	۴۰۰
۱۶۸	هفت پیکر / ۹۱۳	نظای گنجی	۲۰۰	۱۵۷	روضه کوپیان	محمد شریف	۴۰۰
۱۶۹	تواریخ کشمیر	امیر الدین	۵۰۰	۱۵۸	زر زشت نامه	—	۹۵

نمبر شمار	نام کتاب از تاریخ	نام مصنف	صفحه	نمبر شمار	نام کتاب از تاریخ	نام مصنف	صفحه
۱۸۹	نذیری	طولی نامه	۲۰۹	۹۵	—	محمد تقی	۱۵۰
۱۹۰	شامع الکتاب و فضیله عبدالعزیز محمد شاه	قرآن	۲۱۰	۳۰	—	—	۵۰۰
۱۹۱	مشنوی معنوی	تاریخ بایانی / ۱۵۹	۲۱۱	۱۵۰۰	مولانا درم	—	۲۴۰
۱۹۲	نحو فارسی	شرح قصیده سبیه	۲۱۲	۲۰۰	—	عبدالکریم انطیبی	۱۵۰
۱۹۳	شاهنامه / ۳۴۴	یوگ بشت / ۱۰۶۶	۲۱۳	۴۰۰	فردوسی طوسی	شاهزاده داراشکوه	۱۰۰
۱۹۴	عشراق الشیراز / ۲۳۳	تاریخ کشمیر / ۱۱۹۴	۲۱۴	۱۵۰	محمد بهارالدین	میر عبداللہ	۲۰۰
۱۹۵	تاریخ تذکرہ شہداء	رقعة القیام الکمل / ۱۲۶۱	۲۱۵	۳۰۰	—	میر کمال الدین	۴۰۰
۱۹۶	تاریخ فیروز شاہی / ۱۳۵۶	کتاب البیج	۲۱۶	۴۰۰	قبار الدین بزی	ابو محمد	۴۰۰
۱۹۷	کتاب الامام	مجموع الحسنات	۲۱۷	۳۵۰	حسین المولی	—	۱۰۰
۱۹۸	بسمان و شیو بودا / ۱۸۸۹	مصدر	۲۱۸	۱۵۰	گوپال کال چندیز	—	۱۰۰
۱۹۹	اکبرنامه	قصیده برده	۲۱۹	۳۰۰	ابوالفضل (دوبلا کرشلہ)	—	۱۸۰
۲۰۰	ترجمہ بھگوت گیتا	مشنوی / ۸۷۲	۲۲۰	۸۰	شاهزاده داراشکوه	—	۴۰۰
۲۰۱	دارالعبق / ۱۰۷۳	قیامت نامه / ۱۲۷۸	۲۲۱	۱۰۰	محسن کاشانی	محمد ابن جان محمد	۲۰۰
۲۰۲	خلاصۃ الحساب	الف لیله / ۱۸۱۸	۲۲۲	۵۰	حسین ابن اموی	شیخ احمد ابن محمد	۱۹۰۰
۲۰۳	خیر نیزی / ۸۲۵	حکایات ادم	۲۲۳	۵۰	محمد ابن ابی بوقل	—	۹۰۰
۲۰۴	قصیده بد	تاریخ دقائق جهانگیری / ۱۸۴۸	۲۲۴	۳۰۰	—	—	۱۰۰
۲۰۵	شرح جغینی	حکایات	۲۲۵	۳۰۰	ابوطاهر	شیخ جلیل	۳۰۰
۲۰۶	حکایات سعدی / ۱۵۵	جامع المختارات / ۱۰۸۴	۲۲۶	۳۰۰	شیخ سعدی	—	۵۰۰
۲۰۷	مقتل نامہ امام حسین	نخستہ نظامی / ۹۷۵	۲۲۷	۳۰۰	شاه عبدالعزیز	نظامی گنجوی	۵۰۰
۲۰۸	تنبیہ الغافلین / ۱۲۷۴	تاریخ عرب / ۹۰۶	۲۲۸	۳۰۰	امیر ابن احمد	اعظم کوئی	۶۰۰

نمبر شمار	نام کتاب / تاریخ	نام مصنف	ورق	فهرشده	نام کتاب / تاریخ	نام مصنف	ورق
۲۲۹	وقت کشمیر / ۱۲۴۲	محمد منتظم خاں	۳۰۰	۲۳۹	کلیات قنوری	قنوری	۵۰۰
۲۳۰	قرابادین معصومی / ۱۳۳۹	معصوم ابن کریم الدین	۱۸۲	۲۵۰	اشعار الوافضل	ابوالفضل	۱۰۰
۲۳۱	برهان قاطع / ۱۸۳۲	-	۴۰۰	۲۵۱	روزنامه های جمال المتین / ۱۹۱۳	-	۱۰۰۰
۲۳۲	خط پیلوی	پیلوی	۴۰۰	۲۵۲	کلیات سحر / ۱۳۲۰	سحر	۶۰۰
۲۳۳	خط پیلوی	-	۴۰۰	۲۵۳	نغات النور / ۱۳۳۲	دکتر عبدالحق	۴۰۰
۲۳۴	خط پیلوی	-	۱۰۰۰	۲۵۴	اعجاز العصر / ۱۳۵۳	"	۳۰۰
۲۳۵	خط پیلوی	-	۱۰۰۰	۲۵۵	اعجاز العصر / ۱۳۵۳	"	۲۰۰
۲۳۶	خط پیلوی	-	۴۰۰۰	۲۵۶	اعجاز العصر / ۱۳۵۳	"	۴۰۰
۲۳۷	منظمانب الفار / ۱۰۰۰	امیر خسرو دیلی	۱۰۰	۲۵۷	راهنمای شنوی / ۱۳۵۳	"	۴۰۰
۲۳۸	ابتداء العرف	اولاد احمد	۱۵۰	۲۵۸	آئین اقبال / ۱۳۵۳	"	۵۰
۲۳۹	دیوان حافظ / ۱۰۹۹	حافظ شیرازی	۳۰۰	۲۵۹	حق / ۱۳۳۳	"	۳۰
۲۴۰	نان و حلوا	محمد حسین	۵۰	۲۶۰	تذکار / ۱۹۳۲	"	۵۰
۲۴۱	منتخب اللغة	-	۲۱۴	۲۶۱	تذکار / ۱۳۳۷	"	۷۰
۲۴۲	یوسف وزلیخا	عبد الرحمن جامی	۱۵۰	۲۶۲	... / ۱۹۳۰	"	۴۰
۲۴۳	کلیات سعدی / ۱۰۹۵	سعدی شیرازی	۵۰۰	۲۶۳	اشعار / ۱۹۳۲	"	۸۰
۲۴۴	شرح گلستان	مولوی غیاث الدین	۱۵۰	۲۶۴	میزب خرم / ۱۹۳۷	"	۱۰۰
۲۴۵	رباعیات عبدالحق / ۱۹۳۳	دکتر عبدالحق	۱۰۰	۲۶۵	معراج حق / ۱۹۳۳	"	۲۰
۲۴۶	مخزن الاسرار / ۱۸۳۳	نظامی گنجوی	۱۱۸	۲۶۶	رباعیات حق / ۱۹۳۳	"	۱۰۰
۲۴۷	شرح سکندرنامه / ۱۸۳۳	مولوی بکر لوده	۸۰۰	۲۶۷	صبح امید / ۱۹۳۵	"	۲۰۰
۲۴۸	نور الفرقان / ۱۹۳۵	دکتر عبدالحق	۳۰	۲۶۸	مختصر حالات / ۱۹۳۲	"	۱۰۰

نمبر	نام کتاب / تاریخ	نام مصنف	دقیق	نمبر	نام کتاب / تاریخ	نام مصنف	دقیق
۲۹۹	سراج مسکن / ۱۳۳۲	دکتر عبدالحی	۳۵۰	۲۸۸	معراج نامه	سید یحیی	۱۰۰
۲۹۰	شیرازہ اقبال / ۱۳۳۲	ء ء	۳۵۰	۲۸۹	روضۃ الشہاء		۲۰۰
۲۹۱	الحیات	-	۱۰۰	۲۹۰	مثنوی بدیع / ۱۳۳۲	ضمیر	۱۰۰
۲۹۲	اشعار		۱۵۰	۲۹۱	رسالہ صوفیہ	عبدالجبار	۲۰۰
۲۹۳	اشعار		۵۰۰	۲۹۲	قصہ ملکہ معصومہ	عمود	۲۰
۲۹۴	معدن المعانی		۹۰۰	۲۹۳	دار الجہانس	-	۹۰
۲۹۵	صندوق پراز کتابہ			۲۹۴	قصہ قاضی و دزد	-	۲۵
	قدیمی و بدون نام			۲۹۵	نصیحت المسلمین	-	۳۰
۲۹۶	تغیب اللغات شامیانی / ۱۳۳۳	عبدالمشید نقوی	۵۰۰	۲۹۶	وکالت نامہ	-	۱۰
۲۹۷	گلشن عشق	نحوی	۳۰۰	۲۹۷	جنگ نامہ	نذیر احمد	۲۵
۲۹۸	نوز نامہ حضرت رسول	-	۲۴	۲۹۸	چند نامہ / ۱۳۹۹	شرف بخاری	۱۰
۲۹۹	تحفۃ النصاب	-	۷۰	۲۹۹	جنت السلام	شاہ شرف الدین	۲۵
۳۰۰	یوسف و زلیخا	جہا	۲۰۰	۳۰۰	قصہ شاہ داؤد / ۱۳۰۰	مفسر	۲۰
۳۰۱	دہ مجلس	ولی و لیدی	۱۰۰	۳۰۱	قیامت نامہ	-	۲۰
۳۰۲	انشاء عنایت	شاہ عالم	۱۲۰	۳۰۲	کشف الخلاء / ۱۳۳۶	سقا مالین حافظ	۵۰
۳۰۳	قصہ شاہ یمن	قاضی ابراہیم	۳۰	۳۰۳	تحفہ مولود شریف / ۱۳۴۰	شیخ عمر	۹۹
۳۰۴	قصہ لیلی و مجنون / ۱۳۵۸	عزیز	۵۰	۳۰۴	رسالہ تصوف	-	۱۵۰
۳۰۵	محمی الدین	محمد قاضی	۹۰	۳۰۵	معراج نامہ / ۱۳۹۵	مختار	۱۵۰
۳۰۶	قال نامہ	حکیم روی	۷۰	۳۰۶	مولود نامہ / ۱۳۹۵	قاضی	۱۰
۳۰۷	چند نامہ / ۱۳۹۹	شرف بخاری	۲۰	۳۰۷	ریاضت العارفين / ۱۳۴۰	اسحق	۲۵۰

نمبر شمار	نام کتاب و تاریخ	نام مصنف	صفحه	نمبر شمار	نام کتاب و تاریخ	نام مصنف	صفحه
۲۰۸	معراج نامه ۱۱۰۵	سید بلقی	۱۰۰	۲۲۸	احکام العلوة	-	۱۵۰
۲۰۹	روضه الشهداء ۱۱۱۹	دالی ولادی	۸	۲۲۹	منقبات	-	۱۵
۲۱۰	معراج نامه ۱۱۰۵	سید بلقی	۱۰۰	۲۳۰	یوسف و زلیخا ۲۰۰	جای	۲۰۰
۲۱۱	تنبيه الجاهلین ۱۳۱۵	-	۲۵	۲۳۱	حکایات مائمه طائی	احمد بیگ	۳۰۰
۲۱۲	قسمتی از قرآن	-	۵۰	۲۳۲	اخلاق عسفی	-	۳۰۰
۲۱۳	تحفه الفتاح	-	۴۰	۲۳۳	دیوان خواجہ حافظ	-	۳۰۰
۲۱۴	کیمیای سعادت ۱۳۱۵	علم خرمالی	۸۰۰	۲۳۴	شیخ المشائخ	ابو حسن	۵۰
۲۱۵	حکایات	-	۲۵	۲۳۵	دیوان سودا	سودا	۳۰۰
۲۱۶	جنگ نامه	-	۴۰	۲۳۶	قصیده	عبدالرزاق	۱۰۰
۲۱۷	روضه الشهداء ۱۳۵۹	-	۹۰۰	۲۳۷	قرآن	-	۳۰۰
۲۱۸	قصه نیر انصاری ۱۱۱۸	انصاری	۱۰۰	۲۳۸	قصه نیر انصاری	-	۳۰۰
۲۱۹	یوسف و زلیخا ۱۹۷	جای	۲۰۰	۲۳۹	قسمتی از قرآن	-	۱۰۰
۲۲۰	مفتاح الجنان	-	۴۰۰	۲۴۰	تاریخ نامه	-	۲۰
۲۲۱	مناجات	-	۱۰	۲۴۱	بدن نامه	-	۵۰
۲۲۲	مرح و عیسی ۱۲۹۳	نگار	۵۰	۲۴۲	قسمتی از قرآن	-	۱۰
۲۲۳	یوسف و زلیخا	جای	۱۵۰	۲۴۳	گلشن نامه	-	۵۰
۲۲۴	قرآن	-	۵۰۰	۲۴۴	اسناد و دلائل برات	-	۲۰
۲۲۵	خانی گریه کانی	-	۴۰۰	۲۴۵	قصیده	-	۱۰
۲۲۶	مجات المسلمین	عبدالرضا	۴۰۰	۲۴۶	حدیث	-	۴۰
۲۲۷	سلف الصالحین	=	۳۰	۲۴۷	بوستان	سودی	۳۰۰

نمبر شمار	نام کتاب در تاریخ	نام مصنف	ورق	فهر شمار	نام کتاب در تاریخ	نام مصنف	ورق
۳۲۸	ترکیب نماز	—	۵	۳۶۸	کنز الدقائق	—	۳۰۰
۳۲۹	حکایات	—	۵	۳۶۹	وفات نام حضرت محمد	—	۱۰۰
۳۵۰	جنت الفردوس	—	۱۵۰	۳۷۰	حدیث شریف	—	۱۰۰
۳۵۱	بیان وضو بیان عبادت	—	۵۰	۳۷۱	ترکیب اسماک	—	۱۰۰
۳۵۲	قال نام	—	۲۰	۳۷۲	ترکیب نماز	—	۵۰
۳۵۳	پند نامه	الم غفری	۲۰	۳۷۳	دلکش فناء	—	۲۰۰
۳۵۴	گریبا	—	۵۰	۳۷۴	روایت بانک	—	۱۰۰
۳۵۵	سلام	—	۲۰	۳۷۵	دو شسته	محمد متور	۸۰
۳۵۶	یوسف وزینجا	فنگار	۱۵۰	۳۷۶	حکایات و واقعات	—	۱۰۰
۳۵۷	کلید دومنه	ابن المقفع	۲۰۰	۳۷۷	اشعار فیهی	—	۲۰۰
۳۵۸	قصیده	—	۳۰۰	۳۷۸	حکایات و قطعه	—	۱۰۰
۳۵۹	کشف اللغات	عبد الرحمن	۱۰۰۰	۳۷۹	در جامع الکبری	—	۴۰۰
۳۶۰	قال نام	—	۵۰	۳۸۰	پند نامه	—	۷۰
۳۶۱	گلستان	سعدی شیرازی	۳۰۰	۳۸۱	کتاب طب	—	۱۰۰
۳۶۲	خطبه اول جمعه و اشعار	عبد الرحمن	۲۰۰	۳۸۲	اشعار رکن الدین	شیخ رکن الدین	۴۰۰
۳۶۳	تذکره الملک میرزا علی	رفیع الدین	۲۰۰	۳۸۳	احادیث و مسائل نبی	—	۲۰۰
۳۶۴	سرنامه (تاریخ)	—	۱۰۰	۳۸۴	مصحح البیاض	—	۴۰۰
۳۶۵	دا الجالس	—	۷۵	۳۸۵	قرآن	—	۵۰
۳۶۶	بوستان	سعدی	۱۵۰	۳۸۶	یوسف وزینجا	جای	۲۰۰
۳۶۷	تحفة النصائح ۹۰	یوسف گدا	۱۵۰	۳۸۷	قصیده محمد صیف	محمد صیف	۱۰۰

نمبر	نام کتاب و تاریخ	نام مصنف	ورق	نمبر	نام کتاب و تاریخ	نام مصنف	ورق
۲۸۸	قرن النفاخ	-	۱۰۰	۲۸۸	ابو الفضل - دفتر	ابو الفضل	۱۰۰
۲۸۹	مثنوی	-	۳۰	۲۸۹	پنج سوره قرآن	-	۵۰
۲۹۰	فائزنامه	-	۵۰	۲۹۰	نورس گر مهر	-	۲۰۰
۲۹۱	فائزنامه	-	۵۰	۲۹۱	تاریخ فرشته جلد دوم	فرشته	۳۰۰
۲۹۲	بهار دانش ۱۲۰۹	حدلولیس	۲۰۰	۲۹۲	حدیقه سنائی	سنائی	۴۰۰
۲۹۳	بوستان	سعدی شیرازی	۴۰۰	۲۹۳	ابو الفضل - دفتر اول	ابو الفضل	۱۵۰
۲۹۴	بوستان	سعدی شیرازی	۱۵۰	۲۹۴	انشاء ابو الفضل	ابو الفضل	۲۰۰
۲۹۵	گلستان	سعدی شیرازی	۱۵۰	۲۹۵	رقعات عالمگیری	-	۱۰۰
۲۹۶	دیوان حافظ	حافظ	۵۰۰	۲۹۶	جرات سکندری ۱۲۳۲	-	۳۰۰
۲۹۷	طولی نامه / ۲۹۶	گل محمد خلیف	۴۰۰	۲۹۷	اقبال نامه متفقان / ۱۱۹۸	سرکشجهانگیر پادشاه	۲۰۰
۲۹۸	نامه با	-	۵۰	۲۹۸	سیر العارفين / ۱۰	داود ابن عباس	۱۰۰
۲۹۹	مثنوی میر حسن / ۱۲۴۳	-	۱۰۰	۲۹۹	اکبرنامه	ابو الفضل	۳۹۹
۳۰۰	انشاء ریاضی	-	۳۰۰	۳۰۰	اکبرنامه	-	۴۰۰
۳۰۱	انشاء هرکرن	امیر ناد	۲۰۰	۳۰۱	تاریخ فرشته	فرشته	۳۰۰
۳۰۲	رساله انشاء	-	۲۰	۳۰۲	اخلاق محسنی / ۱۱۶۶	حسین واندکاشتی	۴۰۰
۳۰۳	انشاء یوسفی	یوسف	۱۵۰	۳۰۳	لغات / ۱۲۱۳	غلام علی الدین	۱۹۸
۳۰۴	انشاء	-	۱۵۰	۳۰۴	حاتم طائی	محمد حسین قاضی	۱۱۵
۳۰۵	انشاء و حور او	محمود او	۳۰۰	۳۰۵	کلیات آزاد / ۱۲۰۴	-	۳۱۵
۳۰۶	دیوان نیا و دیوان سخن نیا	نیا	۱۰۰	۳۰۶	علامه مشرق و ماکولات / ۱۱۹۴	نسیطی	۱۱۸
۳۰۷	سکندرنامه / ۵۹۷	تقدای گنجوی	۵۰۰	۳۰۷	شیخونامه / ۱۱۱۷	حاج محمد صلاح الدین	۱۹۰

نمبر شمار	نام کتاب / تاریخ	نام مصنف	دوق	نمبر شمار	نام کتاب / تاریخ	نام مصنف	دوق
۲۲۸	تاریخ مهند	—	۱۰۰	۲۳۸	انشاء پیر معنی	—	۵۰
۲۲۹	رسمات / ۱۱۸۸	بریم کریم	۱۰۰	۲۳۹	جامع عباسی / ۱۲۰۱	چهارالدین محمد	۲۰۰
۲۳۰	کتاب گلزار	—	۱۰۰	۲۴۰	راز گلستان	—	۵۰
۲۳۱	تاریخ تیموریان	—	۲۰۰	۲۴۱	کشور ابراهیمی	ابراهیم	۵۰
۲۳۲	رساله میر سلطان علی	—	۳۰۰	۲۴۲	—	—	۲۰۰
۲۳۳	چهار درویش	—	۲۰۰	۲۴۳	—	—	۳۰۰
۲۳۴	تاریخ بدایونی	بدایونی	۴۰۰	۲۴۴	علی نامه	—	۲۰۰
۲۳۵	برهان قاطع	—	۱۰۰۰	۲۴۵	هفت کرسی	—	۱۰۰
۲۳۶	تاریخ ترکستان	—	۳۰۰	۲۴۶	جنگ نامه بادشاهان افغانی / ۱۲۳۸	علی ابراهیم بهادر خان	۳۰
۲۳۷	تاریخ مهند	—	۳۰۰	۲۴۷	کلیات سعدی	سعدی شیرازی	۲۰۰
۲۳۸	نسخه کاغذ نامه / ۱۲۴۶	میر یوسف خردا	۲۰۰	۲۴۸	کلیات سعدی	—	۲۰۰
۲۳۹	انشاء نور محمد	نورالدین محمد	۸۰	۲۴۹	گلستان سعدی	سعدی شیرازی	۲۰۰
۲۴۰	انشاء از حیدر آباد	—	۸۰	۲۵۰	چهار درویش	—	۳۰۰
۲۴۱	دیوان شوکت	شوکت	۲۰۰	۲۵۱	گلستان سعدی	سعدی شیرازی	۱۰۰
۲۴۲	شرح جوهرنگ	—	۳۰۰	۲۵۲	ترجمه فتوح الغیبار / ۱۰۹۷	عمی الدین ابن محمد عبدالقادر گیلانی	۱۰۰
۲۴۳	بیان مکتوبات / ۱۷۷۵	—	۲۰۰	۲۵۳	شرح وقائع	—	۲۰۰
۲۴۴	نسب النبیان	جلوس احمد شاه	۱۰۰	۲۵۴	مختب القرآن	—	۱۵۰
۲۴۵	خوان پر نعمت	—	۷۰	۲۵۵	شرح مثنوی	—	۵۰
۲۴۶	انشاء	—	۱۰۰	۲۵۶	حاکم طائی	—	۲۰۰
۲۴۷	دستور زبان / ۱۱۴۳	—	۵۰	۲۵۷	تعریف حسین شاه	—	۲۰۰

نمبره	نام کتاب / تاریخ	نام مصنف	صف	نمبره	نام کتاب / تاریخ	نام مصنف	صف
۳۹۸	اکبرنامه	ابوالفضل	۲۰۰	۳۸۷	متفرق	—	۲۰۰
۳۹۹	دیوان حافظ	حافظ شیرازی	۷۰	۳۸۸	نامه	—	۲۰۰
۴۰۰	قصه عشق شاهزاده ملک	—	۱۵۰	۳۸۹	حکایات	سراج الدین	۱۰۰
—	محمد و شمس بانو	—	—	۳۹۰	مسائل	—	۵۰
۴۰۱	شرح شمس بازغ / مولانا محمد	—	۲۰۰	۳۹۱	مسائل	—	۵۰
۴۰۲	پرایه	—	۲۰۰	۳۹۲	اشعار	—	۵۰
۴۰۳	شرح پنج رقصه / ۱۳۵۹	مولانا عبدالاحد	۲۰۰	۳۹۳	کتاب نوباده	—	۵۰
۴۰۴	عیار دانش	ابوالفضل	۲۰۰	۳۹۴	دیوان اشعار	—	۴۰
۴۰۵	شرح فتوح الغیب / ۱۰۲۳	—	۲۰۰	۳۹۵	اشعار	—	۱۰۰
۴۰۶	تاریخ	—	۱۰۰۰	۳۹۶	چهل حدیث	—	۱۵۰
۴۰۷	ادبی	—	۱۰۰	۳۹۷	طب	—	۲۰
۴۰۸	سکندرنامه	میرزا محمد مهدی	۲۰۰	۳۹۸	اخلاق	—	۲۰
۴۰۹	حکایات	—	۵۰۰	۳۹۹	حکایات	—	۱۰۰
۴۱۰	تاریخ هند	—	۵۰	۴۰۰	اشعار	—	۵۰
۴۱۱	پنج سوره	—	۵۰	۴۰۱	تاریخ	—	۵۰
۴۱۲	اشعار	—	۵۰	۴۰۲	تاریخ حکایات	—	۳۰
۴۱۳	علی نامہ	—	۲۰۰	۴۰۳	اشعار	—	۷۰
۴۱۴	تاریخ علی	—	۱۰۰	۴۰۴	نذبی	—	۵۰
۴۱۵	نوحہ	—	۵۰	۴۰۵	نذبی	—	۵۰
۴۱۶	کتاب انشاء / ۱۸۳۳	—	۵۰	۴۰۶	چند مکتوبات	—	۹۰

نمبر شمار	نام کتاب / تاریخ	نام مصنف	ورق	نمبر شمار	نام کتاب / تاریخ	نام مصنف	ورق
۵۰۷	دیوان اشعار	—	۵۰	۵۲۷	طب	—	۲۰۰
۵۰۸	کتاب حساب	—	۵۰	۵۲۸	طب	—	۲۰۰
۵۰۹	دیوان اشعار	—	۲۰	۵۲۹	تاریخ	—	۱۵۰
۵۱۰	عصیان	—	۲۰۹	۵۳۰	تاریخ	—	۱۵۰
۵۱۱	زینما	—	۵۰	۵۳۱	مجموعه نجوم	ولی محمد	۲۰۰
۵۱۲	حکایات	—	۵۰	۵۳۲	انتخاب از شیخ حسن	ابو بنید	۱۰۰
۵۱۳	نان و حلوا	شیخ بهار الدین	۵۰	۵۳۳	فرقانی	—	۲۲۰
۵۱۴	روضه الصفا	عبدالکریم ابن یوسف	۱۰۰	۵۳۴	سیف اسفر	سیف الدین	۱۰۰
۵۱۵	مجموعه چند کتاب	—	۲۰۰	۵۳۵	طب	—	۱۰۰
۵۱۶	اشعار	—	۲۰۰	۵۳۶	علوم	—	۱۰۰
۵۱۷	لاله	—	۲۰۰	۵۳۷	دستور زبان عربی	—	۱۰۰
۵۱۸	بوستان	—	۵۰۰	۵۳۸	رقعاً نواب کشف جاد	—	۱۰۰
۵۱۹	مختار القمص	—	۲۰۰	۵۳۹	رساله النجوم	—	۱۰۰
۵۲۰	افسانه کامروپ	هت جان محسنی	۲۰۰	۵۴۰	رساله فی علم الموسیقی	—	۳۰۰
۵۲۱	تاریخ شاهجهان	—	۷۰۰	۵۴۱	نسخه الهمم الغیب فی	—	۱۵۰
۵۲۲	شرح تقلید رس	میرزا غیر الله	۵۰۰	۵۴۲	علم الایجاد والاجرا	—	۳۰۰
۵۲۳	علوم	—	۲۰۰	۵۴۳	شرح سکنه منامه	عماد فضل الله آبادی	۳۰۰
۵۲۴	تاریخ افلاک	میرزا محمد مستغان	۵۰۰	۵۴۴	نجوم	—	۳۰۰
۵۲۵	نجوم	—	۲۰۰	۵۴۵	اشعار	—	۱۰۰
۵۲۶	روضه الصفا	—	۲۱۵	۵۴۶	تاریخ	—	۱۰۰

ردیف	نام کتاب / تاریخ	مجموعه	صف	تاریخ	نام کتاب / تاریخ	مجموعه	ردیف
۵۳۵	مجموعه‌های طبی	مجموعه قاسم	۱۵۰	۵۹۵	خسرو شیرین	جای	۵۰۰
۵۳۶	طب	-	۲۰۰	۵۹۶	راگ درین رنگ	غنیم الله قادری	۱۰۰
۵۳۷	گلشن راز / ۱۱۶۸	-	۱۰۰	۵۹۷	صحیح البطانی	محمد صمد الله	۲۰۰
۵۳۸	کافیه صرف و نحو	-	۶۲	۵۹۸	علوم / ۱۸۸	-	۱۰۰
۵۳۹	مراج الارواح	امان الله طعناظ	۵۰	۵۹۹	انوار حکمت / ۱۱۳۲	عبدالله انصاری	۴۰
۵۴۰	تحفة العارفين	راک صاحب هرنال	۱۰۰	۵۴۰	تاریخ	-	۲۰۰
۵۴۱	اشعار	-	۲۰۰	۵۴۱	فالنامه	-	۵۰
۵۴۲	رساله در تصوف	-	۱۵۰	۵۴۲	تاریخ	-	۲۰
۵۴۳	شرح اسماء الحسنی	-	۱۵۰	۲۷۲	نجوم	محمد حسینی	۲۰۰
۵۴۴	روایات	-	۳۰۰	۵۴۳	نجوم	-	۵۰
۵۴۵	دیوان حافظ	حافظ شیرازی	۱۰۰	۵۴۵	نجوم	-	۵۰
۵۴۶	مثنوی معنوی	مولانا جلال الدین رومی	۲۰۰	۵۴۶	حکایات و اشعار	-	۱۰۰
۵۴۷	اشعار	-	۱۰۰	۵۴۷	اشعار	-	۱۰۰
۵۴۸	زائچ طالع شایع جهان نجوم	شهاب الدین محمد	۲۰۰	۵۴۸	اشعار	-	۲
۵۴۹	اقالیم سبعه / ۱۱۶۸	-	۲۰۰	۵۴۹	تاریخ	-	۳۰۰
۵۵۰	لیلی و مجنون	نظایم گوی	۲۰۰	۵۵۰	گلستان سعدی / ۱۸۴۲	سعدی شیرازی	۲۰۰
۵۵۱	دستور العمل قانون	فخرالدین	۲۰۰	۵۵۱	عربی جاوید / ۱۹۲۴	دکتر عبدالحق	۵۰
۵۵۲	اشعار	-	۱۵۰	۵۵۲	نور الفرقان / ۱۹۲۵	-	۵۰
۵۵۳	دیوان میرزا محمد حسین	میرزا محمد حسین	۱۰۰	۵۵۳	محرمی لو	-	۱۰۰
۵۵۴	منیر زی طب	محمد معری	۱۵۰	۵۵۴	مثنوی / ۱۱۵۵	رومی	۳۰۰

نمبر شمار	نام کتاب تاریخ	نام مصنف	دقیق	نمبر شمار	نام کتاب تاریخ	نام مصنف	دقیق
۵۸۵	قصیده	خواجہ اسماعیل صفہانی	۲۵۰	۹۰۵	کتاب انشاء/۱۳۳۶	—	۱۰۰
۵۸۶	قصیدہ لقیانی	—	۳۰۰	۹۰۶	اشعار عاشقانہ	—	۱۰۰
۵۸۷	قرآن	—	۴۰۰	۹۰۷	اشعار	—	۵۰
۵۸۸	قرآن	—	۲۱۸	۹۰۸	انشاء مسیحی/۱۲۸۰	محمد مسیح بندوای	۳۰۰
۵۸۹	مہاجرات	—	۲۱۸	۹۰۹	اشعار	دیوان ولی	۵۰
۵۹۰	تصوف/۲۵۰	—	۱۰۰	۹۱۰	دستور العقلا/۱۱۰۰	محمد	۱۵۰
۵۹۱	مکتبہ مالای	—	۲۳۵	۹۱۱	شرح سفر پلہوری	—	۴۰۰
۵۹۲	شامل کافی/۱۱۷۱	—	۲۰۰	۹۱۲	انیس العشاق/۳۱۳۶	حسن رائی	۴۰
۵۹۳	گلستان بوستان سعدی	سعدی شیرازی	۱۱۹	۹۱۳	دیوان لاکھوری	عمود لاہوری	۵۰
۵۹۴	شہنشاہ فرودسی	فرودسی	۵۰۰	۹۱۴	کرمیا	سعدی	۵۰
۵۹۵	تحریر حسن شاہ دکن	پور آل خیمہ	۴۹	۹۱۵	طلبستان	محمد خان	۲۰۰
۵۹۶	حکایات	—	۱۰۰	۹۱۶	اخلاق	—	۴۰۰
۵۹۷	قرآن	—	۵۰۰	۹۱۷	خزانہ عبادت/۳۵۷	شاہ محمد قدس اللہ	۵۰۰
۵۹۸	سراج الانتخاب/۱۳۰۶	دکتر عبدالحق	۲۰۰	۹۱۸	اشعار	—	۲۰۰
۵۹۹	توامع الکلام	محمد حسین محدث گریڈیاز	۵۰۰	۹۱۹	انشاء و گلشہاء/۱۲۷۶	—	۱۰۰
۶۰۰	شرح قرآن	حضرت نورالحق دہلوی	۱۰۰	۹۲۰	شرح ابوالفضل	ابوالفضل	۲۰۰
۶۰۱	مجموعہ رنگین	رنگین	۴۰۰	۹۲۱	فقہ الہیات	—	۳۰۰
۶۰۲	دیوان فدائی	فدائی	۱۰۰	۹۲۲	رسالہ امام غزالی	امام غزالی	۱۰۰
۶۰۳	رسالہ ستور زبان فدائی	عبدالحق	۱۰۰	۹۲۳	دربارہ روح	—	—
۶۰۴	دستراطل ابوالفضل	ابوالفضل	۱۰۰	۹۲۴	دیوان ولی	ولی خان	۵۰

ردیف	مکتب / تصحیح	مکتب / تصحیح	ردیف	مکتب / تصحیح	مکتب / تصحیح	ردیف
۶۲۴	قانون مجتبی	سید احمد	۲۰۰	۶۱۵	اشعار	۱۰۰
۶۲۵	شرح مکتب	سیدی	۱۰۰	۶۳۶	دیوان برین / ۱۰۹۲	خداآبادی برین
۶۲۶	نجوم	-	۱۰۰	۶۳۷	اشعار / ۱۸۳۲	-
۶۲۷	مکتب	سیدی	۲۰۰	۶۳۸	خسر و شیرین	نظم
۶۲۸	شرح قواعد	-	۱۰۰	۶۳۹	مکاتیب و قرائین	ایمان بخش
۶۲۹	جواهر الاسرار / ۱۰۹۲	آذری	۲۵۰	۶۴۰	اخلاقی	-
۶۳۰	نسیم بهار / ۱۱۵۱	محمد درویش	۱۰۰	۶۴۱	اخلاقی / ۱۰۹۱	عبدالحق
۶۳۱	مکتب / ۱۲۵۲	سیدی	۲۰۰	۶۴۲	دیوان مجذوب	-
۶۳۲	بهار دانش / ۱۲۹۳	ملک الوهاب	۶۰۰	۶۴۳	وقائع نعمت خان عالی / ۱۸۳۹	نعمت خان عالی
۶۳۳	وقائع نعمت خان علی / ۱۲۵۲	نعمت خان عالی	۱۵۰	۶۴۴	شرح طالع نعمت خان / ۱۱۸۹	غلام علی مداح
۶۳۴	وقائع نعمت خان	-	۱۱۲	۶۴۵	دیوان حافظ / ۱۵۵۲	حافظ شیرازی
۶۳۵	وقائع نعمت خان	-	۲۰۰	۶۴۶	دیوان شمع علی	شمع علی
۶۳۶	لذات مالک غیر	-	۳۰۰	۶۴۷	دیوان حافظ / ۱۸۵۲	حافظ شیرازی
۶۳۷	در جاپان	-	۲۰۰	۶۴۸	مجموعه رساله تعویف	-
۶۳۸	وصف الامام	-	۲۰۰	۶۴۹	زور وحدت	خواجه عبدالله غفری
۶۳۹	شرح مختصر عقین	عبد السلام	۲۰۰	۶۵۰	غزلان الهند / ۱۲۳۸	میر غلام علی آرکو بگلرای
۶۴۰	خلاصه التوائج / ۱۲۰۹	لاجوری	۵۰۰	۶۵۱	دافع الاغلاط / ۱۲۹۸	ایمان الله
۶۴۱	دیوان خسر کمالی	خسر کمال حاجی مصطفی	۲۰۰	۶۵۲	انوار السی / ۱۸۰۰	-
۶۴۲	شعری / ۱۲۰۰	مولانا روم	۲۰۰	۶۵۳	مکتب شاه شاهرخ	مکتب شاه شاهرخ
۶۴۳	تنبیه القالین / ۱۲۵۰	محمد اسلم	۲۰۰	۶۵۴	مکتب سیدی	سیدی شیرازی
۶۴۴	اشعار	-	۵۰	۶۵۵	چهار عنصر	میرزا محمد ابراهیم
۶۴۵	شرف العلم والعلوم	-	۲۰۰	۶۵۶	شرح غزالی	غزالی

۱- ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹،

شہابان اودھ کے کتب خانے

مترجم و مرتبہ: محمد اکرام چغتائی، ناشر: انجمن ترقی اردو دہلی، قیمت: ۵۰ روپے۔

ہندوستانی زبان و ادب پر کام کرنے والے مستشرقین کی فہرست میں ڈاکٹر الانزاسپرنگر کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ موصوف کی علمی بصیرت اور ادبی ذوق نے انھیں اپنے دور کی قلمی شخصیت بنا دیا تھا۔ علم طب و عربی ادب پر دسترس کے ساتھ ہی ساتھ اردو زبان و ادب سے ان کی گہری وابستگی اس بات کا ثبوت ہے کہ انھیں ادب اور تعلقات ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ ان کے تحقیقی کارناموں میں ”فہرست مخطوطات شہابان اودھ“ اپنی افادیت اور اہمیت کے لحاظ سے اردو میں مخطوطات پر کام کرنے والوں کیلئے شعل راہ ہے۔ اسپرنگر نے مخطوطات کی اس فہرست کو چھ سات جلدوں میں شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن اپنی ناسازی طبع اور دیگر وجوہ کی بنا پر اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ اس فہرست کی صرف جلد اول ہی زیور طبع سے آراستہ ہو پائی۔ اسپرنگر نے جو مکمل فہرست بنائی تھی اس کا مسودہ بھی امتداد زمانہ کی نذر ہو گیا۔ اودھ کے اس بیش بہا ذخیرہ کتب کے بارے میں ہماری معلومات کا ایک ذریعہ اسپرنگر کی وہ رپورٹ ہے جو اس نے مسٹر ہنری ایلیٹ کو جون ۱۸۴۸ء تا مارچ ۱۸۴۹ء میں روانہ کی تھی۔

زیر نظر کتاب ”شہابان اودھ کے کتب خانے“ ڈاکٹر اسپرنگر کی رپورٹوں کا ترجمہ ہے۔ ان رپورٹوں کو

یکجا کر کے ۱۸۹۸ء میں ”Report of the Research into the Mohammaden Libraries of Oudh“ کے نام سے شائع کیا گیا۔ محمد اکرام چغتائی نے بڑی محنت اور تحقیق کے ساتھ اس رپورٹ

کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ اسپرنگر نے اس رپورٹ میں جن مخطوطات کا ذکر کیا ہے، مترجم نے ان کی شرح و بسط کیلئے بڑی دقت نظری سے حواشی تحریر کئے ہیں۔ اسپرنگر کی رپورٹ کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن مرتبہ نے مقدمہ اور تعلیقات کے ذریعے جو قیام معلومات قاری تک پہنچائی ہیں، ان کی ادبی قدر

وجہیت نے اسپینگر کی اس رپورٹ کو ایک ادبی دستاویز بنا دیا ہے۔ مقدمہ میں مترجم نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ فارسی اسپینگر کی سوانح، اس کے علمی و ادبی سفر سے واقف ہو جائے، نیز اس نے اودھ کے نوابین کے ادبی ذوق اور ادب کی سرپرستی کا حقیقہانہ جائزہ بھی لیا ہے۔ اس کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہے۔ لیکن بعض تسامحات کی طرف توجہ دے کر کہہ سکتے ہیں مثلاً مرتب نے تحریر کیا ہے کہ ڈاکٹر اسپینگر کو ۱۸۴۰ء میں میڈسن کی ڈگری ملی جبکہ M. D. کی ڈگری اس نے ۱۸۴۱ء میں لیڈن یونیورسٹی سے حاصل کی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنا مقالہ ۱۸۴۰ء کے اواخر میں داخل کیا ہو اور اسی بنا پر کہ اکرام صاحب نے سنہ مذکور تحریر کر دیا ہو۔ ایک جگہ اسپینگر کی گریمر پر تبصرہ کرتے ہوئے مترجم لکھتا ہے :

"سراج گزیرین نے لنکوسٹ سروے آف انڈیا کی جلد ہفتم (حصہ اول) میں اردو

قواعد کی بہت سی قدیم مطبوعات کا ذکر کیا ہے لیکن اس جامع فہرست میں مذکورہ گریمر شامل

نہیں۔ ان کے علاوہ کسی اور محقق نے بھی اسپینگر کی اس تصنیف کا حوالہ نہیں دیا۔"

شاید مترجم کی نظر سے لکینڈی "ڈکشنری آف انڈین لائو گرافی" اور سنڈنی لی کی "ڈکشنری آف نیشنل باؤ گرافی" نہیں گزریں اور نہ انھیں یہ شکایت نہ رہتی۔ یک لینڈ نے تو اسپینگر کی تصنیفات کی فہرست ہی اس گرامر سے شروع کی ہے۔

اس کتاب میں ان عربی، فارسی، ترکی اور پشتو مخطوطات کا ذکر ہے جو شائع شدہ فہرست کی جلد اول

میں نہیں ہیں۔ اس کے اندراجات میں انگریزی سے فارسی تراجم، طب اور کیمیا، تصوف اور اخلاقیات، سنسکرت اور ہندی کتب کے فارسی تراجم، پشتو اور عربی کتب، ریاضیات، تاریخ جغرافیہ، لغت، فنیسی اور فن شعر گوئی شامل ہیں۔ اس طرح یہ کتاب اپنی کم جمی کے باوجود بڑی اہم ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر اسے اسپینگر کے کھلاک کا ضمیمہ کہاجائے تو بیجا نہ ہوگا۔

کتاب گٹ اپ کی سادگی اور نفاست کے لحاظ سے جاذب نظر ہے۔ کتابت بھی اچھی ہے۔ بعض جگہ ایک آدھ لفظ سہو کا تب کی نذر ہو گیا ہے۔ اس کی ذمہ داری نہ کتاب پر ہے اور نہ ہی صحیح پر بلکہ ایسا تو فارسی کے ذوق سلیم اور اس کی حقیقتانہ بصیرت کے امتحان کے لیے ضروری ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی کمیوں کو اگر نظر انداز نہ بھی کیا جائے تو اس سے کتاب کی قدر و قیمت پر کوئی حرج نہیں آتا ہے۔ اپنے مواد کی اہمیت اور طباعت کی نفاست کی بنا پر شاہان اودھ کے کتب خانے "اچھی کتاب ہے اور مترجم لائق ستائش ہے۔"

●●

تذکرہ بزم شمال۔ ایک جائزہ

تذکرہ نگاری کی روایت ہمارے یہاں بہت قدیم ہے۔ اس کی کائنات میں نہ تو تنوع کی کمی ہے اور نہ رنگ و بو کی۔ تذکروں کی وسیع اور رنگارنگ دنیا میں تذکرہ بزم شمال ایک اضافہ ہے۔

تذکرہ نگاری بھی ایک فن ہے اور اس میں تحقیق و تنقید کی ایک دنیا آباد ہے۔ شروع ہی سے تذکرے اپنی وسعت کے اعتبار سے دو طرح کے ملتے ہیں۔ اول ایسے تذکرے جو عمومی ہوتے تھے۔ اس میں از ابتدا تا زمانہ حال حتیٰ الوسیع تمام شاعروں کے احوال و اشعار ملتے ہیں۔ اور اسی پنج پر کچھ ایسے تذکرے بھی لکھے گئے جو کسی خاص علاقے، صوبے اور شہر کے شاعروں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں، دونوں طرح کے تذکرے اہم ہیں اور ہماری ادبی تاریخ، تنقید اور تحقیق کے ناگزیر زینے ہیں۔

تذکرہ بزم شمال سچا شادان فاروقی صاحب کی پہلی کاوش ہے۔ شادان صاحب درجہ پنجم کے باشندہ ہیں۔ اس تذکرہ کو انہوں نے بہار میں رہتے ہوئے والی گنگا کے شمالی علاقے کے شعرا پر مبنی رکھا ہے۔

یہ اردو آبادی کا ہندوستان گیر پہلے پر سب سے بڑا علاقہ ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے ۱۹۶۷ء میں "ہماری زبان" کے ایک شمارے میں ہندوستان کی اردو آبادی کا ایک نقشہ پیش کیا تھا۔ اس میں ملتان، لاہور، کراچی، کوارڈ کا آبادی کے اعتبار سے سب سے بڑا خطہ قرار دیا اور متحدہ پولیور کو دوسرے اور درجہ پنجم کو تیسرے نمبر پر۔ اس طرح یہ علاقہ اردو آبادی کے اعتبار سے ہندوستان کا سب سے بڑا خطہ ہے لیکن ان علاقوں پر بھوجپوری، بھیک، میتھلی، سرگاپوری اور بنگالی کے گہرے اثرات کی وجہ سے شعروادب کو زیادہ فروغ حاصل نہیں ہو سکا۔ اس کے علاوہ تذکرہ نویسوں اور محققوں نے بھی اس علاقے سے صرف نظر کیا ہے۔ صرف وہی اہل قلم آسمان ادب پر چمکے جنہیں نظر انداز کرنا مشکل تھا جو اس علاقے سے باہر مرکزی مقامات پر تھے۔ وہ اپنے کو نمایاں کرنے

کی سہی بہم میں لگے رہے۔

میں نے اپنے ایک معنون بسل درجنگوی — مطبوزبان وادب ۱۹۸۱ء میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بسل درجنگوی کا دیوان پلٹے سے جاب حقیر قاضی سرگودی ایڈیٹر البیع کی ترتیب و ترتیب کے ساتھ ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا لیکن اس کا تذکرہ زوق فصیح الدین بطنی صاحب نے کیا اور زمین الدین دردانی صاحب نے تو پھر لالہ سہری رام کو معذور سمجھنے میں کوئی ہچک نہیں ہے جبکہ انہوں نے ۲۳ بسلوں کا تذکرہ کیا لیکن بسل درجنگوی کا تذکرہ ناپید ہے۔ غالباً اسی وجہ سے شاداں فاروقی نے پیش لفظ کے پہلے جملہ میں اس کا انکشاف کر دیا ہے:

”میرا تذکرہ بزم شمال ان گناہام اعجاز بیافون کا تذکرہ ہے جو شمالی بہار میں پروردان بڑھے۔“

یہ تذکرہ ۲۵ سال کی مسلسل تحقیق و تجسس کا ثمر ہے۔ پیش لفظ میں انہوں نے اس کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے جس سے پر روشنی بنتی ہے کہ محنت شاد اور جہد مسلسل سے مشکل کام کو بھی آسان کیا جاسکتا ہے۔

شکر گزار یوں کے لیے الگ عنوان قائم کر کے اعتراف تعاون کیا گیا ہے جو بکے خود ایک تذکرہ ہے جن کا مقصد غالباً جذبہ تعاون کو ابھارنا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے از اساتذہ تا تلامذہ ایک فہرست پیش کی ہے اور فرد آ فرد ہر شخص کا شکریہ ادا کیا ہے۔

یہ کتاب ڈیوائی سائز میں ۴۲۵ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ ہر صفحہ میں ۲۴ سطروں اور اوسطاً ۱۶ الفاظ ہیں۔ اس طرح اس میں تقریباً دو لاکھ آٹھ ہزار آٹھ سو چھیانوے الفاظ ہیں۔ ۲۳ صفحات پر اردو زبان کی لسانی تاریخ پر ایک مبسوط مقدمہ ہے۔ اس میں ۲۵۵ شاعروں کا تذکرہ ہے جو اب اس عالم کون و فساد سے نہات حاصل کر چکے ہیں۔ زندہ شاعروں کا حال حصہ دوم میں پیش کریں گے۔ اس سے تعین زمانہ و سنین میں تحقیق کرنے والوں کو توفیق ہوگی لیکن امتداد زمانہ کے دست و پا سے محفوظ کرنے کی ایک کوشش ہے۔

اردو ایک سیکولر زبان ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اعجاز حسین کی مختصر تاریخ ادب اردو کی ابتدا برہمن کے شروں سے ہوتی ہے اور شاداں صاحب کا تذکرہ شیخ عبداللہ کے تذکرے سے شروع ہوتا ہے جو برہمن زادہ تھے اور گھنشیام نام تھا۔ ۱۷۲۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کا واحد شاعر ملاحظہ ہو:

جھاڑی سے لوٹا بجھے اور برہمنوں سے طعنا گھنشیام سے عبداللہ بجھے یہ بدھنا کے نام

اس شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد میں شمالی بہار میں اردو زبان خاصی ترقی کر چکی تھی اور طرز ادا بھی بالیدہ ہو چکا تھا۔

مذکورہ بزم شمال، جو بہت سے شعراء لیے ہیں جن کا نمونہ کلام ہندو ہے، ماقبل مذکورہ نگاروں نے بھی کوئی نمونہ کلام پیش نہیں کیا ہے۔ کچھ کے قاری اشعار تبرکات پیش کیے گئے ہیں۔ لیکن زیادہ تر شعراء ایسے ہیں جن کے علاوہ زندگی پر خاصی روشنی پڑتی ہے انھان کے کلام دیدہ و دل کو شاد کام کرتے ہیں۔ تحفہ تذکروں، بیاضیں اور تعلقات کا سہارا لیکر اس کتاب کی تدوین کی گئی ہے۔ شاداں صاحب نے اس مذکورہ کے ذریعے شمالی بہار میں شعرو شاعری کی ایسی تاریخ پیش کر دی ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں چند اہم شعراء درج ذیل ہیں۔ حسن بخاری، ماسی چھری، سرناتھ، خواجہ عامر علی شہر، خواجہ محترم خان محترم، منشی آشاد رام ذوق، فرد درجنگوی، حسن چھری، حکیم چھری، مائل دھرم پوری، شاداب مظفر پوری، فقیر مظفر پوری، جنگ بہادر بسل درجنگوی، عظیم سیوانی، فطرت درجنگوی، تیر گوڑ گانی، اسیر درجنگوی، لطیف پوری، نواب سعادت علی خان، ماسی دے پوری، احقر مظفر پوری، رنگ جہازی پوری، مائل دھرم پوری، حیرت پوری، کوسلہ ناتھ، غلیل بریلوی، خیر حانی، ریاض حسن خیال، مظفر مظفر پوری، حکیم سوزان درجنگوی، محسن درجنگوی، رضا چھری، شاہ موتی پوری، توڑا ملاحی، ملا محمد جمیل مظہری، آتھی درجنگوی، جوہر سیوانی، رضا مظہری، قابل فوج ہیں۔ ان کی شاعری کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ جمیل مظہری، ہندستان گیر پانے پر شہرت کے حامل تھے۔ کتابت و طباعت کی کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں۔ غلطنامہ بھی آخر میں دیا گیا ہے۔ شاعروں، اکتوں، مقامات وغیرہ کے ناموں میں غلطی سے اشکال پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ لفظی اگر اثبات اور اثبات نفی ہو گئی ہے تو بھی نشاندہی کرنی ضروری ہے ورنہ دیگر غلطیاں قابل فوج اس لیے نہیں ہیں کہ اسے بہر حال صاحب نظر قاری ہی پڑھتے ہیں۔

مذکورہ بزم شمال کا سب سے اہم اور ذریعہ حصہ اس کا مقدمہ ہے۔ اس میں انہوں نے اردو زبان کی تشکیل کی تاریخ پیش کی ہے اور ساتھ ہی شمالی بہار میں اردو زبان کے ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ عرض حال میں خود فرماتے ہیں۔ "میں نے کتاب کی جلد اول کے آغاز میں ایک طویل مقدمہ لکھ کر شامل کیا ہے۔ اس میں زبان اور اس کی مکمل تاریخ پیش کرتے ہوئے اردو کی ابتدا اور ہندستان کے مختلف حصوں میں اس کی زریج و اشاعت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پھر بہار اور خصوصاً شمالی بہار میں اس کا تدریجی ارتقاء ظاہر کیا گیا ہے اور درداغ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ شمالی بہار میں یہ کس طرح پروان چڑھی۔ (ص ۵)

شاداں فاروقی صاحب نے ہندستان میں مختلف زمانوں میں مختلف آریوں کی آمد کے متعلق بڑی

صراحت اور صفائی سے لکھا ہے۔ اس سلسلے میں اُن کا ذہن بالکل صاف ہے۔ آخر میں اس فیصلے پر پہنچتے ہیں:

”اردو زبان کے آغاز کا عہد متعین کرنا محال ہے لیکن اتنا تو کہا ہی جاسکتا ہے

کہ یہ زبان برج بھاشا کے علاقے میں بولی جانے والی بھاشا اور عربی فارسی کے اختلاط

سے ہی وجود میں آئی اور اڈل اڈل ریختہ سے موسوم ہوئی۔ اس نے اور بھی دو مہر چا کر لو

کی آمیزش سے اپنا روپ نکھارا اور مغربی ہندستان کو نوازقی ہوئی کھڑی بولی سے

ہم کنار ہوئی اور اس میں وہ رنگ و روغن بھرے جس نے اس کے روشن پہلو کو

نمایاں طور پر نمود کر دیا۔ برج بھاشا کے اختلاط یا بہنے اُسے سنوارا۔ (ص ۱۹)

اس حصے کی وضاحت کچھ اور ہوئی چاہیے تھی کہ مختلف زبانوں نے کس طرح اردو کو سنوارا۔ خصوصاً برج بھاشا

اور کھڑی بولی نے پنجابی کے اثر کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔ اگر وہ اسے تسلیم نہیں کرتے تو محمود شیرانی کے

نظریہ کو رد کرنا چاہیے تھا۔ اسی طرح دکنی اور گجری وغیرہ کے اثرات کا بھی ذکر کرنا چاہیے تھا یا اپنے خیال کی

وضاحت کرنی چاہیے تھی کہ برج بھاشا اور کھڑی بولی کے علاوہ کسی دوسرے اثرات کو وہ کیوں قبول نہیں کرتے۔

میرے خیال میں سب سے وہ تمام نظریے محل نظر میں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو کسی خاص خطے میں

کسی خاص زبان کے زیر اثر پردان چڑھی۔ بلکہ اردو بیک وقت مختلف علاقوں میں وہاں کی بیا کر توں اور

اپ بھرنشوں کے سہارے تشکیل کی منزلوں سے گزری۔ جیل جالبی نے اپنی گرانقدر کتاب ’تاریخ ادب اردو‘

جلد اول میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

جیل جالبی کی ’تاریخ ادب اردو‘ کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا اور اختر درینوی صاحب

کے مقالات کے مجموعہ تحقیق و فلسفہ میں شان ایک مفتون کتابی شکل میں فروری ۱۹۶۱ء میں آگیا تھا۔ جیل جالبی

نے اردو زبان کی تشکیل کے اس نظریے کو اختر درینوی سے اخذ کیا ہے۔ لیکن کہیں بھی اُن کا تذکرہ نہیں

کیا اور نہ سوال ہی دیا۔

حقیقت تو یہی ہے کہ جب سنسکرت سے پلاکرت اپ بھرنش بنی یا سنسکرت کے مقابلے میں

اپ بھرنش پانی کو قبولیت عام ہوئی۔ اُسی وقت اردو کی اساس پڑ چکی تھی۔ اور یہ عمل کم و بیش ہر صوبہ میں

جاری تھا۔ سنسکرت کے قسم کے مقابلے میں عوام کے بولنے کی آسانی کے اعتبار سے تدبیر کا استعمال کیا جیسے انجھیر

کے مقابلے میں اکھنڈ یا وہ آسان تھا اور اُسے ہی فروغ ہوا۔ اور یہی مزاج اردو کا ہے۔ اس طرح کی مثالیں

جس طرح ایک عرصہ تک صرف پانچ پتر کی تاریخ ہی سارے ہندستان کی تاریخ مانی گئی بعد میں مختلف علاقوں کی تاریخیں ڈھونڈی گئیں اور اس میں ربط قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسی طرح ایک عرصہ تک مولانا محمد حسین آزاد کا یہ خیال گوارہ و برج بھاشا سے نکلی۔ حرف اول بنا رہا۔ اس کے بعد محمود شیرانی نے پنجاب کو اس کا مولد و مسکن بتایا۔ نصیر الدین ایشمی نے دکن کو یہ فضیلت بخشی۔ ظہیر الدین مدنی نے گجرات کو، مسعود حسین خان نے کھڑی بولی پر اس کی اساس قائم کر کے دہلی اور نواح دہلی کو اس کا اصلی وطن قرار دیا۔ حالانکہ اردو کی تشکیل سارے صوبوں میں ہو رہی تھی۔ ترقی کی رفتار میں کمی یا بیشی مانی جاسکتی ہے۔ اردو ہر عہد میں نمودیر رہی ہے۔ صوتی اعتبار سے لچیلی اور سیال بھی رہی ہے۔ علاقائی اور صوبائی زبانیں جو ابھی رائج ہیں۔ دراصل اردو زبان کے سفر ارتقاء کی منزلیں ہیں۔ مختلف اپ بھرنشوں نے جب سنسکرت سے دور رہ کر ادب و شعری تخلیق کا کام شروع کر دیا تو کچھ کثرت شعری سنسکرت کے ماحلوں نے سنسکرت کے ساتھ اس کو بھی اچک لیا۔ اور اپنی حاکمیت و ربوبیت کو قائم رکھنے کے لیے اس کے ساتھ بھی اس طرح چپک گئے جس طرح سنسکرت کے ساتھ اس منزل پر پہنچ کر اردو نے اپنا سفر پھر آگے شروع کر دیا۔ اور یہ سفر ہمیشہ جاری رہے گا بلکہ خود ہندی جس طرح سنسکرت کے قسم الفاظ اور صوتی مشکلات سے پُر ہوتی جا رہی ہے وہ اردو کے سفر کی ایک گزری ہوئی منزل ثابت ہوگی۔

یہی حقیقت سرچرچہ کر بول رہی ہے جب ہندی میں ہم آج کل اردو کے الفاظ اور تہجیب کی بہت سی دیکھتے ہیں۔ خصوصاً رابطہ عام کی ہندی خاصی اردو آمیز ہو گئی۔

شادان فاروقی صاحب نے بھی آخر صاحب کی کتاب ”بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء“ سے قدم قدم پر استفادہ کیا ہے لیکن انہیں کے مضمون ”بولیوں کے سنگم“ سے مستفیض نہیں ہو سکے۔

شادان صاحب نے متحلا میں اردو کے آغاز کی نشاندہی و دیا جی سے کی ہے اور ان کی منظومات، تصنیفات کرتی آتا اور کرتی پتا کانسے کچھ اشعار پیش کیے ہیں جن میں اردو اور فارسی الفاظ ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ جو نیور کے فرزند سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے ۱۴۰۲ء میں ترمہت پر قبضہ کر لیا۔ اسی کی شان میں یہ دونوں کتابیں ہیں۔ شادان صاحب کو اس سے قبل کی تعانیف پر بھی نگاہ ڈالنی چاہیے تھی۔ اس لیے دریا جی کے یہاں یکایک یہ الفاظ کس طرح آ گئے۔ اس طرح انہوں نے میتھی زبان کی تشکیل سے قبل کی

منزل ہے ادب ہے کہا جا رہا ہے اس پر بھی کوئی روشنی نہیں نکالی جیسے:

तिहुअण खेतहि काजि तसुकिजि वलिनू पसेई

अकस्वर- स्वम्याम्म जओ मंचा वन्धिण देई

میں اکھر سے اکھر سمجھ کر پڑھا، اس طرح کتا کھا کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اس دوہے کی زبان خالص ادب ہے اور سنسکرت کی بگڑی شکل ہے۔ سنسکرت کے دو الفاظ جو ثقیل اور قریب الحار ہیں تھے تھے اسے تدبیر کی طرف آگے اور وہی مقبول ہوئے۔

یہ تبدیلی اردو کی تشکیل کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس لیے جس طرح دو یا تین پر ہندی میٹھی والے اپنا حق جتانے ہیں، اسی طرح اردو دالوں کو بھی ان کے پہلے، خالص اور اراد و آمیز کلام کو اپنا لینا چاہیے۔

”نیرنگ خیال“ کا زمانہ و نمبر

مکتبہ نیکو کار، لاہور، پاکستان

حکیم یوسف حسن کے اداسی سے یا جیسا کہ اس کا مزان ہے۔ ”نیرنگ خیال“ مسلمانانِ برتر آئی ہوئی مقالہ، اختصار
”لیدر کے قلم“ ہیں۔ اس خصوصی اشاعت کو مرتب کرنے کی تجویز کے بارے میں بعض معلوم ہوتے ہیں کہ یہ خیال در سال کے اہل ہندو قلم
و شائستہ نے پیش کیا۔ اداسی نے ابتداً اس خاص نمبر کا اعلان کرنے کے بعد یہ مآثر ہندوؤں کے مشہور و بارہ ہر ایک تقریب
پر شائع کیا۔ اس طویل اداسی کی ذیلی سرخیوں (۱) مسلمانوں کی وطن سے محبت (۲) ہندی مسلمانوں کا وطن ہندستان ہے (۳) آباد
خیال ہندوؤں کے اسلام کے متعلق خیالات (۴) مظلوم و مشغور رنگارنگوں سے اقتباسات (۵) نمانانِ بزرگِ مروت (۶) اور (۷) آخری
گزارش کے اقامتِ شعلہ اور پراہنہ امارت موجود ہیں۔

فاضلِ مدبر رسالہ کو خاص خاص موضوعات پر ایک نمبر وقفہ کے ہندستان بھر کے ادبا و شاعرے تحریریں حاصل کرنے اور
نمارہ ترتیب دینے کا ذوق و شوق بھی تھا اور فکر بھی۔ ایس خاص خاص اشاعتیں اپنے اپنے مآثرات پر اذیت و سبقت کی حامل
ہو کر آتی تھیں جیسا کہ ذہنِ نظر تلے اور از اس بعد اقبال کی زندگی میں ۱۹۲۳ء میں مطبوعہ اولین اقبالِ بزرگ سے بھی ثابت ہوا۔ حکیم
صاحب ان بڑوں کی پیشکش کے فکرات پہلے نے بعض مآثرات کو اور بے شکفانہ انداز میں مکتبی ڈاک کے ذریعے اپنے وقت کو پورے مکتبی مآثرات
کے ساتھ پہلے ملکہ پر واضح کیا کہ ”مآثرانِ بزرگ ہر مآثرات پر انھوں نے جو تاثرات تحریر کیے وہ اس مضمر کے آخری برسوں کی بھی
صوت حال کا سرور و شادمانی ہیں، چنانچہ ان وقتوں کے سیاسی و سماجی تناظر میں ان کے مسبقہ بل افغانا میں حکیم صاحب کے غلوں کے
مآثرات آج بھی مسوس کی جاکتی ہے اور ان خیالات سے اختلاف ممکن نہیں کہ مسلمانوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے ہندو بھائیوں کے
متعلق اپنی مملکت کو بھائیوں کے بزرگوں کے گناہوں سے واقف ہوں اور پہلے دوسرے کے بزرگوں کی عزت کرنے سے ملک
میں امن و امان ہونے کا زیادہ امکان پیدا ہوتا ہے۔ ”نیرنگ خیال“ کی یہ کوشش آپ کے سامنے ہے۔ اس میں ہندو مذہب، اس کی
بعض روایات اور ان کے ایک مشہور و بزرگ نام چندر بھائی مہاتما کی چون چڑھش کیا گیا ہے۔ یہ تمام مضامین آری کی اندھی اور مسلمی
ملک میں لکھے گئے ہیں۔ ہندو اخبارات اس سے خیم و دھرم و برہما نام بزرگ شائع کرنے کی مادی ہیں لیکن اس پائے کے طبعی اہلِ مضامین

کے مقاصد اور مقبولوں میں سے ایک تھے۔ اسی طرح ایک اور سال ۱۸۸۷ء میں ان کے متعلق مضامین طبع ہو کر نئے دور میں نے جنوری ۱۹۲۲ء میں اپنا مفید سفر بھی شاخ کیا تھا۔ روزنامہ تجھ نے مدد ستمبر ۱۹۲۳ء کو کرشن بھڑے طبع کیا تھا۔ غالباً یہ انہی اخباری ایڈیٹروں سے زیادہ اعلیٰ مضامین کا مجموعہ تھا۔ غالباً ان تاریخوں سے قبل وہ بعد کے قریب مرے میں ایک اور رسلے ہندو سہلیک کا آرام چرچا بہتر بھی شاخ شدہ ہے جس کے طبع مقام کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ افسوس کہ تعاقب نظر کی خاطر ان نادر و اایاب خصوصاً ہندو طالعہ اذ اشاعتوں سے استفادہ بالکل غیر ممکن رہا ہے کیوں کہ یہ ہم دست ہی نہ ہو سکی ہیں۔

ان ابتدائی کلمات کے بعد اب ملاحظہ کیجئے "بزرگ خیال" کے "رمانن بزرگ" تفصیلات اس غرض سے اس شمار خاص کے شری مضامین کا پہلے تعارف کرایا رہا ہے جس کے بعد رمانن منظومات کی مناسبت سے ان کا ذکر کیا کر دیا جائے گا۔ مقالات کو منسلک کرنے سے قبل یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ان کی تحریر میں نہ تو موضوعاتی مناسبتوں کو ردوار کیا گیا ہے اور نہ ہی تازہ ترین ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس خصوصاً اور قابل فخر پیشکش کا مجموعی منظر بڑا غیر مرتب بلکہ منتشر سا ہو گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ نام کی سیرت یا رمانن کے سنسکرت اور بھاشا کے ستون اور اس کے ترجمین پر متعلقہ تحریروں کو سلسلہ وار شریک کیا جاسکتا تھا لیکن اس تناظر میں اس پر متعلقہ سے کی گئی جو دراصل رمانن کے صد پارہ سے بعد کے ہندی متن کے مصنف تھے۔ یا اس پر مبنی رمانن "میں" رمانن بزرگ کی اپنی ترتیب قائم رکھی گئی ہے۔ اس خاص نمبر سے جس جو ماننے پانچ ہزار کی غیر معمولی تعداد میں شاخ شدہ ہے کچھ غیر متعلقہ سی انشائیاتی و منظوم نگارشاتیں بھی درج ہیں۔ اس نوع مشمولات کی کثرت یہ ہے، غزل از ممتاز رفیع بیگم، انشاء "انتقام قدرت از عبدالستیم کلام سہا، افغانہ، "فاحد گل" از شریعت سید ابوبی ترجم غلام عباس، "ثریا" ایک معاشرتی ناول از نذر جہاد حید (چٹا باب)، فارسی غزل از فیض علی علی نقی، "رمانن" کے مصنف گو سائیں داس جی : از لالہ بال کشن بہتر وکیل ملتان، صفحات ۱۶۵، ۱۶۶، بھاشا کے انشائیاتی متن موسومہ "تلسی رمانن" کے مولف کی مختصر سوانح مصنف نے ویدوں نیز ہرمانوں اور شاستروں کی روایات کی مدد سے قدیم سنسکرت، پانچک رمانن، "کانیا اور مقبول عام ہندی روپ اکبر کے دور میں تیار کیا۔ مختصر حالات زندگی کے بعد اس رمانن "کاتھارن ان افغانا میں کر لیا ہے۔"

"گو سائیں تلسی داس جی نے بھاشا میں "رمانن" لکھی ہے جس کے اعلیٰ تفصیلات و شاعرانہ جواہر ہم نے اب تک پڑھنے والوں کے سامنے خیال کو لا لال کر رہے ہیں۔ اس میں پاروں وید، انعام پران، کھٹ شاستر اور مہاتما وید کے خیالات کا غور و نہایت ہی اعلیٰ طریق پر قلم بند کر دیا گیا ہے۔ "رمانن" کے علاوہ "دستہ قرہ" نامی آپ کے جوتوں کی کتاب نہایت ہی شہسود ہے۔

"تلسی داس کی رام بھگتی اور اس کے تحریر کی انعامات کا بڑا اثر علامہ نیاز فتح پوری نے اپنی مختصر تصنیف "ہندی شاعری کی تاریخ" کے ایک جز جو سومرہ تلسی داس اور رام پرست طبقہ میں لیا ہے۔ یہ حصہ کتاب شام کی شخص وادبی سوانح کے علاوہ ساتویں

اھم ہیں کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور یہاں پر یہ لکھا تھا ہے کہ کسی سے اس کا ایک شہر شاگرد جین ملاح سے تھا۔
 ۱۰۰۰ء سے کسی سے اس کے ملک کے کرا کے اس کا نام گولڈن پورہ رکھا۔ کسی سے اس کی خوردنوشت کے نالے سے ہندی شکر
 جزوی سے بدو و جیش دیال سریز تو کتاہاف کسی سے اس کی خوردنوشت کے نالے سے بدو و جیش دیال سریز تو کتاہاف
 اھم کریں کے ساتھ (آئندہ) کے ساتھ آتا ہے۔

۲۔ مہاراج رام چندر جی کے گرد اور پر ایک سرسری نظر: درتلیبہ دی سفات (۱۹-۲۱) ایک ہندوستانی
 مسلمان کے نظر سے کسی سے اس کے ملک کے کرا کے اس کا نام گولڈن پورہ رکھا۔ کسی سے اس کی خوردنوشت کے نالے سے ہندی شکر
 جزوی سے بدو و جیش دیال سریز تو کتاہاف کسی سے اس کی خوردنوشت کے نالے سے بدو و جیش دیال سریز تو کتاہاف
 اھم کریں کے ساتھ (آئندہ) کے ساتھ آتا ہے۔

۳۔ مہاراج رام چندر جی کے گرد اور پر ایک سرسری نظر: درتلیبہ دی سفات (۱۹-۲۱) ایک ہندوستانی
 مسلمان کے نظر سے کسی سے اس کے ملک کے کرا کے اس کا نام گولڈن پورہ رکھا۔ کسی سے اس کی خوردنوشت کے نالے سے ہندی شکر
 جزوی سے بدو و جیش دیال سریز تو کتاہاف کسی سے اس کی خوردنوشت کے نالے سے بدو و جیش دیال سریز تو کتاہاف
 اھم کریں کے ساتھ (آئندہ) کے ساتھ آتا ہے۔

کا مولف ہے۔ ہانگ ساگر کے دو ابواب کی اس طبعہ اشاعت کا مضمون عنوان شاید تاریخ ڈرامہ مالک ہندوستان، دیکھا گیا اور مولف راوی جان دھری کے اس خلاصے نے ہانگ ساگر کے اس حصے کی جو جگہ دکھائی دیتی ہے اس کا اصل کتاب کی تفسیر لکھتے کا اندازہ قائم کرنے میں بخوبی مدد ملتی ہے چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف ہندستان سے متعلق باب میں مبدع قدیم اور قدیم ہندی ڈرامے اور ڈرامہ نگار بزرگ مبدع جدید اور دور حاضرہ کے ذیلی عنوانات پر داد و تحسین دی گئی ہے۔

بھوجپوری اور اس کی دو بڑی تصنیفات "امین ادمو" اور "نام چتر پر" ہانگ ساگر کے تعارفی مضمون کے بقیہ مضمون کا مضمون زیر نظر خلاصہ راوی سے پیش ہے۔ "ساتویں صدی کے اختتام پر بھوجپوری ہندوستان کا سب سے بڑا ڈرامہ نگار ہو گیا۔ اکثر نقادوں کا خیال ہے کہ ہمسر خیال کرتے ہیں کہ اس کا دس سو ساٹھ کا وہ نقشہ پیش کرتا ہے جو اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ بھوجپوری اپنے ڈراموں سے اصلاح و تبلیغ کا کام لیتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ دنیا کو بہتر بنا کر سفر آخرت کرے۔ بھوجپوری جو کہ ایک برہمن کے گھر پیدا ہوا، ۱۲ سال کی عمر میں دربار قنوج میں ملازم ہو گیا۔ ساتویں صدی عیسوی میں کثیر کے ایک ٹیکہ نے قنوج پر حملہ کیا اور بہت سے اسیزین جنگ کو ہرا لانے میں سے ایک بھوجپوری ہی تھا۔ برسوں نہایت عورت و اکرام کے ساتھ زندگی بسر کر کے کثیر میں وفات پائی۔ اس نے حسب ذیل ڈرامے لکھے: "اتر رام چتر پر" بھوجپوری کی بہترین تصنیف خیال کیا جاتا ہے۔ اس میں رام چندر جی کے حالات زندگی ہیں جو تیسرے لکاکے بعد رونما ہوئے۔ "امین ادمو" کالی داس کی "مشکلات" و "کریم الاس" اور بھوجپوری کی "امین ادمو" کا اقتضا بہت کچھ ہے جو پرکرت کہاؤں کی ایک بہتر کتاب ہے۔ "امین ادمو" ایک سن ایٹ کا ڈرامہ روزمرہ واقعات پر مبنی ہے۔ امین اور ادمو کے عشق کی داستان بیان کرتے ہوئے ہندوستان کی معاشرت اور تمدن کی تصویر کشی دی ہے۔ (۱۹۱۱ء) یہ اقتباس اصل کتاب کے صفحہ ۳۷ پر بطور تلخیص آگئے۔

رامائن جزا شرق الہند میں : از مرزا فائق علی بیگ خیال مراد آبادی، ۱۳۱۶ء۔ موجودہ انڈونیشیا اور فیلیپائن کے لڑیچ میں قدیم و خدا دل رامائن متون سے اخذ روایات کا باہم دیگر مقابل و تجزیہ ہے۔ شکی عنوان "ایک معتقد علی مقالہ" لکھن ہے۔ اداسے کی طرف سے اضافہ ہوتا ہے تحقیق اس سبب اس سر کی وائی مصداق ہے۔ اصل موضوع ان جزا کے متعلقہ افادات کے اختلافی اور قرابتی نکات کا جائزہ ہے۔ چنانچہ انڈونیشی مصاد کے موضوعی تفصیلات و مثالوں سے تعریف کیا گیا ہے۔ ان مشترک اور متضاد امور و مسائل کا یہ بیان زیادہ مفید نہیں ہے لیکن اختصار کے باوجود تحقیق و استفاد کا عمدہ نمونہ ہے اور لکھن ہے کہ ہم دست مینوں کے قریب آئے اور متعلقہ مینوں پہلوؤں کے خلاصے کا جامع جو۔ محقق و مصنف نے ابتداء لکھا: "نام چندر جی کی مہلت فائدہ کا مشہور ترین بھوجو ہندوستان میں واپس کی۔" رامائن ہے۔ اس کی ترویج حضرت مسیحؑ سے کئی سال قبل کی ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان اور اس کے گرد و قوارع میں چند اور ملائیں بھی پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ سلیم (مخالی لینڈ) میں اس داستان معیبت و وفا کا نام "راما کین" ہے۔ (مالیشیا) میں یہ واقعہ حکایات سری لہم کے نام سے مشہور ہے۔ اسی طرح جاپان و (جزائر انڈونیشیا) میں

”سیرت جہلم“ اور جزائری میں ”لائق“ کے نام سے اس کی شہرت ہے۔ اس کے علاوہ اس واقعے کی شہرت شیخانہ شمالی اور دوسرے
میں بطور اہم کتاب بھی ہوئی ہے۔ اس کے بعد چند مصنفوں میں ان اقسام کے اختلافات و اشتراکات تلاش کر کے پیش کیے گئے ہیں (۱۵)
ملائزم کے مشہور فنون میں اختلاف روایت (۲۶) افراد قصہ کے قرآنی رشتوں سے متعلق اختلافی اشعار، ہندو نام اور ان کا تعلق
باہمی (ب) رام اور ہنومان کا باہم دیگر تعلق، تحریف والہامی کی بحث کے بعد عمیق حوصوف نے تجویز کا لہجہ، رامانوں میں امتزاج
ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک کی ترتیب کا طریقہ جداگانہ ہے۔ یہ ہے جو نے ہونے اختلافات تو ان پر بحث کرنا خالی از طوالت نہیں۔ اس کیلئے
اس اصول پر غور کرنا کافی ہے کہ جو اندہ دنیا میں ممتاز زیادہ قبول ہو گا اس میں اس قدر اضافہ کا رنگ بجا ملے گا۔ کس واقعے کی اہمیت
کا اگر اندازہ کرنا ہو تو یہ دیکھو کہ اس میں واقعیت سے کس قدر بقصد ہو چکا ہے کہ وہی اس کی عظمت کی دلیل ہے۔

دور مشرق میں رامانی متون و تراجم کی باہمی اختلافی نوعیت ہمارے لیے ایک غریب ناما توں پہلو ہے۔ لیکن اس میں سرے
سے شک نہیں کہ رامان فہم کے فاضل مقالہ نگار نے اس موضوع کو زیر عنوان کر کے تاریخی اولیت کا علمی مقام ضرور حاصل کر لیا ہے
جس کی اہمیت کا احساس آج نصف صدی کے زائد بعد بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ اس تحقیق کی قدر و قیمت کا تصور کیجئے کہ رامان متون
کے قریب پچاس سال بعد ہندوستان کی اکادمی ادبیات یو۔ سوسرما سانیہ ایکسڈی کی سرپرستی میں حاصل اسی عنوان سے ایک سیمینار ۱۹۷۷ء
میں منعقد ہوا۔ چنانچہ اس میں پیش کردہ مقالات کی جلد مرتبہ پروفیسر دی راگھون مہوے اکادمی مذکورہ سوہرہ ایشیا میں رامانی روایات
میں اس وسیع تر مقاماتی نوعیت کی ریسرچ اور تنقید پر جامع کام سامنے آیا ہے۔ ان اہم بعد ایک ماحول موضوع ”رامان میں ایشیائی متون“
پر ۱۹۸۱ء میں ایک اور بین الاقوامی مذاکرہ ہندوستان میں ہوا جس کے مقالوں کا مجموعہ مولفہ سر سو اس ایکارہی سانیہ اکادمی کا
۱۹۸۳ء میں جمع کردہ ہے۔ ان دونوں کتب میں وسیع بنیاد پر تہذیبی و سماجی سوئٹات اور دیگر عوامل پر مباحث شریک ہیں یہ تاالیفات
ہم دست نہیں ہیں اسلئے نہیں عرض کیا جاسکتا کہ مثلاً انگریزی یا ہندی و سنسکرت تحقیقات میں اولاً کوئی تعاقب کا اور کب شائع ہوا
اندازہ فرمائیے کہ نیز نگ خیال کے اس علمی معنوں کو اپنے موضوع پر اہم از واقعات حاصل ہے کہ اندو میں وہ حرف اول ہی نہیں ہے بلکہ
آج تک حرف آخر بھی وہی ہے۔

۵۔ ہندو مت ۱۔ از شیتر ہارہوی، ۱۹۷۷ء ۲۔ کتاب الہند برہونیہ از کتب ہندو ویدوں اور گیتا جیسے متون سے ہندو
خصوصاً برہمنوں کے عقائد و فرائض پر امتزاجات اور تہذیب اور لاپرواہی سے، ۱۰ اصل اور سپر برہمن کی مذہبی تعبیر ”پیش کے جس
کے بعد ویدوں اور گیتا سے مناسب مطلب متروک اور اقوال کے ترجمے دیتے ہیں۔ خاتمہ کلام کے متعلق یہ ایک جالی خاکہ ہے: تاہم اس
سے ان کے معتقدات ان کی قدیم روحانیت اور ان کے ماضی و حال کے فرق پر بہت کچھ روشنی پرتی ہے۔ برہمنوں نے ہندوستان کی تاریخ
میں بڑا زبردست حصہ لیا ہے پہلے وہ روحانیت و مذہب کے پیچھے تھے لیکن جیسے جیسے انھیں عروج نصیب ہوا انسانیات اپنا طلبہ کرتے

دی جی کہ عوام برہمن سے محبت کرنے کی بجائے ان سے خوف کھانے اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ ہر صاحب حیثیت ان کے دست باند سے بالا رہنے لگا۔ یہ حالت تھی کہ حضرت مسیح سے چھ سو سال پیش تر خدا کا ایک دوسرا نیک بندہ دہلی کا یہود دنیا کو دوسرا سبق دینے کے لیے عالم وجود میں آیا۔

یا تو اختصار کے سبب یا پھر ہندوستانی تاریخ کے عرف ایک دور تک محدود رہنے کے باعث فاضل نقاد نے اپنی جرح و تعدیل کو بدعت کے آئندہ صدیوں میں کل ہندو شاہت و مقبولیت کے باوجود اس طبقے کے باتوں پر پیرے اکھر نے اور بکثرت قتل عام بلکہ نکل کشی Genocide کے نتیجے میں ہمیشہ پیش کے لیے جلاوطنی کے پہلنے کے واقعات تک تو جین نہیں دی تاہم رامائن نمبر کے — معا بعد رونما ہونے والی طغندہ قومیت اور قیام پاکستان کی تحریکوں کا بھوئی پس منظر سمجھنے کے لیے اس مضمون ذہنیت کے لامقابل تسلسل کے قوی اثرات کی طرف معنوں کے مضمرات یقیناً واضح طور پر اشارہ کماں ہیں۔

۱۔ **عہد رامائن کی معاشرتی زندگی :** ارا مالک نام ابوی، ص ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ایسی رامائن کے منظوم انگریزی ترجمے از پروفیسر گرنتھ سابق پرنسپل سنسکرت کالج بنارس سے مستعار میسوا جائزہ۔ رامائن تمدن کے مختلف اور متعدد اجزاء پر انفرادی و اجتماعی رویوں کے حوالے سے تفصیلات دی گئی ہیں۔ مثلاً شادی بیاہ کے رسم و رواج، تیرتھوں میں مقامات مقدسہ میں ادا کی جانے والی رسوم، افراد خاندان کے تعلقات، افراد معاشرہ کی ورتوں میں یعنی شہور و معروف طبقاتی تقسیم کے مطابق حقوق و فرائض از قسم برہمن، جتری، ویش اور شودرا، فنی پیشے، ادائے تہذیب از قسم قص و سرود وغیرہ، اشیائے خورد و نوش، عقائد و احکامات اور ان پر عمل درآمد یا عدم تعمیل کی صورت حال، یگیہ یعنی قربانی کی نذر دوسری تقاریب، گفتگو اور رسالہ تعطیل کے آداب و لوازم۔

یہ ترجمہ غالباًیات اور اردو و نیر اسلام کے موقر موصوحات کے معروف و محترم محقق و نقاد حضرت مالک رام کے زورِ طبع کا نتیجہ ہے جو بتول خود سنسکرت سے بالمدتے اور ضلع گجرات میں اپنے وطن مالوی پالوی میں مقیم۔ رامائن نمبر کی نہرت شر کا دلے صفحہ اول پر بیہون تفروری ترین ”مضمون میں ادھیادوں میں قدیم ہندوؤں کے گائے قربان کرنے کا ذکر ہے۔ اداسے کی جانب سے اعتناء پیش کیا گیا ہے۔ مالک رام صاحب چند برس بعد کچھ سال تک خود ”نیرنگ خیال“ کے بے بسی مدبر رہے۔ ابوی کا لاہستان کی تصنیفات و نگارشات میں اکثر نظر نہیں آتا ہے لیکن شروع سے آج تک یہ اصناف کبھی کبھار صحیح کیا ضرور گیا ہے۔ مدد و کا تازہ ترین کا نامہ علی کے فاضل اہل حضرت ممتاز الدین احمد آرزو کے اعز اذیں گراں مایہ ملی مقالات کی گراں قدر جلد ”نذر ممتاز“ کی پیشکش ہے۔

۲۔ **تلمی کرت رامائن کا ایک سین :** از ڈاکٹر افضل کریمی، ”مناہوہ“ تلمی کرت رامائن کے نگار خانہ کا ایک نظر

یعنی اس کا۔ منول مطلب خیز ترجموں میں واقعات کی تشبیہ کے ساتھ ۲۹ ہندی اشعار اور ہند متعلقہ دوہوں کا مطلب بیان کیا گیا ہے۔ قبل ازاں ایک صفحے میں بطور تجسیدی داس کی شخص و ادبی حوالے تحریر کی گئی ہے۔ اس میں اور شریعت کے دوران کلام کی نئی خوبیوں کی داد ملے جگہ دی ہے۔

فاہل مترجم اردو ادبیات کے پرمختہ اسکول کی ایک مقبول اور بڑی شخصیت رہے ہیں لیکن علمی حلقوں میں ان کا نام ان کی ایک تحقیق دو سوزہ ہندی شاعری، "مطبوعہ ہندستانی اکیڈمی لاہور ۱۹۳۱ء کی بنا پر اہمیت رکھتا ہے جو انوسیس کر دستیاب ہو سکی ہے۔ مرف زینک وہ ترجمہ سامنے ہوتا تو اس کو اس کتاب ہندی شاعری کا ایک باب فرض کیا جاسکتا تھا۔ لیکن تلس داس پر ڈاکٹر اعظم کروی کے کل دو تراجم پیش نظر ہیں اور یہ عرض کرنا مشکل ہے کہ یہ اس ہندی رمان کے خالق پر کسی کتابی منصوبے کے اجزا ہیں یا۔ ہندی شاعری کے ہی ایک یا زیادہ حصوں کی تشکیل کرتے ہیں جو موصوف کے دو ترجمے "نگار" کے ہندی شاعری بزم میں ملتے ہیں جن میں کا ایک بعنوان "فطرت نگار تلس لانا صا" کا نام "تلس داس کی دو باولی" کے ۲۷ دوہوں کے انتخاب اور مطالب پر مشتمل ہے۔ (جی کہ دوسرے مضمون "ہندی کاشتہ جو حسن نواز شاعر باری" اسی تصنیف ہندی شاعری کا حصہ ہے)۔ قدرے مفصل ادبی احوال سمیت تلس داس کے پچاس دوہوں اور اشعار کے ہندی اردو روپ مع مطالب اور تعارفی خصوصیات اعلیٰ مالوی کے بھی ایک صفحے کا مرکزی نکتہ ہیں جو "نگار" کے اس بزم میں درج ہے۔

ہندی ادب اور شاعری کے موضوع پر متذکرہ مطبوعات کے علاوہ چند اور کتب بھی ہیں۔ خاص شاعری پر نیاز فتح پوری کی "جذبات بھاشا" مطبوعہ کھنؤ ۱۹۱۳ء مرف تین شہزادہ کاتاری کی کتاب ہے جبکہ ان کا مقالہ "ہندی شاعری کی تاریخ" (مشمولہ ہندی شاعری بزم) ایک مختصر مفید کتاب کے مصداق ہے۔ شبیہ ہندی مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر زیدی جعفر رضا صاحب کی تحقیقات بنام "ہندی شاعری کا تاریخی جائزہ" ۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۵ء میں تعلق "میں بالاقساط مندرج ہیں لیکن کتابی ایڈیشن کا علم نہیں ہے۔ ادبیات پر سید ظہیر احمد علوی کی غالباً اولین لیکن کم معروف تصنیف "تاریخ ادب ہندی" مطبوعہ لاہور ۱۹۲۳ء اور پروفیسر حبیب اللہ خاں فاضل فرنگی خٹک "تاریخ ادب ہندی" ۱۹۵۵ء اور ۱۹۸۸ء کے علاوہ ڈاکٹر محمد حسن کی دو کتابیں مشہور ہیں۔ "ہندی ادب کی تاریخ" علی گڑھ ۱۹۵۵ء اور "ہندی ادبی بیرونی مالی تحریک" ۱۹۶۵ء۔ مزید برآں جامعہ کراچی سے وابستہ ہندی کے فاضل ڈاکٹر مستقیم رضوی صاحب کی محققانہ تاریخ ادبیات ہندی زیر طبع ہے۔ "ہندی شریات کے ایک خاص اہم شعبے یعنی مسلمانوں کی تخلیق علیا پر بھی موجود ہیں: (۱) مبداء اللہ بیٹ: ہندی کے مسلمان شہزادہ لاہور قبل ۱۹۶۸ء جو غالباً ایک کتابچہ ہے، (۲) ڈاکٹر نذیر احمد: "ہندی کے چند مسلمان شہزادہ" مشمولہ "سفر" دسمبر ۱۹۶۵ء و بعد جو غیر ہندی یعنی فارسی ناقد سے مستفاد ہے اور جس کی کتابی اشاعت لاٹھی ہے (۳) ڈاکٹر ہسیل بخاری: "ہندی شاعری

میں مسلمانوں کا حصہ، کراچی ۱۹۸۰ء اور اول ہندی کتب سے اخذ و تفسیر کا نام و اسماں کی منتقازہ و ناقذہ پیشکش کا نامال بہترین اور عمدہ ترین نمونہ ہے۔ نگار کے تین مرتبہ شائع شدہ ہندی شاعری پرچمکے علاوہ کئی رسائل میں مختلف نمونوں سے متعدد ہم موضوع مقالات وضع ہیں جن کی فہرست سازی کر کے ایک باقاعدہ اور تشریحی و تعارفی مقالہ نگار لکھا گیا ہے۔ سات سو دو ہوں کے مجموعے ”بہاری ست سی“ کے خالق بہاری لال کا تعارف بقلم ڈاکٹر اعظم کریوی بیوان ہندی کا مشہور حسن نواز شاعر، بہاری ”مندرجہ“ نگار ”مکتو“ ہندی شاعری پر ”ہندی رسم الخط میں کلام سحر اردو و نقیل اور تشریحات پر مشتمل ہے۔ تاہم یہ اردو میں اولین یا واحد مطالعہ نہیں ہے بلکہ اعظم کریوی سے قبل ”بہو بھی اس کے نمونے ملتے ہیں لیکن جسے اس بارہ نام میں اولیت نیاز مقبوری کی کتاب ”جذبات بھاشا“ کو پس مابل رہی ہو جس میں بہاری و خلفائاں کے دو ہوں سے مختصر انتخاب و مضمون کے ساتھ جاسی کی ”پداوت“ کے ماسقازہ اشارہ کا تجزیہ ہے۔ البتہ خود نیاز صاحب کے قلم سے لیکن ڈاکٹر اعظم کریوی کی کتاب ”ہندی شاعری“ کے منفصل جائزہ اسی ”ہندی شاعری پر“ میں شریک ہندی شاعری کی تاریخ“ اور ”جذبات بھاشا“ نامی کتابچے کا بنیاد دونوں کے ہی مشترکہ تسلسل میں تصنیف کیے ہوئے ایک مقالے میں موجود ہے۔ ”ہندی شاعری کی تاریخ“ میں بیوان ”عہد مغل کے باقی شعراء“ بصفہ ۱۹ بہاری کو چند سطر ہی تذکرے کی جگہ مل چکی ہے۔ جس کی ایک اور مثال ”ہندی شاعری پر“ میں ہی احتشام رضوی کے مقالے ”مغلیہ حکومت اور ہندی شاعری“ میں بصفہ ۱۱ ملتی ہے۔ تاہم نیاز صاحب نے دو ستر مقالے ”ہندی شاعری اور جذبات محبت“ میں آٹھ ”مذکرہ شعراء کے ساتھ بنام“ بہاری لال ”بصفت ۱۲، ۱۳ اور ۱۴ دو ہوں سے ہندی اور اردو میں نقل کر کے مطالب بیان کیے ہیں۔ علاوہ ازیں ”بہاری ست سی“ کے ایک ہندی ایڈیشن مرتبہ پریم سنگھ شرما پر مشتمل پریم چند کا ترجمہ مطبوعہ ”نما نہ فروری ۱۹۳۵ء“ میں دیفات ہولہے لے برآمد کر کے ہندوستانی ادیب و محقق انکنا لال صاحب نے بھی شائع کیا ہے۔ اس سے ہمیں پریم چند نے بہاری کے دو ہوں اور اردو شعراء کے غزل لکھنے کے چند اجزا میں نکری مناسبت اور اظہاری ماثلت کے پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے جو اصل مصنف سے اخذ ہے۔ اسی مضمون سے یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ شری پریم چند نے بقول خود وہ کئی سال ہوئے رسالہ ترجمان میں بہاری کے حالات لکھے تھے۔ پروفیسر فریر احمد کی تحقیق کی دے یہ مقالہ ”نما نہ“ اپریل ۱۹۱۷ء میں بطور عہدے اور ان کے وقیع مجموعے ”مضامین پرچم“ کراچی ۱۹۸۱ء میں اس سے اخذ ہے۔ یہ بہت منفصل اور تجزیاتی ہے۔ ازاں بعد جدید آبادی اسکا رپرنٹ ڈوشی دسر و دیال سنگھ نے اپنے مستقبل سلسلہ مقالات میں بہاری پر ایک عمدہ تعارف لکھا جو اردو ”سٹار“ میں ۱۹۳۳ء میں بطور عہدے ہے۔

بہت تیس سال کی زمانہ کی اردو میں منتقلی کا عمل ہی ڈاکٹر اعظم کریوی کے نام استلانہ کام سے قبل سے جاری ہے اس

لے ایک نالا، پرچم چند اور تہا پند پرچم چند کے منتقلی کو ”دل ۱۹۸۰ء“ پرچم چند کی ”مشتعلیات کا بیانات“ سے ”بہاری ست سی“ ۱۹۳۳ء۔ رقم کے ایک خط کے جوہر میں ”مشتعل“ نامی تصنیف سے منسلک ہے۔

جانب ذیل کی معلومات کا اخذ اکثر منظر حنفی کا متفق تصانیف رامائن اردو میں ہے۔ اس کا موصوف کا اثر یہ ہے کہ اردو میں سب سے زیادہ ترجیح تلس داس کی رامائن کے ہونے تلس داس نے کئی رامائنیں لکھی ہیں۔ مثلاً "گیتاؤلی"، "کوتیاؤلی"، "بروا" "پچھے" وغیرہ لیکن مولام میں جو مقبولیت دوپا چوای میں تعلق کر کے رامائن کو نصیب ہوئی ہیں کا اصل نام "رام چیت مانس" ہے۔ وہ خود تلس داس کی دوسری تصنیفات کے حصے میں بھی نہیں آتا۔ (صفحہ ۱۲۷)۔ پروفیسر حنفی نے اس کے بعد یہ انکشاف کیا ہے: "نثر میں رامائن کے جو اردو ترجمے شائع ہوئے ان میں تلس کرت رامائن، ساتوں کا ندرت، نیکا از سکھ دیوال، بطور خاص قابل ذکر ہے جسے آگری کے مطابق حرفی خوف اردو رسم الخط میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کے مرتبہ شیخ سوامی دیال تھے۔ ابھی حال ہی میں رام چیت مانس" کا اردو ترجمہ حکومت ہند کی وزارت تعلیم کی مال مساوت سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے مترجم ہیں نور الحسن نقوی (۱۹۵۵) ڈاکٹر منظر حنفی کے تاریخی جائزے کے دو صرف تلس رامائن کے بارے میں شائع شدہ ہیں (۱۳)۔ "تلس کرت رامائن بہار" یا تصویر از بلکے بہاری لال بہار (۱۸۸۶ء) تلس کرت رامائن (رحمت) از شکر دیال رحمت (۱۸۸۶ء) تلس کرت رامائن خوشتر" از جگن ناتھ خوشتر (۱۹۲۳ء) رامائن تلس کرت، اصل مع منظوم ترجمہ از سورج پرشاد قصور رسد، ناڈکور۔ خاص بات یہ ہے کہ تیزنگ خیال نے رامائن نمبر "اوز نگار کے ہندی شامی نمبر" میں مطبوعہ تلس داس کی رامائن "وغیرہ سے ڈاکٹر اعظم کرپوری کے یہ تراجم کسی مسلمان اسکالر کی غالباً پہلی اور آخری کاوشیں ہیں۔

۸۔ رامائن پر ایک طائرانہ نظر: از ریاض مبین، ۱۹۵۵ء۔ دایکس پریس اور داس کے متون کے اختلاف نسخ کی روشنی میں خلاصہ و تبصرہ، بنو اناث رامائن کا اخذ اور اس کی تاریخ تصنیف، بن باس مہم، لکھا فخر حال، اصل رامائن کا نمبر (رامائن کے دو حصوں میں تقسیم کی گئی) اشخاص اذات۔ بقول مقالہ نگار: اگرچہ رامائن کا مصنف دایکس کو تسلیم کیا جاتا ہے پھر بھی ہندستان کے طول و عرض میں رامائن کے تین مختلف نسخے رائج ہیں۔ شمالی اور جنوبی ہند میں دایکس کی تصنیف کو قبولیت عام حال ہے۔ بنگال میں تلس داس ہی کی ہندی رامائن مقبول عام اور مغربی ہندوستان و کشمیر میں ادھیاتم رامائن جو داس کی تالیف خیال کی بجائے بہ کثرت رائج ہے، مختلف مباحث سے ہو کر وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں: "رامائن انقلابی معلم ہونے کی حیثیت سے بھی نہایت بلند پایہ تصنیف ہے: اس کے ہر پر واقعے میں نیک اور راست بازی، شرافت اور شجاعت، عدل و انصاف اور محبت و وفاداری کی تعلیم کی گئی ہے۔ اور برائیوں کے نتائج محروم نہایت موثر پہلے میں دکھائے گئے ہیں۔"

۹۔ ڈاکٹر منظر حنفی کا مقالہ رامائن اردو میں، ان کے گزشتہ نمبر "تقدیر نے" مطبوعہ دیول اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۷۰ء کے صفحہ ۱۱ سے لیکر ہے جس کا ذکر بموجب دایکس کی تصنیف، ڈاکٹر منظر حنفی، حیات شخصیت اور کارنامے، مطبوعہ موزون پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۹۷۱ء کی پانچواں ششم، تحقیق و تنقید کی قدر تکرار، کیسے کم و بے بغیر، ام کی تفصیل سے مراد ہے۔ "تقدیر نے" کے مقالہ نگار کی پروفیسر حنفی صاحبہ نے وہی گزارش پر مروت کیا ہے۔

مطالعہ رمانائن کے تنقیدی زاویوں کے قطع نظر بقول ڈاکٹر منظر منقہ رمانائن کے ضمنی قصوں اور واقعات پر مشتمل منظومات اور مضامین کے چند مجموعے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً "چمن رمانائن" میں راجدہ شرہ، رام، ہوان، سیٹا، راون وغیرہ رمانائن کے کرداروں سے متعلق سوانحی اور مطروحات مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ رمانائن کے بعض مین" میں مولوی عبدالستار کے وہ مثنوی بجا کر دیے گئے ہیں جو رسالہ "دلگداز" لکھنؤ میں ۱۸۹۰ء/۱۸۹۱ء میں شائع ہوئے تھے۔ چند بعض مضامین کے مثنویات ہیں۔

"پتر کوٹ بہار"، "منڈاکنی ندی"، "سیاہی ماون کے بچے میں" وغیرہ (۱۹۹۵ء)۔ مصنف شری کے فن کو لازم کی روشنی میں "رمانائن و مہاجرات" نامی مقابلہ و مقابلہ سے بعلم نیاز فقہوری مطبوعہ ہندی شاعری بنگال استغادہ ہے۔ ادبیات عالم سے منظوم رزمیوں کی خصوصیات کو سامنے رکھ کر نیاز صاحب نے جو مجموعہ کیا ہے اس کے مطابق چند قدیم کے معاشرے کی یہاں تصویریں ہیں جو گویا ایک ہی تصویر کے دو رخ ہوں اور باہم دگر لازم و ملزوم چنانچہ دونوں کے بغیر ایک جامع منظر ترتیب نہیں ہو سکتا ہے۔ تاہم شری نصاب کے نقطہ نظر سے نیاز صاحب کے نزدیک مہاجرات، بدرجہا برتری کی مالک ہے۔

۹۔ اندو آرمین قوم کے احسانات ہندوستان پر :- ازاں خالد بھال پوری مرزا، ۱۹۷۰ء۔ غالباً مورخ جادو ناتھ سرکار کی کسی تحقیق سے مترجمہ مختلف تاریخی حوالہ کا متحرر منظر نامہ تیار کر کے قدیم ہندی تمدن اور معاشرے پر اس کے چھ احسانات متعین کیے ہیں۔ اور ان ہی کی مرآت تحریر کی ہے۔ ممکن ہے معنوں سرکار کی کسی سوسطا تاریخ کے اختصار سے پرہیز ہو کر روایت کردہ اجمال کی تفصیل ایک ضخیم کتاب میں ہی آ سکتی ہے۔ یہی ہو سکتا ہے کہ جناب مترجم کے مد نظر سر جادو ناتھ کی کسی کتاب کے اردو قالیہ کا منصوبہ ہو جس کی اشاعت کا احوال علم نہیں ہے اور نہ ہی سرکار نے کسی اور سند ترجمہ کا معلوم ہو سکتا ہے۔ جو معروض کی تمام شہرت اور نگارہ اور اس کے عہد کے پانچ جلدی معقار نامے کے سے وابستہ ہے مگر وہ انگریزی میں ہی خاندانہ شیواں، "شیواں اور اس کا عہد" اور "منزل نظر و نسق کے علاوہ تاریخ سے پورے اور ہندوستان کی فوجی تاریخ" وغیرہ تحقیقات کے مصنف گزرتے ہیں۔ اور نگ زیب پر جادو ناتھ سرکار کی تحقیق تاریخ کا ایک نیا ایڈیشن کرچی سے شائع شدہ ہے اور ہندوستان میں اورینٹ لٹریچر کا مطبوعہ ہے۔

۱۰۔ رمانائن کا ایک فارسی ترجمہ :- از پروفیسر شری رام شرمہ، ۱۹۷۰ء۔ ڈی۔ لے دی کالج لاہور کے استاد اور ایل ایشیاٹک سوسائٹی کے رکن پروفیسر شری رام شرمہ نے دورہ جہاں گیر کی کمال اسکا لٹرائڈ گر دھر داس کی اس تخلیقی کاوش کا کٹھن کیا ہے۔ چون کہ زمر فہرہ راست سبکدستی الاصل ترجیح بلکہ اس کے ممکنہ تعلقات ہی ایک اور ہم موضوع عنوان فارسی میں چند قدیم کے معاصر و منابع کی منتقلی سے ہم پر شستہ ہیں۔ اس لیے اس منظوم سے متول اجزاء اور تعارفی ملاحظات کا بھی یہاں اقتباس کرنا بڑی حد تک انسانی ہو گا۔ پروفیسر شری رام کی تحقیق کے مطابق یہ منظوم تصنیف معروفہ طور پر مین رمانائن سے وگرنہ عقیقتاً سنسکرت بالکل سے بڑھ کر راست ماخوذ و مستفاد ہے۔ اس کے انظر گم دھر داس دہلی تھے جنہوں نے اپنی یہ شری تخلیق جہاں گیر کی مذکر کا منہل پر وفیہ کر

ہائے بیک سرک کا دش اور کئی خصوصیات کی بنا پر اس شاعر کی نظم کے متفقہ مدحیت تکہ تشبیہات و تشویشات پر جائزہ کے لیے غرض کرتے ہوئے خود مقالہ کا موضوع کی طبیعت کو جاننے کے لیے ہمیں نتیجہ صرف دینی ہی متعارف کرانے کی سادہ ماحول کی تفریق سے نہیں رہا ہے کیوں کہ ان کے ماحول کی کمال شائستگی و شہرت پر کسی شاعر کو بھی شبہ نہیں رہا۔

دعا صلہ ملائیں بجز کے یہ صفات نہ تو کسی کی معنوں کا حصہ ہیں اور نہ ہی مصنفہ مقالے اتفاقاً یہ تعارف پر وقلم کیا کیوں کہ پروفیسر کی مام شہر کا اسم گرامی آج ہادی سوسائٹی میں خواہ قیام فرماؤں ہی کیوں نہ ہو، ان مشروہ میں وہ اپنی محققانہ حیثیت میں ایک شاعر اور مصنف کا رویہ ہے جس کا دل اپنے وقت کے ہفت زبان داخل چنانچہ وہ اپنی تحقیق نگارشات میں جو اردو ادبی حیرت کے علمی جہان میں شاعرانہ طور پر ہیں۔ تنوع تعلیمات و طبوعلات کا حوالہ دیتے نظر آتے ہیں پروفیسر صاحب کے زیر مستقیمہ ملاقات میں موجود ان کے اخذ کی جو طویل و بڑی ترسک جاسکتی ہے اس میں یہ ملحوظ اور قابل تفسیر ہے کہ کیراج شامل داس کی "دروود" کا مخطوطہ وارث کی نگلی پڑا "چند رحمان کی چار جہن" "سہا سہا" اور جلیے پڑت گوری شکریہ پر چند اوجھال ہندی تاریخ و سوانح میں ان کی ایک کتاب کا پریم چند کا ترجمہ اور دایا اب ہے "ہونو" "دروود" "دو دلی" "پشتان تہذیب" "مطبوعہ ہندوستان اکیڈمی (الہ آباد)" "مراقی احمدی" و "ماثر عالم گری" "عماد علی" کا غیر مطبوعہ تذکرہ سلاطین چغتائی "مخطوطات عالمگیری" "مطبوعات" "بہار پرشاسن" "آطب عالمگیری" "راج داس" "پور و ریکارڈس" کی جلدات موجودہ مخطوطہ شہرہ "قلمی" "جوابات عالمگیری" وغیرہ۔

رامائیتی منظومات متعلقہ سوانح و سوانح - بزرگ خیال کے "رامائن بزرگ" میں چند عقیدت کی شانہ منظومات مختلف مضمون پر موجود ہیں ان کی ترتیب ہے: اقبال کی نظم "نام" "بعض" "اسٹ پر پندت" "میلاد رام" "فلک" "چار اشعار" "ہونو" "نام" "غلت" اور بیل الا آبادی کے سات اشعار و سوانح "دیش بھارت میں پھر آجائے زمانہ رام" "فتیس قلیلی کا منظومہ سویر" "ملا" "ہونا" "نام" کے کس مجموعے سے ماخوذ ہے نیز صفحہ ۴۲ ملتان افسر برہم کی چھ اشعار کی نظم "نام چند" اس فہرست سے ظاہر ہے کہ بلیا مقلد "رامائن بزرگ" کا حصہ منظومات شری مضامین کے مقابلے کا نہیں ہے بلکہ برابری کا بھی نہیں ہے اس کی ایک ٹری و درہ تو یہ ہے کہ اس شکل کی طرح شاعری و موضوعات اور ماسابیت میں ملاتے تنوع کی حال ساتھ برس پہلے ہی۔ اور دو سبب یہ کہ ان دونوں درہ ترقی پسند تحریک کے خود دار انتقاد تک پہلے ادبی رسائل کے حصہ نظم و نثر کی اس سے زیادہ مخالفت عام طور پر نہیں ہو اگر قلمی دور کی طرف یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو میں رامائیتی منظومات کی روایت عامی مستحکم و موثر اور جاننا رہی ہے چنانچہ "رامائن بزرگ" شاعر کی خود اس سلسلے کی ایک کڑی ہے لیکن طائرہ موسس ہوتا ہے کہ یہ کوئی ٹری اور شاعرانہ قریب ثابت نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ اس روایت میں اس کا پایہ کم تر ہے۔

”نیز نگ خیال کے رمانی شامی کے نونوں کے لوبی پس منظر کے طور پر اس روایت سے متعلق چند ایک اشاراتی نکات پر مینا نرہ اختتام کو پہنچا ہے۔ ان اشارات کے لیے راقم ہندستانی قاضی ڈاکٹر منظر حق کے دو مقالات سے فائدہ اٹھا رہا ہے جن میں کا اولین مین ”رمان اردو میں“ خود منظر موصوف کی ذاتی اور خصوصی قومی فرمائی کے فیض تکمیل ہو سکا ہے جس کے ساتھ ساتھ تحریر رام کی عظمت اور اردو شاعری سے بھی معلومات یکجا منقول ذیل ہیں۔ پروفیسر منظر حق کا صرف یہ خیال ہے کہ اردو میں منظوم رمانوں کا دافتر وجود ہے بلکہ ان کا قیاس غالب ہے کہ بلحاظ تعداد بقرائی تمام ہے بھی زیادہ ہیں۔ انہوں نے اردو کی منظوم و منثور ادبیات رمان کے عہد بہمدار تقابلی جستجو کرتے ہوئے گزشتہ صدی سے لے کر وقت اخیر تک کی مصنف و مترجم و مشغور غرض بھی قسم کی زیادہ سے زیادہ رمان مطبوعات دریافت کی ہیں۔ اس موضوع کی معلومہ دست کی رو سے اردو کے منظوم رام کا ذکر بھی دونوں میں قرار پائے گی، مین ایک قبا قاعدہ تمام رمان اردو دوسرے رام کی سیرت سمیت دیگر پہلوؤں، کرداروں، واقعات، مقامات وغیرہ پر بھی بڑی رمانی تفصیل۔

”رمان بڑے چوک اس ثانی الذکر قسم کی منظر تفصیل پیش کی گئی ہیں اس لیے انوقت صرف اس طرح کی نظروں کی نشاندہی کافی ہے کہ۔ رمان اردو میں“ نامی پروفیسر منظر حق کی تحقیق کی دفعے گلدستہ ”رمان“ کے عنوان سے مجموعہ تہ لایا گیا چند محل دست۔ نام کی منظوم ابیات کے دور کی اولین یاد گاہ ہے جس کی تخلیقات میں رمان واقعات و مناظر نظم کیے گئے ہیں۔ ذکر وہ گلدستے کے شرکار کی منقول از ہمت مین پیش کی کوئی ایسا شاعر شامل ہے جس کے نام اور مقام یا کم از کم کام ہی کو آج لائق تذکرہ سمجھا جاسکے۔ اس نقطہ نظر سے ڈاکٹر منظر حق بعد کے چند شعرا اور ان کے منظوموں کو اہم خیالی کہے نام ذکر کرتے ہیں: اردو کے مختلف شعرا کے مجموعہ کے کلام کی روش گردان کیجئے تو قدم قدم پر رمان سے افدہ کرد و واقعات اور داستانوں پر مشتمل ایسی تفصیل دستا ب ہوتی ہیں جو صرف مذہبی اعتبار سے اہم ہیں بلکہ اردو ادب میں اپنا مقام بنا چکی ہیں۔ ایسی منظومات مین منظر علی خاں کی ”ایک رش کے داغ جڑ کی کہانی راجہ دشرتہ کی نیالی“، درگا سہلے سرور جہاں آبادی کی ”سیتائی کا امرا“، پنڈت دتاریہ کین کی بن باس کی بیج“، توک چند عمر دم کی ”سیتا ہرن“، میلارام وفا کی ”راجہ دشرتہ کے آخری الفاظ“، مجت موہن لال رواں کی ”تاراک فراد“، ہمارا جہاد برقی کی بن باسیوں کی شکستہ رخصت“، اور شاد مارنی کی ”دہرا شن“، بطور فاس قابل ذکر ہیں“ (۱۹۹)۔

اسی سلسل میں پنڈت برج تاسان پکیت کی ”رمان کا ایک سین“ اور اقبال کی رام چند سے کہہ اشارات منقول ہیں۔ اس فہرست میں دوسرے مقالے ”رام کی عظمت اور اردو شامی سے ان چند اور تخلیقات کا امانہ مکن ہے: ظفر علی خاں کی

لہ پروفیسر منظر حق: ”نیز جہاد صلیب و موزن پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۱ اور تہ لایا کاغذ مجموعہ میں ہیں یہ مقالہ برصغیر ۱۹۹۷ء میں ہے۔
جے۔ منو لیا پکا اطلالیہ ۱۹۹۷ء سے اخذ ہیں جیکہ رمان کے کتب خانہ اور رام پر بھی تخلیقات کی فہرست ۱۹۹۷ء میں ہے۔

نثری رام چند سے خطبات، سازن تھائی کی، رام، اور ایک نظم، باجوگر ورائٹ کی مسیتا سویر، و فیرو۔
 تھائی نثریاد، تھائی نثری جکت موہن لال رواں کی جس نظم کو پروفیسر موصوف نے درج نہایت کیلئے، روح رواں
 میں اس کی ہم موضوع ایک نظم بعنوان رطبت بال، بعضات ۱۵۲۱ء ۱۵۲۲ء موجود ہے۔ ممکن ہے اصل ایک ہی تخلیق ہو جس کا نام پچھ
 میں تبدیل ہوا ہو۔ مجموعہ اسے حضرت رواں کی دیگر ماہی نغموں کا تذکرہ مقالات مظهر منفی کی تفصیلات میں کوئی ذکر نہیں
 ہے چنانچہ ان کی کیفیت مذہب ہے۔ ان میں سے پہلی ہے چتر کوٹ، ۱۵۲۵ء جس میں رام کی بتا س سے مراجعت کا بیان ہے۔
 دوسری مسکتی بان، ۱۵۲۶ء ہے جس کا موضوع ہے جنگ نکاس لپمن پر زخمی حالت میں دار دے ہوشی سے رام کا نگین ہوا لپسا
 ہوا، خود لیس داس جنگ کی تحسین میں ایک ہم نام نظم بعضات ۱۵۲۶ء ۱۵۲۷ء موجود ہے۔

یہاں اس سوسے اتفاق کی طرف بھی اشارہ اگر رہے کہ مقالات بعنوان، رامائن اردو میں، اردو رام کی عظمت اور
 اردو شاعری میں، نیز نگ خیال کے، رامائن نیز، کی مختصری نظمیں اور یا ان کی تخلیق کاہ شخصیات شامل بہت نہیں ہیں۔ اس
 کی قابل فہم وجہ یہ ہے کہ رامائن نیز غالباً عمیق موصوف کے ملاحظے میں آ سکا ہے کیوں کہ ہم موضوع نثری مضامین اور مقالہ نگاروں
 کی بھی فہرستوں میں، رامائن نیز کے ناموں کا کوئی اندراج نہیں ملتا ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا بامفروری ہے کہ ان حقہ تباری طور کا ایک مقصد، رامائن نیز کے فاضل مرتب اور نیز نگ
 خیال کے فائق مدیر میکم یوسف حسن کی اس اچھوتی کاوش کو شمولات و حتمیات کے وسیلے سے غرائج پیش کرنے کی سعادت حاصل
 کرنے ہے تو دوسرا مقصد اس اجمال کی تفصیل کے لیے ارباب علم و نظر کی طرف دست سوال دروازہ کرنا بھی ہے۔ راقم قدیم ہندی علوم و ادب
 کا اردو منظر ارمہ تفصیل دینے کی غرض سے معلومات کی جمع آوری کے لیے خواہاں و کوشاں ہے اور اسی موضوع کی دو گوشہ ذیل
 نثری، اردو کارام کا دیہ اور کرشن بلقی ادب کے عرف ایک پہلو پر یہ چند سطری جائزہ، میکم یوسف حسن کے اس یادگار کازلمے کو زیر
 عنوان کر کے گویا اس کے فیضانِ عمر پر کر سکا ہے۔ اس بارہ خاص میں بیش از بیش اطلاعات اور نکتہ تفصیلات کی خاک را کو امتیاز
 ہے اور ذریعہ جہا مناسب بہرہ کی درخواست بھی۔ اس اناس کی پذیرائی اس اعتراف کے لیے حق میں عز و شرف کی وجہ ہوگی اور
 رہ نال سے حاصل شدہ معلومات حسب موقع و ضرورت نیز اظہار امتنان کے ساتھ اہناؤ کی جائیں گی۔

لے منشی جکت موہن لال رواں، تہذیب و ادب، ۱۹۲۸ء مطبوعہ انپرنس اردو کالونی، ۱۹۸۳ء

خدا بخش اور میل پبلک لائبریری کی تازہ مطبوعات

نمبر	نام کتاب	مصنف / مرتب	صفحات	قیمت
۱	انیس الاحیاء - تذکرہ شعرائے فارسی (فارسی)	مولفہ: بوہن لعل ایتیں		
		ترتیب و تدوین: پروفیسر الوار احمد	۲۶۲	۱۰۰ روپے
۲	اورنگ زیب اور ہندوؤں کے ساتھ تعلقات	اکھیلیش جاسوال	۱۰۶	۳۰
۳	بہار میں علوم و ادبیات - جہاں کے شاہیر کے قلم سے	رسالہ نیرنگ (۱۹۳۱-۱۹۳۵) سے انتخاب	۳۶۰	۲۰۰
۴	خلائد انیس الطالبین (فارسی)	عبدالرحمن جامی / تعلیم و تدوین: محمد کریم	۱۲۴	۵۰
۵	سنہ سادہ سے پہلے کا ہندستان بہار کے	تعلیم: قاضی عبدالودود	۳۵۸	۱۴۵
	انبار بہار کی روشنی میں	رسالہ نیرنگ (۱۹۳۱-۱۹۳۵) سے انتخاب	۳۱۴	۱۵۰
۶	شارع عظیم آبادی - چند مطالعے	مرتبہ: معین الدین عقیل	۸۲	۲۰
۷	کلام رنجور عظیم آبادی			
۸	طیشیا میں اردو، فارسی اور عربی مخطوطات کی			
	ایک دستی فہرست	مرتبہ: محمد اکرم حسین	۹۰	۲۰
۹	ہندو مسلمانوں کے دور حکومت میں	محمد یوسف اعظمی	۳۲	۵
۱۱	سوانح منشی نوکشور	سید امیر حسن نورانی	۳۲۵+۱۰	۱۵۰

1. India & Uzbekistan: Khuda Bakhsh International Seminar Dec. 1993 on Historical and Cultural links Between India and Uzbekistan, 1996, 534p. Rs. 300.00
2. An Account of Bi-Amman's Bihar Visit, 1922 Introduced by Srikant, 1996, 130+12p. Rs. 75.00
3. गीता और कुथन/सुन्दरलाल, १९९६, २६८ पृ०. ₹० ५०.००

Footnotes

1. Quoted by Indubhusan Banarjee, *Evolution of the Khalsa*, Vol.II, 2nd edition, Calcutta, 1962, p.62.
 2. M'Gregor, *History of the Sikhs*, London, 1846, pp.66-67.
 3. Cunningham, *A History of the Sikhs*, edited by H.L.O.Garrett, Delhi, 1966, p.57.
 4. *Ibid.*, p.59.
 5. Narang, *Transformation of Sikhism*, 3rd edition, Lahore, 1946, p.113.
 6. Syed Muhammad Latif, *History of the Punjab*, Calcutta, 1891, p.259.
 7. Khuda Bakhsh Library Ms., p.30.
 8. Dr.Ganda Singh, the renowned historian of India, opines that Hafiz Adam was neither a contemporary nor a companion of the Guru. He had been banished from the Punjab by Emperor Shah Jahan in 1642 and had died in December, 1643 while on Haj to Mecca and Medina, 21 years before Guru Tegh Bahadur came to the 'Gaddi' in 1664 A.D. There appears, however, a confusion between Sheikh Adam Naqshbandi Binnauri, the hero of Manaqib-i-Admia or Manaqib-ul-Hazrat, and Hafiz Adam.
 9. *Tarikh-i-Muzaffari*, Khuda Bakhsh Library Ms., folio 87A.
 10. *History of Aurangzeb*, Vol.III, Calcutta, 1916, pp.354-55.
 11. Macauliffe, *The Sikh Religion*, Vol.IV, p.369.
 12. According to Dr.Ganda Singh, the deputation was led by one Pandit Kirpa Ram Datt, a Saraswat Brahman of Mattan, who had for some time been a tutor to the 9th Guru's young son, Gobind Singh.
 13. Macauliffe, *The Sikh Religion*, Vol.IV, p.372.
 14. Dr.Ganda Singh, the historian of the Sikhs, however, observes that the Emperor Aurangzeb was not then at Delhi. He was away to Hasan Abdal, directing military operation against the Afghans. He returned to Delhi on Muharram 22, 1087 A.H. (March 27, 1676), 4-1/2 months after the Guru's martyrdom. Therefore, 'the account of the personal interviews of the Guru with Emperor Aurangzeb at Delhi falls off as an unhistorical interpolation.'
 15. Dr.Ganda Singh has referred to the Bhatt Vahis in this connection.
 16. *Vichitar Natak*, Chapt.V; translation by Macauliffe, *the Sikh Religion*, Vol.V, p.295.
 17. *The Sikh Religion*, Vol.IV, p.317.
 18. *Ibid.*, p.392.
 19. *Transformation of Sikhism*, 3rd edition, Lahore, 1946, pp.115- 16.
 20. *Maasir-i-Alamgiri*, translated and annotated by Sir J.N.Sarkar, Calcutta, 1947, p.94.
-

of the great founder of Sikhism in inculcating ethical and moral principles on all and sundry. The Guru was fearless in the cause of truth and justice. There is nothing improbable if his staunch convictions cost him his life.

In the end, one feels inclined to agree with the view of Macauliffe, expressed in the following words: "...the circumstances related by the Muhammadan writer are utterly incompatible with the whole tenor of Guru Tegh Bahadur's life and writings, and cannot be accepted as even an approach to history."¹⁸ The view of G.C.Narang will also bear quotation on the question. Commenting on the execution of the Guru, he writes, "In his death the Guru surpassed anything that he had done in his life. He was known throughout Upper India, was highly revered by Rajput Princes, and was actually worshipped by the peasantry of the Punjab. His execution was universally regarded by the Hindus as a sacrifice for their faith. The whole Punjab began to burn with indignation and revenge."¹⁹ The consequences of the tragic end of the Guru were very great. The author of Maasir-i-'Alamgiri gives an indication of the intensity of devotion and the wrath felt by the Sikhs when he writes, "On Friday, the 27th October, 1676/29th Ramzan, 1086 A.H., while the Emperor was returning from the Jama mosque and had alighted from the boat in order to mount the movable chair (Takht-i-Rawan), an ill-fated disciple of Guru Tegh Singh threw two bricks, one of which reached the chair. He was seized by the retinue and ordered to be made over to the Kotwal."²⁰ This is the only reference to the 9th Guru in the History, written by an official of Aurangzeb, and it shows that some of the zealous followers were so fanatically attached to their beloved leader as to risk their lives by attempting at the life of the Emperor whom they considered to be mainly responsible for the tragedy.

younger brother, "has taken possession of his (father's) throne, his property and offerings. This misfortune has befallen me on account of my obedience to thee. My father was opposed to thee on that account, and at his death ordered my younger brother never to be reconciled to thee and never to look upon thy face. Now I pray thee to summon him to Dihli and order him to exhibit miracles as I have done."¹⁷ There is nothing improbable that this misrepresentation of facts may have created a bad impression in the mind of the Emperor.

The fact remains that the 9th Guru has succeeded to the 'Gaddi' in the teeth of strong opposition. This made the Sodhi Khatri, especially Dhir Mal and Ram Rai, his enemies. Ram Rai continued to bear grudge against the 9th Guru also for he was still disgruntled for what he considered to be the deprivation of his rights. He appears to have had an easy access to the Emperor. He is held responsible for the early troubles of the Guru.

The jealousy of his nephew, Dhir Mal, became so pronounced that he hatched a plot to put an end to Guru's life. He sought the services of his 'Masand', Sihan, who at the instigation of his master made an attempt on the Guru's life, but fortunately, the bullet injury did not prove fatal. Being disgusted with the nefarious activities of his envious kinsmen, the Guru had to leave the Panjab for sometime. His relations were always on the look out to hit him below the belt. There is nothing surprising if the 10th Guru burst out with his condemnatory words against the 'Minas' (followers of Prithia), 'Dhir Malias' and the 'Ram Rais' "who had compassed the death of his father", and he enjoined upon his Sikhs to have no social intercourse with them.

Thus the possibility of his relations, having brought about things to such a pass that the 9th Guru had to lose his precious life, cannot be ruled out.

That the Guru was a man of saintly and upright character, completely resigned to the will of God, is to be admitted. We cannot accept the allegations made by some Muslim historians of pillage and rapine, violence and exactions, against the 9th Guru. A close study of his 'Bani' will remove all the misgivings. The Guru, who preferred to be called 'Degh Bahadur' instead of 'Tegh Bahadur' could not be a freebooter. He enjoined upon all to offer their love and devotion to God; shun, evils such as pride, lust, wrath, avarice, jealousy, false pride etc., do good to all; realise the transitoriness of life and the pleasures of the world. He exhorted his disciples to be humble but fearless; treat friends and foes alike; to keep away from the company of evils; to renounce flattery and slander; and to forsake sensual pleasures as poison. Like his predecessors, Guru Tegh Bahadur followed in the footsteps

These lines show that the Guru sacrificed himself to support the cause of the wearers of sacred-marks on the forehead and the sacred - thread round the necks, which are the essential emblems of Brahmanical people.

There are, however, difficulties in accepting all that has been handed down by Sikh tradition and also everything about Aurangzeb's alleged efforts at wholesale and forcible conversion of the majority of his subjects - Hindus, Sikhs, and others. Was Aurangzeb such an impractical visionary, devoid of the essential qualities and equipments as a ruler, as not to realise the futility of efforts to attain what was impossible in a country like India? Aurangzeb did encourage and helped the process of conversion and his policy of discrimination, if not of actual persecution of majority of the subjects, is undeniable, and this did redound to the discredit and eventual dissolution and disappearance of the Empire though the hands of his incompetent successors in ensuring such eventuality are also quite visible. We also cannot but consider references in Ahkam-i-'Alamgiri to the Emperor, writing to the local officials, that Guru Gobind Singh wanted to see him. He should be pacified and assured, rendered escort and provided some necessary expenses of the journey out of his property which had been seized. Did the 10th Guru want to apprise the Emperor of the wrongs that had been done to his revered father and to him as a result of the machinations of his enemies and the local officials?

One, however, cannot but help feeling that the Guru was the victim of the jealousy, intrigues, and machinations of his own kith and kin also. Sikh history after Guru Ram Das presents a picture of internal dissensions, mutual jealousies, quarrels and intrigues. The hereditary character of Guruship made the 'Gaddi' a bone of contention among the rival claimants. Prithia, whose claim to 'Gaddi' had been set aside in favour of his younger brother, Guru Arjan, by his revered father, did not allow the 5th Guru to rest in peace as long as the former was alive. He enlisted the support of Sul'hi Khan, a revenue officer of Lahore, and through him not only planned to represent the case of his supersession to the Emperor but also harassed and annoyed the Guru from time to time. He complained to the 'Chaudhris' of Amritsar that the Guru had made no arrangement for his maintenance and that of his brother, Madhav. He conspired with Chandu Shah, Guru's inveterate foe. It is said that both of them misrepresented him at the Imperial Court by saying that Granth, compiled by the Guru, contained derogatory remarks about the Muslims and the Hindus.

Similarly, when Ram Rai was superseded by his younger brother, Har Krishan, he tried to poison the mind of the Emperor. According to the tradition, recorded by Macauliffe, Ram Rai informed the Emperor that his

once exclaimed, "Revered father! who is greater than you whose sacrifice can save the Hindus." On hearing these encouraging words from his son, Guru Tegh Bahadur asked the Kashmiris to go to Delhi and make the following representations to the Emperor: "Guru Tegh Bahadur, the 9th Sikh Guru, is now seated on the throne of the great Guru Nanak, who is protector of faith and religion. First make him a Musalman and then all other people, including ourselves will of our own accord adopt the faith."¹³ The tradition gives the details of the dialogue that commenced between the Guru and the Emperor. At the end of the dialogue the Guru was asked to choose between Islam and death. On his refusal the Guru was subjected to bodily torture. But nothing could swerve him from his beliefs and convictions. He stood steadfast in his faith to the last. The Guru was then asked to work a miracle and to this the Guru's reply was that "a miracle was the wrath of God". On hearing this reply, the Emperor was beside himself with rage and ordered the Guru's execution.¹⁴

Though the recorded reliable sources and formal contemporary chronicles are silent on the point of the cause of the Kashmiri Brahmans being taken up by the Guru,¹⁵ it finds some support from the following lines of "Vichitra Natak" of Guru Gobind Singh:

"He protected the frontal marks and sacrificial threads of the Hindus
And displayed great bravery in the Kal Age.
When he put an end to his life for the sake of holy men
He gave his head but uttered not a groan.
He suffered martyrdom for the sake of his religion;
He gave his head but swerved not from his determination.
God's people would be ashamed
To perform the tricks of mountebanks and cheats.

Having broken his potsherd on the head of the King of Delhi he departed to paradise.

No one else coming into the world acted like Tegh Bahadur.

The world was in mourning for the demise of Tegh Bahadur;
There was weeping for him in the whole world, but rejoicing in paradise."¹⁶

The version of the Patna historian as also of the author of Ibrat Maqal suffers from the defect in that they do not say anything about the outburst of anger on the part of the Emperor, as a result of which "after few days the order of execution was issued." The Muslim version does not give any hint as to the reasons why Aurangzeb after some time ordered the execution of the Guru ~~when~~ during his imprisonment there could be no provocation. This may lend a support to the Sikh version that the refusal of the Guru to embrace Islam provoked the Emperor to order his execution.

As regards the Sikhs, they have got a totally different account to give. The Sikh chronicles describe Guru Tegh Bahadur as a man of peaceful disposition, wholly devoted to the cause of his religion and self-sought martyr. According to them the Guru laid down his life for espousing the cause of the Kashmiri Brahmans, against whom Aurangzeb has unleashed a war of execution. It finds support at the hands of Sir J.N.Sarkar who writes, "He (i.e., the Guru) was drawn into the whirlwind which Aurangzeb had raised by his policy of religious persecution. A soldier and priest could not remain indifferent while his creed was being wantonly attacked and its holy places desecrated. He encouraged the resistance of the Hindus of Kashmir to forcible conversion and openly defied the Emperor. Taken to Delhi, he was cast into prison and called upon to embrace Islam and on his refusal was tortured for five days and then beheaded on a warrant from the Emperor".¹⁰ The only authority cited by the great historian is Khafi Khan though this contemporary historian does not say anything about the Kashmiri Hindus or the wholesale forcible conversion, resorted to by the Emperor. The only reference found in Khafi Khan is to the sack of the Sikh temples and the expulsion of the Guru's 'Masands' from the cities.

Macauliffe writes on the basis of Sikh version that Sher Afghan Khan, the Emperor's viceroy in Kashmir, "set about converting the Kashmiris by the sword and massacred those who persevered in their adherence to the faith of their forefathers."¹¹ There was no Sher Afghan Khan but Iftikhar Khan as the contemporary governor of Kashmir and there is nothing on record anywhere, except the Sikh tradition, that Iftikhar Khan inflicted oppression and persecution and made forcible converts. The tradition says that the Brahmans were supernaturally informed that Guru Tegh Bahadur, the 9th in succession to Guru Nanak, would protect their honour and faith. Accordingly, a deputation of the Pandits went to Anandpur and waited upon the Guru.¹² They apprised him of their tale of woe. The Guru sat silently for sometime, pondering over the problem. After some interval, he said that the sacrifice of a great man could only alleviate the sufferings of the Hindus and "free the earth from the burden of the Muhammadans." The future Guru Gobind Singh, who was then a child of only nine and was present there, at

and they showed the intensity of their devotion. This writer who has made an initial mistake in taking the 9th Guru as the son of Har Rai does not say as to how and when the Guru had readily responded to the summons and had performed the 'Kornish'. Qasim Lahori next refers to the Emperor's habit of entering into dialogues with the 'Derveshes' who had renounced the world. Ghulam Sarwar Lahori in his printed work "Hadiqat-ul-Aulia" has made mention of Shah Daula Gujrati who died in 1075 A.H. and Sarmad who was killed in 1070 A.H. and one Shah Hasan Ali about whom nothing definite has been given. Obviously, the Guru was also of the same group of saintly personages about whom the Emperor wanted to know more personally. It may be that some interested person had misrepresented the life and activities of the Guru who was called to the court and he readily responded to the summons with clear conscience. He had nothing to hide nor had he anything to explain or any grievance to complain against. Qasim Lahori is, however, tantalizingly silent about the reason of the Emperor flaring up suddenly against the Guru, as a result of which he met with his death. He does not refer to the imprisonment which preceded the order of execution.

Siyar-ul-Mutakherin of Ghulam Hussain Khan is another Persian work which has been so often quoted by both Indian and European writers and has been generally relied upon by the latter. Its wrong translation by Raymond has given rise to confusion as regards the life and Martyrdom of Guru Tegh Bahadur. The original text says only that Hafiz Adam (Hafiz Adam died in December 1643 while on Haj to Mecca and Medina. This was 21 years before Guru Tegh Bahadur came to the gaddi in 1664 A.D.) was a contemporary but there is nothing to warrant the assumption in the translation that he was a close associate of the 9th Guru in what was considered as their nefarious activities.⁸ Moreover, there was no justification for the use of the words "miscreants" and "freebooters" in the translation. The Patna historian is silent about the reason for the issuance of the second order that the imprisoned Guru should be executed and his body torn into pieces, should be exposed to the air.

Mohammad Ali Ansari, the author of "Tarikh-i-Muzaffari" generally agrees with the version given by the Patna historian, Ghulam Hussain Khan, but he makes Adam Hafiz not only a contemporary but also an associate when he says:

” ہر دکن موافق گردیدہ و بجز تعدادی در ملک پنجاب از مردم زبردستی رفتند ” ۹

("Each being conformable with the other exacted money from the people of Punjab by taking recourse to compulsion and oppression").

his son (?) acquired greater dignity and position than his father and very often he indulged in sports and amusements. But on account of the great regards and wide popularity, he became cynosure of all the creatures and became recipient of the goods and chatties of worldly considerations in the form of household goods and furniture and silken or linen cloths besides things in cash and kind, and elephants and horses - all of which he had in plenty so much so that he himself at times put forward claims to sovereignty (Idda-i-Saltmat) and some times the same thing came on the tongues of his followers or disciples. For a long time, with such behaviour, he passed his days in the hills in the environs of Sirhind and Bajwara. At last, in the caliphate period and the graceful regime of His Majesty, Muhammad 'Alamgir Aurangzeb, these kinds of meaningless clamour were very much distasteful to the Emperor because of the impetuosity of his temperament and the jealous and sensitiveness on the question of sovereignty. He would not brook such claims. Since the beginning of his accession, the Emperor very often indulged in discussions with those present and also the 'Darveshes', who were leading the life of retirement, on problems of truth and matters of Divine mysteries. These included a body of people who had renounced all worldly concerns and had given themselves entirely over to piety and contemplation. Such men were Shah Daula Gujrati, Shah Sadruddin Qasuri, and Hazrat Shah Hasan whose court (Dargah) was situated in the vicinity of Shahdara on the other side of the river Ravi in Lahore. The elevated abode was a place of dignity where those people, attracted and abstracted and freed from all forms and ceremonials, sat. Some of them like Sarmad Qalandar, etc., resigned themselves to their fate and chose to drink the syrup of martyrdom from the spring of the sharp sword. At these very times, Guru Tegh Bahadur was also summoned before the exalted presence and he had the felicity of performing the 'Kornish' (salutation). As fate had ordained, he incurred the Emperor's anger and saw death on the back part of his neck (Qafa) and also on his sides."⁷

The important thing that we find in the version, given by Qasim Lahore, is what he calls "Idda-i-Saltmat". We know that this was not the case. There was no political basis in the terminology used though a political colour could be given to it by those who were interested in pulling the legs of the spiritual leader of the Sikhs. It is a fact that the Kings in general, especially the Mughals, were very jealous and felt greatly sensitive about the use of words and expressions by others which they considered their special prerogative. They scented danger where none existed and assumed things for which there was no real basis. Such words and expressions, used by the zealous disciples, though tolerated, they were not suggested by the Masters

Rai twice attempted to poison the mind of the Emperor. He also refers to Dhir Mal and Sodhi Khattris who even attempted to kill the Guru.

Gokul Chand Narang refers to Ram Rai's intrigues and to the assumptions of regal terminology, 'Sachcha Padshah', by the Sikhs for their spiritual leader though he says that the Guru himself was a man of piety, simplicity and humility. He had accompanied his father to the warfare. His father had left his arms to him but "he preferred to be called 'Degh Bahadur' (i.e., Hero of the cooking-pot) than by his war like name His 'darbar' always possessed royal splendour and magnificence' and he was always spoken of and addressed as 'Sachcha Padshah' or True King. Ram Rai was still a favourite at the Imperial court and had never ceased to cherish a hope to be one day installed in his father's place."⁵

Latif also does not paint the Guru in good colours. He says, "From a devout Udasi (i.e., indifferent to the world). in Bengal, the Guru seems to have turned into a regular freebooter in the Punjab."⁶ He also does not mention the source of his information or cites any authority to support the use of his strong language against the Guru.

As regards the Persian accounts, they are, unfortunately, very meagre and inadequate for any definite conclusion and the presence of an element of bias and prejudice in them cannot be ruled out. None of the Persian writers has given the details of the tragedy nor do we find anywhere in the Persian sources anything about the machinations of Ram Rai, about whom much has been written by M'Gregor and Malcolm, both of whom have failed to mention their authority or any independent source of information. They describe the Guru as a political revolutionary and disturber of public peace, a rebel against Government who put forward claims to sovereignty, and a man of power and influence, who assumed the title of 'Sachcha Padshah'. A Persian work well worth noticing, but generally ignored so far, is Ibrat Maqal of Mir Muhammad Qasim, poetically called 'Ibrat', a resident of Lahore. He completed this work in 1144 A.H. or 1731 A.D. The time this book was written was not very far removed from the facts or events, recorded by him. He could not be an eye-witness of the events but he may have heard something from fellow-citizens who might have been still in the know of the things. This does not mean that all he says may be taken on trust and is reliable. Of course, we have to make due allowances to the bitterness that the affairs of the last two Gurus and especially the activities of Banda Bahadur had caused in the minds of the Muslims. The relevant passage is as follows: "Then one named Guru Har Rai came on the scene. Groups after groups of creatures bent their necks down to wear the neckles of submission to him and offered thousands of reverences to him. After him Tegh Bahadur,

rural clans to enter his service, promising them, that he would pay them handsomely and put them in the way of obtaining booty."¹ How could the question of 'Pahal' and reference to Ghoongna with the appellation 'Singh' come in one of the Sakhis. The 'Sakhis' are generally ethical, moralising, and didactic and have little to do with the mundane affairs. How could they contain the least reference to the predatory habits of the Guru? Indubhusan Banerjee is of the opinion that these 'Sakhis' relate more to his son, Guru Gobind Singh, than to Guru Tegh Bahadur. M'Gregor has begun with the miracle working Makhan Shah and the Guru's great rival Ram Rai (Ram Rao). He makes the latter so influential as to cause the arrest and execution of the Guru. Malcolm also writes in the same strain. According to Malcolm the cause of the arrest and final execution of the Guru was "the implacable rancour, jealousy, and ambition of Ram Ray." M'Gregor has made confusion worse confounded. We do not know on what basis M'Gregor refers to the three visits of the Guru to Delhi and where did he find a support for his assertion in regard to the third supposed visit. He writes, "When he reached that city, he was thrown into prison by order of Ram Rao. Some days afterwards he was sent for to the Emperor's presence who had no intention, however, of imprisoning him".² Cunningham also, relying on Raymond's translation of Siyar-ul-Mutakherin, appears to be inclined to find fault with the Guru for such activities as could not but incur the displeasure of the Emperor. To quote his words, "Tegh Bahadur followed the example of his father with inequal footsteps and that, choosing for his haunts the wastes between Hansi and Sultej, he subsisted himself and his disciples by plunder in a way indeed, that rendered him not unpopular with the peasantry."³ The English historian of the Sikhs goes so far as to add that, "Tegh Bahadur powerfully aided in making the disciples of Nanak a material as well as a devotional people. His reverence for the sword of his father and his repeated injunction that his disciples should obey the bearer of his arrows, show more of the Kingly than the priestly spirit, and indeed, about this time the Sikh Gurus came to talk of themselves and to be regarded by their followers as 'Sachcha Padshahs' or as 'Veritable Kings', meaning perhaps, that they governed by just influence and not by the force of arms, or that they guided men to salvation while others controlled their worldly actions."⁴ Indubhusan Banerjee has treated the subject in great details. He has relied largely on Sir J.N.Sarkar's views without examining them critically. He has accepted the Sikh version, recorded by Macauliffe, and some times he contradicts himself. He, like many Indian scholars, holds the Emperor mainly responsible for the execution of the Guru but in another place he attributes the unfortunate and tragic end of the Guru to the internal dissensions within the Sikhs and to the machinations of his nearest relations and rivals. Ram

MARTYRDOM OF GURU TEGH BAHADUR

Dr. Ved Prakash

*Head, Deptt. of History,
G.G.S.College, Patna City.*

The good relations that had existed between the Mughals and the Sikhs upto Guru Ram Das, underwent a marked change and eventually resulted in the unfortunate and tragic execution of the 5th and 9th Gurus. We need not consider here the Martyrdom of Guru Arjun. Like his venerable grandfather (i.e. Guru Arjan), Guru Tegh Bahadur's Martyrdom has become a highly controversial issue owing to the divergent and conflicting views, expressed by the Persian and Sikh Chronicles on the subject. According to Jahangir's Memoirs, Guru Arjan met his tragic end due to the blessings that he gave to the rebel Prince, Khusrau. The Sikh accounts, on the other hand throw the whole blame on Guru Arjan's eldest brother, Prithia (whose claim to 'Gaddi' had been passed over by father in favour of Guru Arjan) and on Chandu Shah, the Imperial 'Diwan' of Lahore, the hands of whose daughter, Sada Kaur, the Guru had refused to accept for his son, Hargobind. We have already treated the subject of the Martyrdom of the 5th Guru earlier in a separate paper. Perhaps more controversial is the case of the Martyrdom of the 9th Guru who was executed on Thursday, the 11th November 1675 or 5th day of the light half of the month of Maghar in Sambat 1732 at Delhi on the spot where Gurudwara Sisganj now stands.

European writers, dealing with the subject, have taken their stand on the inaccurate translation of the relevant portions of *Siyar-ul-Mutakherin* and have not perhaps cared to consult the original. Trumpp has laboured in characterising the Martyrdom as more political than a religious affair and takes his stand on some *Sakhis*. It is difficult to accept the interpretation that he gives or the views that he has expressed. He writes, "The Guru appears by no means as a humble spiritual instructor, but riding at the front of well-armed disciples, who, if not willingly provided, levied contributions on the Zamindars and the inhabitants of the villages through which they passed, and made predatory incursions on the Muhammadan population. The Guru had not only a strong band of Sikhs with him, but he engaged also some

- Bekas, *Dastur-ul amal-i Bekas*, Aligarh Mss. No.954/4 ff.38, 39, Munshi Malikzada, *Nigar Namah-i Munshi*, Aligarh Ms., p.81; *Agrarian System of Mughal India*, Prof.Irfan Habib, p.299, no.7.
23. Appendix B.
 24. For a detailed discussion on the position and powers of Sadr-us sadur or sadr-i kul, Blockmann, H, A'in-i Akbari, A'in, 19, pp.278-284; Ibn Hasan, *The Central Structure of the Mughal Empire*, pp.256-258.
 25. For a critical and detailed discussion of the functions and powers of qazi-ul quzzat, vide, P.Saran, *Provincial Government Under the Mughals*, pp. 339-345; Mirat-i Ahmadi, II, pp.310, 394, 396, supplement, Text, p.173.
 26. Document No.60.
 27. Document No.45.
 28. On 8 May 1766 Najmud-Daulah died in Cholera which had afflicted him after a dinner party given in honour of Lord Clive by Reza Khan at Murshidabad. The English seated Saif-ud-Daulah, his younger brother of 16 years, on the masnud of Bengal, and the management of his household establishment was retained by his mother Munni Begum. By a fresh treaty concluded on 19 May 1766 the Fort William authorities reduced his stipend to Rs.17,78,854- 1-0 from Rs.41,86,131-9-0, for the support of the Nizamat. But Saif-ud-Daulah could not live long, and died in 1770 of small- pox, which in the form of epidemic raged in Murshidabad killing numerous nobles and sweeping thousands of common men. He was succeeded by Mubarak-ud-Daulah (1770-1893), a boy of only 12 years, born of Baboo Begum, another mistress of Mir Jafar. His stipend was further reduced to Rs.31,81,991-9-0 by the treaty formed on 21 March 1770. All powers, civil, criminal, revenue and military now came to be finally resided in the Fort William at Calcutta. Warren Hastings appointed Munni Begum as the guardian of the new Nawab ignoring the just claims of his mother, Baboo Begum. For details, Purnach Majumdar, *The Musnad of Murshidabad, 1704-1904*, Calcutta, 1905, pp.40-45.
 29. Document No.11, dated 3 February 1784.
 30. Document No.34.
 31. Document No.35.
 32. Document No.36.
 33. Document No.41A.
 34. Document No.41b, 41c, 41d, 41e, 41f, 41g.
 35. Document No.41H.

of Bihar, together with the *faujdar* of Rohlas and came to Patna in 1758. He played a leading role in the conclusion of treaties and alliances between the Mughal emperor, Shuja'ud-Daulah and the East India Company after the battle of Buxar, 1764. He has been highly praised for his competence, patronage and spirit of religious tolerance by Ghulam Husain Tabatabai. For details, *Siyar-ul Muta'akhkherin*, Text, II, p.791, Abdul Majeed Khan, *The Transition in Bengal*, Cambridge, 1969, pp.78, 217-18, 135, 342.

8. Document No.26a, 26b.

9. Document No.18, 25b.

10. Document No.25b.

11. Document No.25c.

12. Document No.18b.

13. Document No.27.

14. Document Nos. 17, 18.

The description of the Judicial procedure given by Ray Rayan in his report is different. He states:

When disputes arose on the issue of boundaries of adjoining villages or fields among *zamindars* and a petition was filed by the contestants in the court of *Nazim*, an *amin* (assessor) was deputed with a certificate of authority to investigate and report the real facts of the case. The *amin* enquired the validity of claims from *chaudhriyan* and *qanungoyan* of the interior (*muffassil*), settled the matter in the light of his findings, and realised the rent from *zamindars*. Such cases were outside the jurisdiction of judiciary, because they were dealt by the superintendent (*daroghah*) of *khalisa* department, working under direct supervision of the *Nazim*. If the parties declined to accept the proposal of the *amin* and verdict of *daroghah*, the matter was then referred to the superintendent of the court of law (*adalat*).

Persian Revenue Records of Bengal, Add.6586, f.72b.

15. Document No.7. For full text of documents, Appendix A.

16. Document No.10b.

17. Document No.12a.

18. Document No.10b.

19. Raja Kalyan Singh was the son of Raja Shitab Rai, and author of the famous work, *Khulasat-ut Tawarikh*. He was allowed to act for his father at Patna after the latter's arrest and dismissal from the post of the *naib-subedari* of Bihar. *Journal of the Bihar and Orissa Research Society*, VI, p.430.

20. Document No.12b.

21. Document Nos. 53, 53b, 53c, 54a, 54b, and 54c.

22. Appendix B. For the powers and functions of Mutawalli, Jawahar Mal

Notes & References

1. **Rajballah** was appointed Ray Rayan of Bengal in January 1773, in consideration of his father's loyal services to the Company. His father, Rai Durlab Rai, belonged to the Kayasthas of Dakkhin Rahi branch of Bengal. He had played a pivotal role in the great conspiracy against Siraj-ud-Daulah in 1757, and since then continually occupied pre-eminent position in the administration and politics of the province. For details, S.C.Mukhopadhyaya, *The Career of Durlab Ram Mahindra*, Varanasi, 1974, pp.10-29, 79-126. The Persian Text of his report, dated 1786, presented to Sir John Shore is contained in *Persian Revenue Records of Bengal*, B.M. Ms.Add.6586. Some of its portions have been used in 'Agrarian Structure of Bengal at the Beginning of British Conquest', *Medieval India, A Miscellany*, vol.4, 1977, pp.178-202.
2. Charles Rieu, *Catalogue of the Persian Manuscripts in the British Museum*, 1879, vol.I, p.409, Add. 19,504. In the footnote Rieu has briefly sketched the life of J.M.Murray. "John Macgreogor Murray, of the Bengal establishment, was appointed Colonel in Oct.1737. He acted as military secretary to the Commander-in-Chief in the first Rohilla war, and subsequently as first Secretary and member of the Military board. He was created barronet in 1795, retired from the service in 1798, and died in 1822." *East India Military Calendar*.
3. Persian Revenue Records of Bengal, Add. 6586, ff.56a, 61a, 64a, 65a, 116, 120.
4. Document No.25, dated 1780.
5. Document No.25c.
6. Document No.25b.
7. His family had migrated in the early eighteenth century from Shiraz to Delhi. After the invasion of Delhi the family proceeded to Murshidabad where Aliwardi Khan appointed its members to high positions, and married the daughter of his neice, Rabia Begum, the Reza Khan. Before assuming the charge of deputy Nazim of Bengal in 1765, Reza Khan served as Naib of Dacca, 1763-65. His salary was fixed at nine lakhs of rupees which was later reduced to Rs.5 lakhs per annum. For details of his life and career, vide Ali Muhammad Khan, *Tarikh-i Muzaffari*, Aligarh Ms. No.365/135. ff.310-314; *The Transition in Bengal*, pp.17-102.
8. He was a Saxena Kayastha, and an inhabitant of Delhi. He served as an important officer in the household establishment of Khan-i Dauran, the imperial *Mir Bakhshi*, 1719-1739. But after the death of his patron in 1739 Shitab Rai managed to secure the post of the imperial diwan

**Statement of Taxes other than Land Revenue (Sa'irjihat)
to be collected by the *ta'alluqdar*³⁵**

Mahals

fixed

gaza

(a landing-place where customs were levied)

4 Mahals - Rs.54/- 7-1/2 annas

(fixed)

1. Mulkhad alias Kanakhali

1. mahal - Rs.19/7-1/2 annas

(fixed)

2. Gopalpur

1 mahal - Rs.15/-

(fixed)

3. Yakdah alias Kikhia

1 mahal - fixed, Rs.9/-

4. Khasahok

1 mahal - fixed, one rupee

Mahals

qaza (pertaining to qazi)

1 mahal one rupee

9 mahals - Rs.63-10-1/2 annas

9

Rs.63/-10-1/2 annas

Hat

(weekly markets in villages)

4 mahals - Rs.8/8 annas

(fixed)

1. Jodpur

1. mahal - Rs.2/-

(fixed)

2. Dosarari

1 mahal - Rs.2/-8 annas

(fixed)

3. Chand Kani alias Kanakhali

1 mahal, fixed, Rs.2/-

4. Bekhri

1. mahal, fixed, Rs.2/-

The second document connected with the *sanad* (appointment letter) is surety bond (*muchalka*) executed by Lachhmi Narayan, the *gamungoe* of Bengal for the personal appearance (*hazir zamin*) of Shiv Ram, the *ta'alluqdar*. The other details are same as set forth in the text of the appointment letter.³⁰

The third document³¹ is a copy of written undertaking submitted by Shiv Ram in respect of payment of Rs.301/- as tribute (*peshkash*) to government, (*sarkar wala*).

Mauza ' and *Mahal* the entire
estate (*dar-o-hast*)

Estimated revenue in cash
(*Jama* ' - *i* *raqmi*)

96

Rs.1792/-

The fourth document contains the abstract of signature conveying the orders for issuance of *sanad*, as both the undertakings (*muchalka*) and (*zamin*) duly written were received in the office.³²

The fifth document³³ is also a copy of an abstract of signature regarding the issuance of *sanad* on payment of *nazrana* (presents). Below it is given the statement of recommendation made out of a fresh application presented by Shiv Ram. Through it he informed the government authorities that although he had engaged for 96 villages assessed at Rs.1792/- and submitted a written agreement accepting the terms of engagement, yet he failed to collect the stipulated amount mainly for two reasons. In the first place he found to his dismay that the above-mentioned villages were unpopulated and uncultivated and secondly, the settlement of revenue could not be effected owing to the distribution (*taqsim*) and illusion (*shamil*) of revenue. In the meantime the *chaudhris* of *parganas* brought same villages under cultivation, and without paying the revenue (*mal-wajib*) due to government and proportionate distribution of revenue they appropriated the entire sum of money. I, therefore, accepted the amount of revenue (*jama* ') noted below and hope that the *sanad* of *ta'alluqdari* of the said villages may be issued to me, mentioning separately the names of landholders. This will help me in taking possession of the villages and inhabiting them.

mauza ' and *mahals*,

96

fixed amount of revenue in cash (*muqarrara jama* ' *raqmi*) Rs.1792/-

principal etc.

Rs.1720-10-1/2 *annas*

Reduction,

Rs.17-10-1/2

Detailed description (*taufihat*)

The entire estate,

96

fixed (*muqarrara*)

Rs.1655-10-1/2 *annas*

Then follows the list of names of all the 96 villages (*qarya*) and the total amount of rent is indicated against each of them.³⁴

APPENDIX - C

Copy of a *Ta'alluqdari Sanad* to Shiv Ram, 1765.

Be it known to the present and future accountants (*mutasaddis*), headmen (*chaudhris wa-maqaddams*), *ri'aya* and cultivators (*mazar'ian*) of ~~mauza~~ (*mauza*) Kawadhna etc. in pargana Sultanpur Kharriyah, chakla Jasar in the province of Bengal, the paradise of regions (*jannatul bilad*) that a petition was submitted for approval to exalted, supreme, Shuja'-ul Mulk Hasan'-ad-Daulah Saiyid Najm-un-Din Ali Khan Bahadur Mahabat Jang, and in accordance with it the report (*fard-i haqiqat*) and papers pertaining to written undertaking for engagement (*muchalka*) and payment of tribute (*peschkash*) were signed, convening the orders of appointment of Shiv Ram as *ta'alluqdar* with effect from 1172F/1765 A.D. It is expected that he (Shiv Ram) will exert himself in rendering service assigned to him, and discharge his duties with vigour and earnestness. He will make sincere and persistent endeavours to keep all the cultivating classes and general public satisfied and contented, and promote agriculture in the aforesaid villages so that they become populous and flourishing, and revenues due to government could be realised from them at the time of harvest. He will take necessary steps to prevent thefts and highway-robbery within the limits of his *ta'alluqa*, and guard highway passing through these villages in such a manner that travellers and other wanderers could freely come and go with safety and peace. If theft and robbery occurred he will try to capture the miscreants and recover the stolen goods. He will chastise the robbers and restore the plundered goods to the owners. Failure in the performance of these duties will render him accountable to government. He will send to the office of revenue department all the registers and records prepared according to established rules. The local officers, referred to above, are, therefore, required to look upon the said *ta'alluqdar* as permanent and pay due regard to him in the discharge of his duties. Text of the signature: that *sanad* (deed of appointment) may be issued to Shiv Ram for the *ta'alluqdari* of towns Kawadhna etc., on the basis of written undertaking for payment of *peschkash* (tribute) 1172F/1765, Rs.30/-

Amount of tribute (<i>peschkash</i>) to the Nazim,	Rs.175/-
Amount of presents (<i>nazrana</i>) under the head of <i>subedari</i>	Rs. 75/-
Amount of commission to ----	Rs. 51/-
Total	Rs.301/-
Number of all the villages (<i>mau'za dara-bast</i>),	96
Total assessed revenue (<i>jama'</i>) Rs.1792/- signed by <i>qanungoes</i>	

APPENDIX-B**Text of Agreement Deed in connection with the Appointment of *Mutawalli*
- 3 February, 1784.**

I, Saiyid son of Alam, am *Mutawalli* of recipients of rent-free lands (*a'imma*) and judges (*qazis*) of the province of Bihar. As the authority of enforcing government regulations concerning revenue-free assignees and judges under the charge of *sadarat* has been vested in me by the orders of the governor-general-in-Council with effect from 1191F/1784, I have accepted the appointment and solemnly confirmed in writing that I will do my utmost to perform the functions of the office with honesty, integrity and sincerity. I will endeavour to ascertain and identify (*tashkhis*) all such holders of rent-free grants (*madad-i ma'ash*) and recipients of stipends (*waza'if*) who have died or migrated, and acquire their lands as government property, and stop the preparation of clothes for distribution among them. I will verify and correct all the particulars in respect of the class of grantees who are alive and in possession of assigned lands, and regularize the shares of inheritance bequeathed by the dead or deserters, according to government rules. After 24 months a consolidated statement containing the list of names and particulars of all those who got their grants verified, and of those who did not, alongwith the *sanads* (deeds) of everyone will be sent to the Council. The governor-general-in-Council have fixed a sum of two thousand rupees for Zain-ud-Din Hyder Ali Khan, the *sadr*, and two thousand five hundred rupees for the expenses of my office (*tauliyat*), the total being Rs.4,500/- per annum. Under no condition I will demand not a single penny in excess of the sanctioned amount. If anyone made a complaint in this connection and proved the charge, I will return double the amount taken from him, and be liable to punishment. At the end of the year two thousand rupees will be sent to the Chief Resident at Patna (*saheb-i kalan*) to be given to Zain-du-Din Khan, the *sadr* and the remainder Rs.2500/- I will keep to meet the cost of the office (*tauliyat*). However, in 1782 (1189F) the entire body of recipients of rent-free lands (*a'imma-daran*) had unanimously agreed to pay three *annas* per rupee annually to Zahur-ullah Beg Khan, the *darogha*, in charge of collecting the funds from them. In case the sum of Rs.4500/- could be arranged by realising less than three *annas* per head the rate will be accordingly reduced. I will comply all the commands issued by the *sadar* to me, and I will keep the *a'imma* satisfied and contented by my conduct. If any one of them failed to pay the charges levied, I will report to the authorities concerned.²⁹

APPENDIX - A

The reason for reduction in the rent-roll (*jama'-i tumari*) of Bihar is that *jagirdars*, powerful men, (*mataghalibars*), rent-free assignees (*immdadaran*), and accountants (*mutasaddis*) have manipulated to obtain a written order of acquittance (*sanad-i waqusashi*) under the seals of Naj-ud-Daulah and Saif-ud Daulah,²⁸ and misappropriated money to the amount of Rs.38,85,855-10-4, contrary to all rules in the name of profit (*taufir*). This fact may be confirmed through proper investigations. During the governorships of Mahabat Jang (Aliwardi Khan) and Siraj-ud-Daulah the *jagirdars* received their share in the collection revenue in cash after a deduction of 1/6 from it. But since the time of Jafar Khan, especially under Qasim Ali Khan, *jagirdars* and powerful men of the subah in collusion with the accountants of *Nizamate* stopped the remittances and misappropriated the revenue. At the time of verification of documents (*sanads*) the *jagirdars* do not produce the relevant records showing plots of lands and the amount of annual assessment.

234 lakhs	
67461 biswas	Kaifiyat-i Tumari
	(Statement of rent-roll)
18 bighas	
3-1/2 dhor	Rs.8,30,077-2-1/2 Annas

One hundred bighas according to government rules (*zabita sar- rishta*) was deducted in salaries calculated in dams (dam tankhawhi), 80,000 dams. Everyone obtained from the king, 8,000 dams by way of revenue-free assignments (*aima, altaghma*), and one hundred *bighas* measured land was taken up by the *khalisa* department.

Statement (*kaifiyat*)
 19,5,17,401 *dam kasri*
 statement in rupees per 40 *dams*
 Rs.47,62,335-13-1-1/2 *kanda*
 8 lakhs as deductions from the share of *jagirdars*.
 Rs.8,80,077-2-1/2 *annas*, according to the salary.
 Rs.38,85,855-10-1/2 *annas*

wise person and a teacher in Calcutta *Madrasah*, and for the last three years intimately known to him. His appointment will, therefore, be a source of delight and satisfaction to him.

The *Sadr-us-sadr* in his comment on the letter noted that the only qualification of the candidate stressed by the Governor-General was his close association with Maulvi Ahmad. Sir John Macpherson who succeeded him (Feb. 1785-Sept. 1786) also wrote a commendatory letter to him in this connection. But appointments to such an important post could not be made on that basis.²⁶

Introduction of decennial system of revenue settlement in Bengal in 1790 by Cornwallis, and establishment of a well-organised district administration on firm and rational foundations should have brought significant change in the perceptions and outlook of Indians towards the British Government, and immensely contributed to the popularity of the new Governor-General. This trend is vividly reflected in the petition submitted to him by the citizens of Calcutta when Cornwallis returned from Madras in 1792 after achieving total victory over Tipu Sultan. There is a copy of this petition included in the collection of documents under review, and though it is brief and unsigned, its authenticity is established by its translation into Bengali given below to the Persian text. It stated that the inhabitants (*sakinan*) of Calcutta had prayed for his success in the war, and his arrival made them happy and satisfied. They were deeply grateful to him for the protection, patronage and security he provided to them. He had suppressed the forces of disruption and conflict every where and it appears as if he descended from heaven for guarding and protecting them. All his achievements and acts were in accordance with the Divine commands.²⁷

Thus, the range and diversity of information amassed in these documents is remarkably impressive. Their careful study will be useful not only to supplement and compare the evidence alluded to in the published monographs but also help in formulating theories on the nature and character of the early British administrative system in Bengal and Bihar. Here, introducing the original Persian documents, rarely found in the English source-material, to scholars working on the subject, is the limited object of the present paper.

should be protected against exploitation and high-handedness, and liberal financial help be extended to them through advancement of loans and reduction in rates of rent. Moreover, the changing attitudes and perceptions of British authorities towards the character and conduct of the Indian officers and employees created problems of uneasy relationship among them. The anonymous writer states that the British at the beginning of their rule considered all the Indians working under them corrupt, selfish and mean-minded. Later, they altered their opinion in favour of Muslims, declaring them upright, cultured and straightforward, but at present they reposed trust in Hindus and awarded to them positions of influence and authority everywhere, relatively in larger numbers than other sections (*fariq*) of people of Bengal.²¹

Apart from details of the revenue policies and arrangements of the East India Company, the collection supplies significant information about the essential aspects of the nature, powers and duties of some state-functionaries of the Mughal age who were retained to continue working in their respective special spheres. The evidence is useful in comprehending the dimensions of change and continuity which is the conspicuous feature of this period of transition. For instance, a copy of agreement deed in connection with appointment of Mutawalli of Bihar province, dated 3 February 1784 shows that this office existed and functioned under the direct control of the British Government. It throws light on the mode and rate of contributions imposed on *a'imma* lands in the province of Bihar for the maintenance of the offices of *Mutawalli* and provincial *Sadr*.²² The second important document is a copy of a *ta'aluqdari* sanad to Shiv Ram, 1765, for 96 villages (*ma'uzas*) assessed at Rs.1792/- under signature of qanungoes. He was an independant *ta'aluqdar*, who had directly engaged with government; and his powers and functions were identical with those held by a *zamindar*. The relevant document also contains copies of written agreement (*muchalka*), tribute (*peshkash*) and detailed account of taxes other than land revenue he was entitled to collect from the landing place (*ghat*) and weekly markets (*hat*) in villages under his jurisdiction.²³

The collection also contains copy of a letter of Nawab 'Amadul Mulk Governor-General Mr. Hastings Bahadur Jaladat Jang addressed to *Sadr-us-sadr*²⁴ of *subah* Bengal. In this letter Warren Hastings recommended the appointment of Maulvi Ahmad, elder brother of Maulvi Majdu-Din, to the post of *qazi-ul-quzza*²⁵ (chief qazi of the province) on the death of Maulvi Ghulam Yahya Khan. He asserted that though the *sadr-us-sadr* was vested with descretionary powers to appoint any one he liked to this important post, but on account of his friendship with him (the addressee) he ventured to recommend the case of this candidate. Maulvi Ahmad was a learned and

died, but his son Seeldat Rai was in the service of government.¹⁸ In a report addressed to the chief at Patna the writer informed that Kalyan Singh had set up the office of *khalisa* in the building of a local Imambarah, although the papers relating to *khalisah* which had been amassed in the times of former kings were preserved in the office attached to his residence. The Raja¹⁹ kept in his custody the seals contained in leather bags to affix on records and documents (*sirishta*). He should be directed to send all the papers to be stamped by seal together with the keepers of records (*sirishta-daran*) to him or the members of Council for inspection, without his knowledge no orders should be issued to the officer in charge of a district (*saheb-i zila*) to inquire the economic condition of a village or *mahal*. The subordinate staff of the district officer in collaboration with qanungos should prepare the report. He should not rely entirely on records of *khalisa*, but check them from papers about every village and *mahals* assigned to *jagirdars* which were preserved in the *khalisa* department.²⁰

From the foregoing analysis of the contemporary account of the revenue history of the period it will appear that the Indian criticism was mainly directed against the failure of the British government to set up vigilant and vigorous administrative agencies at the *pargana* level for the supervision of the whole process of revenue settlement and collection and good governance of villages. The executive arm of government did not reach every place in the interior of the countryside (*muffassil*) to exercise restraining influence on the activities of the desperate groups of revenue-collectors-*zamindars*, contractors, *gumashtas*, and *tehsildars*- and redress the wrongs done to peasants by them. Having rendered the old local institutions ineffective and powerless, the Company's government failed to organise in their place some kind of a new administrative machinery to enforce rules and regulations in respect of fiscal and judicial management of villages so frequently issued by its Council at Fort William, Calcutta. It put its exclusive alliance on the terms and conditions of engagements entered into with revenue collectors of different categories, hoping that these will be carried out on lines of strict legal propriety to the satisfaction of government. Events soon showed that such an absolute trust on formal settlements was misplaced, and even the measures of policy, on which these were based, perfunctory and mistaken. The Indian writers rightly argued in their reports that smooth and regular collection of revenue from villages was inseparably linked with the economic condition of cultivators and the extent of productivity in villages. To them the essence of the problem was the resettlement of devastated villages and restoration of legitimacy and effectiveness to the agreements made between tenants and revenue collectors at the time of assessment. They suggested that poor and helpless peasants

food charges (*khurak*). Excepting this expenditure no other amount under any head was expended by them. Again, it was Ray Rayan who submitted to diwan all cases relating to purchase and sale of ta'alluga and lands, in part or whole. The diwan often suggested a compromise formula, or with the consent of plaintiff and defendant appointed an arbitrator to settle the dispute. In this manner other conflicts and quarrels, civil and criminal, were decided, and on no account any delay occurred or expenses incurred. If a dispute arose between a banker and his debtor, the zamindar appointed an arbitrator who settled it. The plaintiff had the freedom and right to submit petition to the Ray Raiyan against the verdict of the arbitrator. The Ray Raiyan held his court and decided the case in the presence of the aggrieved parties. This also entailed no expenses or delay.

He has ascribed the cause of defalcation and heavy arrears of revenue in Bihar during the Diwani period (1765-1772) to the embezzlement of huge amount of revenue by jagirdars, dominant landholders (mutaghaliban) and accountants (mutasddiyan) and holders of charitable grants (sar-shikan). They manipulated, for instance, to obtain a written order of acquittance (sanad-i-waqzasht) for a sum of Rs.38,855-10-4 from Nawab Saiful-Daulah.¹⁵ In another report he informed that in these years of confusion and instability large tracts of khalisah lands were grabbed by a number of persons through fraudulent means. When Shah Alam was staying at Patna, 1759-60, one Sen Pat Kasystha, called Labasi (fictitious) arrived from Delhi and resided in the house of Rai Khel Das in the city. He was an expert in the art of imitating official documents and passing off the false papers as original. He, in collusion with a number of persons, fabricated sanads (written orders) of revenue-free grants (al-taghma) and securing official confirmation seized khalisa lands. For example, the sanad of altaghma for village (mauja) Khawasapur in pargana Hajipur with an area of four hundred bigha was prepared in the name of Ghulam Mustafa. But Sen Pat managed to place his own brother Qudat Singh in possession of the village which in fact had a measured area of one thousand bighas. Later, Qudat Singh sold the assigned land to another person. The writer proposed to the concerned officer that the above-mentioned village should be confiscated by government.¹⁶

Moreover, some landholders (malikan) and headmen (muqaddeman) were continually busy in selling the revenue-yielding lands in the environs of villages by deceitfully transferring them into lands excluded from the rental (kharij jama'), in violation of government rules and regulations.¹⁷ Balwant Rai, the chief qanungo, and his brother Prsadeh Rai had imposed on jagirdars (assignees) taxes under different heads, contrary to rules of sanctioned perquisites and allowances (nankar-wa-dastur). Balwant Rai

subedari administration the writer reported:

When a zamindar fell into arrears and his country became unpopulated, the diwan of the province appointed honest, thrifty and industrious officers (sazawal and amin) to conduct settlement and supervise the work of revenue-collection. They brought large and small tracts of land of the displaced zamindar under their direct authority. Similar treatment was meted out to those zamindars who did not agree with the terms of agreement (ta'ahhud) at the time of settlement, or objected to mutually agreed conditions of the previous year and applied for reduction in the amount of rents. These officers visited every village, inquired into the causes of decline in revenue, examined the revenue papers and submitted a detailed report to the governor (hakim). They consoled the ri'aya and by advancing loans to them inhabited the villages. They collected the rents of the present and previous years strictly in accordance with the terms of bonds' (qaul-wa qarar) exchanged between the amin and cultivator, and deposited the sums in the pargana treasury. Whatever surplus was obtained through increased collection was the profit of government, the zamindar had no claim over it. He only received money during this period which was considered sufficient to meet his needs of food and clothing.¹³

The mechanism devised by the provincial government in resolving disputes and conflicts between the major components of rural society -- zamindars, cultivators and bankers -- was based on the principles of investigation and arbitration. In Bengal the Ray Rayan, the executive head of khalisah, was the Central figure in conducting inquiries through the amin, making proposals to the diwan and announcing the verdict of the Nazim in each case. The distinctive features of the judicial procedure as explained by the anonymous writer in his different reports are summarised in a consolidated form:¹⁴

Whenever disputes and conflicts ensued between two zamindars, the Nazim (governor) directed Ray Rayan, amin and ganungo at the headquarters to investigate and settle the matter to the satisfaction of the aggrieved persons. These officers summoned local witnesses conversant with the location of every field and boundry, recorded their evidence, drew a detailed map of land in dispute, showing the uncultivated area, and presented their report to diwan of the province. The Nazim thoroughly examined the report and in consultation with diwan gave his judgement which was put in force by Ray Rayan. In every case investigations and proposals were necessarily made by Ray Rayan. The zamindars concerned bore the expenses of the amin and his assistants (clerks) under the head of

were accumulated, and even the resident *ra'iyat* migrated to different areas, because no organised agency existed in rural areas to effectively check these abuses.⁹

The suggestion offered by this Indian servant in his report to the English officer for strengthening the local supervision in rural areas is that the present government (*hakim-i waqat*) should institute an inquiry to ascertain the area of cultivated and waste lands, extent of the rise and fall in population, the number of deserters and present occupants, the boundaries of each village, and area of desolated fields.¹⁰ The officers should also investigate the causes responsible for the fall in population as well as decline in revenue-collection. They should also work out proposals as to how the peasants may be compensated for losses sustained by them, and how the amount of rent already remitted may be restored to them. Further, they should determine the assessment of revenue after taking the average produce of the present and previous harvests on easy terms to be set forth in the written agreement (*patta*). He also recommended that the English Officer should be accompanied by the Indian revenue officers like *qamungo*, *mustassadi* (accountant) and *amin*. He further stressed the necessity of involving the Indian servants in the transaction of administrative business at the pargana level, probably keeping in view the serious efforts which both Cornwallis and John Shore were making at that time (1788) to eliminate the Indian element from every branch of *khalisa* department.¹¹ In another report the writer suggested that the rich and independent (*khwush-bash*) farmers could be persuaded to engage in cultivation. In Bengal the poor, helpless, as well as rich and independent cultivators abandoned the occupation of agriculture because of violation of terms of agreement (*patta*) and enhancement of cesses (*abwab*). Under these circumstances, the rich and independent peasants could be brought back to their fields on assurance of fulfilling the pledges made to them at the time of settlement. Such remedial measures could alone, the writer emphasised, accelerate the agricultural production.¹² Every report, containing suggestions for reform, concludes with the remark, 'the decision rests with him' (*ayanda mukhtar and*).

Like his other contemporaries this writer, too, was opposed to the system of revenue-farming (*musta'jiri*) on the ground that the revenue-farmer was not the master (*malik*) of land (*zamin*). He, being mainly interested in earning his own profits, would not try to provide new impetus to agricultural production; rather he would, in the reckless pursuit of his selfish ends, ruin the whole villages. The Mughal governors, therefore, did not lease out the lands on contract basis (*ijarahdari*); nor did they put to auction for sale the estates (*nahals*) belonging to the defaulting and recalcitrant *zamindars*. Dilating on this important characteristic of the

since long owing to frequent changes in the administrative structure at the top level. The mode of summary assessment was recognized by the fiscal authorities, but the principles and methods laid down in connection with settlement and collection bandobast were not fully followed by the revenue-farmers, and huge arrears accumulated at the end of every year. The few cultivators who had stayed on in the villages also quickly left them. With a view to increasing the cultivation and inhabiting lands the members of Council (Sahaban-i Konsul) reduced the rate of rent in every mahal (a fiscal unit of a pargana) in the deed of agreement (patia) issued in 1771, and accordingly adjusted the amount of money due from zamindars and revenue-farmers in proportion to their respective claims (har-hari). These revenue-collectors did not make deductions in the rents of peasants as allowed by government, and continued to realise land taxes from them in a summary manner (sra-sari). But, whatever sums of money they had gained from government became their profits which they were still enjoying. The members of the Council (sahiban), by way of kindness and justice and for convenience and comfort (asani wa- asa'ish) of ri'aya remitted fines (jarimana) and unlawful cesses (abwab) levied on them in previous years. Nevertheless, these favours and concessions produced no impact on villages which were continuously deserted every day by the ever-growing number of peasants.³

He has attributed the failure of Five Years Settlement (1772-1777) to the absence of supervisory and controlling authority in the villages (muffassil) which afforded opportunity to zamindars and revenue-farmers (musta'jiran) and other revenue-collectors (tehsildars and gumashtras) to oppress the peasants and misappropriate the public money. Consequently, the assessed revenue (jama') fixed under this new settlement (bandobast) could not be realised to the last dam and considerable sums of rents remained unpaid. The zamindars and renters (musta'jiran) of Jahangir Nagar and Rajmahal submitted petitions to government for deductions on account of broken embankment of river (darya- shakist) which had ruined their crops. The Council admitted their claims according to terms of agreement. But there were contiguous (sar-basta), developed mahals, and some new settlements, unaffected by this calamity, from which they collected rents without informing the government. If thorough investigation and survey could have been carried out at the time of settlement, government (sarkar) would have certainly gained surplus revenue (kifayat). Moreover, the contractors had been appointed for the duration of five years, but they were replaced every year, because each failed to live up to his undertaking. The cultivators paid more than double to what was originally assessed, in violation of rules and regulations issued by the Council. Every year arrears

affairs into their hands, and they devoted with enthusiasm and sincerity to the increase of the state income and winning the favour of government. At the time of cultivation whatever was agreed (qarar) by the cultivators (ri'ya) the local officers approved (manzur). For this reason the peasants were undoubtedly prosperous and government also gained profit in the collection of taxes.

The British government, continues the same author, depended on the strength of agreement bond (*ta'ahhud*) made with *zaminadars* in the context of management and renting of villages, but it took no steps to protect the interests of peasants against illegal exactions and other acts of oppression. Later, the government put their *zamindari* (right and tenure) to auction for the realisation of outstanding balance (*bqaya*). However, it again entered into engagement with the same *zamindars* who dreading the sale of their *zamindari* strove hard to meet the demand by extorting the amount of money in the name of various innovations (*bid'at*). The condition of villages became worse than it was in previous years. When their petitions against these unjust collections and violence (*ta'addiyan*) were not sympathetically considered by the local officer (*amin*) the cultivators fled away, leaving the fields untilled.⁵

The main factor contributing to the barren state of villages and poor plight of peasants, according to this contemporary writer, was lack of proper care and regard about their affairs on the part of government authorities since the acquisition of *Diwani* in 1765. Briefly tracing the history of this phenomenon he has underscored the need of extending assistance and security to peasants to restore the villages in *muffassil* to their former prosperity. He reported:⁶

Even Muhammad Raza Khan⁷ and Shitab Rai⁸ made no attempts to ameliorate the condition of sub-divisions of districts (muffassil) as they were more concerned with the earning of their own profits. They settled a major portion of jama (estimated revenue) on conjectural basis, and adopted harsh measures in collecting it. In 1770 a severe famine occurred in which large numbers of peasants perished, while others deserted their villages. Consequently, villages turned into wilderness, and government suffered heavy losses of revenue. When in 1773 the Company began to exercise real sovereign authority over the subjugated provinces (mumalik-i-mahrusah) it found itself in a grave financial crisis that had set in the preceeding regimes. In this situation the Supreme Council of the Company introduced the Five Years Settlement (1772-1777), and entrusted the work of revenue-collection to incompetent and ignorant revenue-farmers (musta'jiran). They turned a blind eye to the sufferings and hardships the villagers had been experiencing

in all its essentials, without employing it as a tool of comparison with the contemporary situation. The survey attempted by the anonymous writer of revenue papers under review begins, on the other hand, from the Company's *diwani* era, and is largely devoted to a detailed description of the declining economic conditions of the tillers of soil, and the ever-changing methods and procedure of revenue settlement and collection envisaged by the British authorities since that time. The subject-matter discussed in these two sources of information are divergent, excepting the three important issues of which their perceptions and formulations are in congruence, disclosing their firm confidence in the institutions of the *Nizam*. Both of them stress that (1) the holdings of a defaulting and disobedient *zamindar* were not put to auction for sale, but brought under the direct control of government, and later on restored to him on the pledge of regular payment of dues and good behaviour, (2) no Mughal governor had introduced the system of revenue-farming (*ijaradari*), and (3) in judicial matters the principle of arbitration was preferred in all agrarian and monetary disputes over endless and complicated litigation in the courts of law.³

The common points of historical interest emerging from the study of fragments scattered in the collection under review converge on the following issues. (1) imposition of alien laws, (2) neglect of management in villages, (3) poverty and helplessness of peasants, (4) constant enlargement of areas of uncultivated lands, (5) unnecessary expenses and delays in litigation, (6) usurpation of lands by powerful persons, (7) transformation of *khalisa* lands into revenue-free assignments, (8) need of utilizing the services of Indian revenue officers, (9) non-payment of dues by contractors and *zamindars* and (10) accumulation of arrears.

With regard to the enforcement of uniform alien laws and neglect of administrative arrangements in the interior villages the relevant document states:⁴

The management of towns and villages in the provinces of the king has not been organised on stable and firm basis under the British, from the beginning to the present day. The English issued uniform administrative orders for all villages and towns from the capital city (Calcutta) in accordance with customs and laws prevailing in their own country. You, kind to servants (banda-nawaz), may know that every country has its own laws and norms (rasm wa a'in), especially in this land the canons and laws are different and divergent from the ancient times. How could these be transformed into one uniform code of laws? Any change contrary to this principle will cause disruption. In the former days provincial authorities, relying on subordinate staff in towns and villages, placed the management of

administrative manuals meant to illustrate the mode and style of writing official orders and letters in the Central Secretariat. Some of the records pertain to appointment letters (*sanads*) orders (*perwānas*), memoranda (*yaddasht*), revenue figures (*jama*) of parganas of Bengal, and queries and answers in respect of the origin and character of *zamindari* as an institution or set of rights.

In particular, the memoranda (*yaddasht*) are extremely valuable in that they provide clear insights into the actual internal working of the administrative structure at the *pargana* level, and reflect the Indian response to the general revenue and judicial policies and measures carried out by the British Government during this period of transition. The Indian criticism finds distinct expression in the suggestions and opinions submitted by the Indian employees on various issues through memoranda, presumably at the behest of their superior officers.

The anonymous writer of the memoranda papers expressed dissatisfaction with the current administrative practices and laws by merely focussing on the widespread prosperity and contentment in the country-side (*abadi-wa-ma'muri mulk-wa-faraqhat-i hal ri'aya wa braya*) under the dispensation of *Nizamat*, instead of directly highlighting the effects of chaos and misery resulting from them. His attachment to the old socio-economic pattern of society is markedly manifest in these writings, but he was at the same time concerned with problems of the distress and deteriorating economic condition of peasantry. He sought to solve them by means of recalling the earlier techniques of administration, a device which Ray Rayan also followed in his survey of agrarian institutions in Bengal, Bihar, only a few decades earlier. The contents of the reports were both informative and instructive for the addresses, and their tone and tenor are frank and factual.

His suggestions for solution of problems ensuing from wilful negligence of village management are explained by illustrations from the period of *Nizamat* when the cultivating classes enjoyed a measure of prosperity and peace. The terms adopted by him to distinguish the two systems of rural administration - the one being in the process of construction on the overthrow of the former - are '*amal-i subedari*' (rule of Mughal governors), and '*amal-i Company*' (rule of the Company), no where using the epithet of *Nizamat* generally applied by Raya Raiyan in his report. Ray Raiyan has not drawn any comparison between the two patterns of land-revenue administration, as his historical analysis closes with the regime of Ali Wardi Khan (1741-1756). His analytical account is undoubtedly exhaustive, coherent and incisive, dealing separately with the affairs of Bihar, Bengal and Orissa, and illuminating the agrarian landscape of the past

CONTEMPORARY INDIAN CRITIQUE OF THE COMPANY'S EARLY REVENUE ARRANGEMENTS IN BIHAR, 1765-1784

By Zahiruddin Malik

A vast corpus of literature bearing on various themes of revenue policies and arrangements devised by the East India Company in Bengal, prior to 1793, has been produced by a number of distinguished scholars in India and outside it. Most of the original source material, mainly in English, on which these comprehensive studies are based is also available and well-known to students of the subject. Some contemporary Persian chronicles and revenue records like Calendar of Persian Correspondence and Report of the Ray Rayan¹ have also been utilized by the authors of several works on the British revenue system in Bengal and Bihar. Still there are many extant collections of Persian documents which have escaped the attention of scholars, principally owing to the brevity of notes about their contents as given in catalogues. These notes do not naturally provide sufficient information with regard to the nature of subject-matter or underlying theme of each and every paper contained in the collection, and await thorough investigation from linguistically competent researchers to supplement and correct what the sources in English have already yielded.

One such collection contains, as indicated by Rieu in his descriptive note of it, only "miscellaneous papers, memoranda, returns etc. relating chiefly to the land-tenure and revenue of Bengal and Bihar,"² but a close perusal reveals that it has 150 documents covering a wide spectrum of topics - political, social, religious and economic - spread over 130 pages, written in *shakista*. The collection was made between the years 1788 and 1793 by Colonel Sir John Murray who served as first Secretary and Member of the Military Board in Bengal, retiring from employment of the Company in 1798. He acquired the miscellaneous fragments during the long tenure of his service from different sources, mostly Indian subordinate employees of revenue and judicial departments at Patna, Calcutta, Delhi and other places, but none from the military establishment with which he was so intimately associated. These are copies of original records with dates and specific details, unlike those specimens inserted in some of the earlier Mughal

been supposed to be an autograph copy.

19. V. 2 p.67.
20. Persian Lit. V. 2 p.8 No 16.
21. In the Bankipur Cat. supp. V.2 p.179 a wrong date 940 has been assigned.
22. See the *مذکره خوشنویسان* Bankipur Cat. and Asiatic Soc. Cat.
23. It exists in two Mss. one in possession of the late Prof. Mohd. Shafi of Lahore (O.C.M. Aug. 34 pp.14-15) and the other in the India Office Lib. No 1228, 7. In the *Gulistan-i-Hunar* (Eng. Trans. p.133) the name is given *تازوناز* and it is stated to be in Verse.
24. It has been wrongly written as Zara in *Majalis-un-Nafais* p.52 and in the *Gulistan-i-Hunar* (Eng. Tran.) p.150; vide the *Raudatul Jannat* pp.228-229.

NOTES & REFERENCES

1. The same note with the same date is found on a detached page of a Diwan in Turki available in M.A. Library, Aligarh. This latter Ms was classified as *ادول خاصه اول* while zhar's transcription as. ... دوم
2. Arifi (d.853) was a poet of the time of Shah Rukh (807-850)
3. A copy of the same Mathnawi transcribed by Ali in Herat in 929 which is lodged with M.L. Carlier, Paris, was once a valuable possession in the Library of Emperor Jahangir of India (see Mahdi Bayani: V. I. Part I p. 514).
4. The words are از بابت اموال سلیم سلطان، عظیم
5. Proceedings of the VIII session of Indian Historical Records Commission, 1925, p. 46.
6. The *Alamara-i-Abbasi* states him to have died during the rule of Shah Tahmasp (830-884).
7. See also *Gulistan-i-Hunar* (Eng. Tran.) p. 134n.
8. Mahdi Bayani, V.I pt 2 p. 424.
9. It must be noted that Abdi called Qalandar in *Majalis* is identical with the artist under consideration for the obvious reason that in both the cases the native place is Nishanpur and the art is calligraphy. Besides in the *Tarikh-i-Rashidi* (Oriental College Magazine, May 1934, p. 165) Qalandar Katib is called the 6th outstanding pupil of Sultan Husain Mashhadi. Lastly, some Qitas are available in which Abdi calls himself Abdi Qalandar (see Bayani p. 425).
10. He says: "Of other renowned calligraphists of the present age I must mention Maulana Baqir the son of the illustrious Mulla Mir Ali (Ain., Bloch. Eng Tran. p. 103).
11. *Manaqib-i-Humwaran- Bayani* p.505.
12. Shaikh Farid, a general of Akbar, recieved the title of Murtaza Khan from Jahangir. He died in 1020 A.H.
13. See *Majalisun-Nafais*, p.145 where this line of the poet is quoted:
14. Bayani: *Khushnawisan*, Vol. 1 pt. II p.590.
15. The line is this
نظر بر قرقره توفیق و یمن دولت شاست - بدو کام دل حافظ کر خال بختیاران زو
16. The Gazal opens thus
ستاره بدر خضید و ماه مجلس شد دل رسید و مار ارفیق دمنوس شد
17. It opens:
چمرانه در پئے عزم دیار خود باشم چمرانه خاک کف پای یار خود باشم
18. In *Descriptive Catalogue*, National Museum, New Delhi, p. 91 it has

مقطعات ابن یمن در حاشیه
خسرو شیرین شیخ نظامی در متن

It was written in good Nastaliq within gold ruled and coloured borders with richly illuminated frontispiece by a scribe named Human al-Munshi al-Murshidi in 949 A.H. as is stated in the Colophon:

تم الكتاب بعون الملك الوهاب علي يد اضعف عباده الغني حرم المنشي للرشدي في سنة تسع واربعين وثمانمائة
الهجرة النبوية

The Ms was a rich present from Goa to Abdur Rahim in 993 as is proved by the following note in the Khan's hand:

در تاریخ بهمدونود و سه که در احمد آباد بود بعضی از خدمتگاران را بجست ابتیاع اسباب به گووه فرستاده بود از
گووه جی جی ۰۰ بطریق پیشکش این کتاب را فرستاده بود واستدعائی که نموده بود موافق اراده اسباب به محتاج
رسید حرره عبدالرحیم بن محمد بیرم عفی عنه

The following note also appears on the same page:

در دقتی که جهانگیر بادشاه این غریب را بخدمت دکن همراه شاهزاده پرویز فرستاده این کلیات نواب
خان جهان به بر خوردار عبدالرحیم الملقب به خان عالم فرستادم.

It has a number of seals and *Ard-didas* in the names of the nobles of the Mughal court such as Itimad Khan, *Anbar*, Mansur, Khan Alam and others. This is a very valuable possession of the Museum.

This is a very brief and limited survey of Persian Mss having artistic and historical value, of the Timurid period available in Indian libraries. As time and resources at my disposal were very short I could not visit even some of the known centres; of course a larger number of private collections scattered all over India were out of question. For this I hope to be excused.

This Ms bears important notes and *ard-didas* on four pages, two at the beginning and two at the end in the hands of the Mughal nobles such as Khwaja Suhail, Mohd. Baqir, Nur Mohd., Abdullah Chelpi, Anbar, Daulat, etc. One of the note dated 1038 reads:

الله اکبر
ماه فروردین سنه ۱۰۳۸ هجری حسب الحکم از تحویل غزنی تحویل دولت محمد ادر کتبه خانه محل شد -

It bears seals of Shahjahan, Alam Mir Sayid Ali Hasani, Abdullah and others. The Ms is valuable possessions of the Museum.

Shahnama:

An illustrated and beautifully transcribed and richly *decorated copy of Shahnama* is in possession of Saiyid Zuhur of Patna. Its scribe was Muhammad b. Ahmad b. Haji Istandyaryl-Khushmari al- Katib known as Tarkash Band who copied it on 20th Rajab 869 A.H. It was prepared, according to a note on the 1st page by the scribe for a king called Sultan Amir Rustam with a strange pedigree as follows:

برسم فرزانه السلطان الاعظم الخاقان الاکرم امیر رستم خلد الله تعالی ملک بن مرحوم سالار بن محمد بن سالار بن شالو بن سالار بن کیخاوس بن شهنشاه بن حاتم بن بن ابی منصور بن اسبوزن بن شکاش بن افندی بن خسرو بن فیلساه بن ابی منصور بن شکاش بن شهنشاه بن حارث بن سعد بن عیسی بن حاتم بن عبداللہ بن سعد بن اخشیع بن امر القیس بن محمد بن ... عمر الکندی انار الله برهانیم فی سنه ۸۶۹

It has a number of illustrations in Persian style.

Bayad:

A valuable and interesting copy of a Persian *Bayad* is preserved in the Patiala Museum. Its contents are detailed on the first page:

مانی حظه المجموعه اسرار نامه شیخ عطار در حاشیه
غزلیات مولوی رومی در متن
دیوان خواجو در حاشیه
دیوان سلمان در متن
غزلیات شیخ عراقی در حاشیه
غزلیات شیخ عراقی در متن

transcribed in Nastaliq in 972 A.H.

(ii) The Ms of *Khamasa-i-Nizami* in the possession of Syed Zuhur of Patna copied in his home town of Razah in Bakharz. The colophon runs as follows:

باتمام رسيد و بحسن اختتام انهاميد ختمه حضرت شيخ العارفين نظامي عتق محمد الله وحسن توفيقه كتبه العبد المذنب محمد بن علاء الدين رزه غفر ذنوبه و ستر محبوبه بولایت باختر در قریه رزه صورت تحریر یافت

This is a brilliantly illuminated Ms with a richly decorated frontispiece in very fine Nastaliq calligraphy of which he was a perfect master.

Bustan:

A valuable illustrated Ms of *Bustan* is preserved in the National Museum New Delhi (Ms No 48. 6/4). It was transcribed in India before 908 by a certain scribe named Shahsawar for Sultan Nasir Shah s/o Ghiyath Shah s/o Mahmud Shah Khalji. It has 43 illustrations by the artist Haji Mahmud of the *Herat School*. It is one of the rarest Mss copied and illustrated in India prior to the Mughal rule. Besides the note by the scribe telling the circumstances in which the book was transcribed, the following very significant note in the hand of Abdur Rahim Khan-i-Khanan to the effect that the Ms was recieved as a gift on the occasion of the conquest of Ahmad Nagar, appears on the fly-leaf.

در ایام محاصره احمد نگر -- اواسط خرداد الی سنه ۳۵ و اوایل خرداد قعدة ۱۰۰۱ حرره عبدالرحیم

The colophon is not dated but a note on the same page in a different hand is dated 908 A.H.

Chehal Majlis.

It has been copied by Abdur Rahim Raoshan-Qalam in 1020 in Agra as the following colophon shows:

کتبه العبد المذنب عبدالرحیم روشن قلم ستر الله محبوبه تحریرانی شهور ۱۰۲۰ هجری اتمام پذیرفت
بدر السلطنت آگره -

This is exceedingly valuable copy for it was once included in the royal collections of Shahjahan as is evident by the following:

الی
بتاریخ بیست و پنجم بهمن موافق بهشتیم جمادی الثانیه ۱۰۳۷ (که روز جلوس) مبارکست داخل کتبخانه
(نیازمند) درگاه شد حرره شهاب الدین محمد شاه جهان ابن جهانگیر شاه بن اکبر شاه -
بسم الله الرحمن الرحیم

Seal of Muhammad Qutbshah (d.1035)

مهر سلیمان ز حق گشته میر مرا نقش نگین دل است حیدر صفدر مرا

Tafsir-i-Sura-i-Yusuf.

A valuable copy of Jami's above Tafsir is preserved in the National Museum, New Delhi (No 50. 272). It was transcribed in fine bold Nastaliq within gold ruled and coloured borders. Its colophon shows that Mihr Bano Begum, the daughter of Sultan Umar Shaikh Mirza and a disciple of Maulana Jami copied a Ms of the Tafsir which was subsequently revised and corrected by the author himself. But the colophon was added by Nasir Mirza Ghazi which runs as follows:

بسم الله وحسن توفيقه تمام شد تفسیر سوره یوسف من رشحات عین الحیات حضرت قدوة العرفان مولانا نور الدین بن عبد الرحمن جامی..... از دست مرید با اخلاص و سعیده با اختصاص عظمت الاماره مفتخر الجلاله مهر بانو بیگم پوره حضرت اعظم السلطان عمر شیخ میرزا بهادر خلد الله تعالی ملکه و سلطنه و افاض علی العالمین بره و اهلانہ و کصیح فرموده حضرت مصنف سلمه الله تعالی آمین۔ فی بیتم محرم الحرام سنہ اربع و سبعین و ثمانیۃ مائۃ العید المذنب ناصر مرزا غازی

It is not quite clear whether the scribe of the present Ms was Mihr Bano Begum or it is a copy thereof for the Ms does not look so old and corrections and emendations in the hand of Jami are not available in it. It is also not certain that the present colophon is in the hand of Nasir Mirza or a copy thereof for the Mirza may be identical with a relative of Babur. Similarly one cannot be sure whether the date 874 appearing in the colophon is the date of the transcription of the Ms or of the colophon itself. However, it is almost certain that the words

محمد الله تعالی علی ید مهر بانو بیگم عفی الله عنہا ۸۷۴

appearing in the space above the colophon in bold letters are in a different hand.

Muhammad b. Alaud-Din Bakharzi

He is the same calligrapher whose transcription of Hatifi's Timur Name has been discussed above. He was a resident of Razah²⁴ in Bakharz and, his two more specimens are available to us.

- (i) The Ms of Khamsa-i-Jami, Raza Library, Rampur Ms No 4156

Muzakkir-i-Ahbab. It is a Persian supplement to Nawi's *Majalis-Nafais* written by Bahaud-Din Hasan Nithari Bukhari in 974 A.H. in Bukhara in the reign of Sultan Abdullah Bahadur Khan Uzbek. It contains notices of those poets including Sultans, nobles and learned men who were in Bukhara in the middle of the 10th century A.H. The Habib Ganj Collection, M.A. Library, Aligarh possesses a very valuable Ms (No 51/1) transcribed by the scribe Mirak in 980 at Samarqand as the colophon indicates:

تم بالحقیر بلده المخطوط سر قند بھجرت النبوتیہ صد و ہشتاد و کتبہ فقیر میرک

This Mirak seems to be identical with the scribe of the copy of the *Diwan-i-Hafiz*, Bankipur Ms No 152 copied in 971 A.H. S. Muhammad Fadlullah, the editor of the *Muzakkir-i-Ahbab* holds him identical with Mirak Kitabdar who copied the unique Ms of the *روضۃ المصیین* in 950 for the library of Sultan Abdul Aziz of Bukhara. The two scribes may not be identical but the illustrated copy of the *روضۃ المصیین* which is preserved in the Salar Jang Museum, Hyderabad (No 988 Jade Room) is a very suitable Ms for our discussion. The scribe of *روضۃ* the is identical with Sultan Mirak mentioned by Mir Ali in his copy of *روضۃ الانوار* copied in 947.

Lawaih-i-Jami: It is a richly decorated and illuminated Ms written within gold-ruled borders on thick gold sprinkled paper by Muhammad Muhsin al-Herawi in 1002 A.H. This Ms was deposited in the royal library of Aurangzeb in 1095 which is apparent by this note

لوائح باجہ گزرانیدہ میر معین چہار دم ربیع الثانی ۱۰۹۶ داخل کتب خانہ سرکار عالی شد۔

It was lent to Shayista Khan for some time and was again in 1097 returned to the royal library. The seal of Qabil Khan and the notes exhibiting the names of Shayista Khan and Muhammad Baqir add to the authenticity of the Ms which is a valuable copy of the Habibganj Collection, M.A. Library, Aligarh (Ms No 21/79)

Majma ul-Bahrain: A good Ms of this poem composed by Katibi (d.838) in two rhymes and two metres is preserved in the Habib Collection Ms No 50/78. This copy had been in the libraries of the kings of Golconda whose seals are stamped as detailed below

Seal of Ibrahim Qutbshah (d. 988)

شہی کہ نقش نگین ساخت ہر آل مقیم بود سپہر کرم قطب شاہ ابراہیم

Seal of Muhammad Quli Qutbshah (d.1020)

ملکہ جهان مرا کہ بذیر نگین شدہ از حکم بادشاہ جهان آفرین شدہ

Abdullah b. Abdullah known as Murshid b. Asil al Husaini on the suggestion of Amir Ali Sher Nawai. The Mss preserved in the Raza Library, Rampur under Nos 2265-66 are not dated and their scribes too are not known.

Sharh-i-Mutawwal:

Al-Sharh al-Mutawwal is a commentary on al-Qazimi's (d.739)

Talkhis al-Miftah by al-Taftazani (d.792). A valuable copy of this commentary is preserved in the Habibganj Collection, M.A. Library, Aligarh. This copy had been in the library of Jahangir who has written the following note on the flyleaf:-

الحمد لله
مطول در علم فصاحت (دبلاخت) بخط سید الفقیهین (دست)
المؤلفین میر سید (شریف) جرجانی..... بعد (طا) خط داخل کتبه خانہ امین (نیازمند)
در گاہ الہی شد سنہ (۱۰ محوس) مطابق ۱۰۲۳ ہجری (حرره) نور الدین جهانگیر بن اکبر بادشاہ غازی

It bears seven seals of which the most legible is that of Inayat Khan Shah Jahani. The other is of Muhammad Hasan Shah Jahani and a third of Abdullah Khan Khanazad Shah Alamgir. The *Ard-dida* of Abdullah Chelpi and a note by Min'im Beg also appear on the page. On the last page the names of Qalij Khan, Khwaja Anbar and Suhail are also visible. This is a note in the hand of Suhail:

بتاریخ ۵ شہرزی بخیر سنہ ۱۶ محوس مبارک بمایون اشرف الدس تحویل در گاہ بسیل شدہ

The above Ms was transcribed by some scribe called سید شریف in 839 A.H. at Herat as the colophon shows:

تمت الکتاب بعون الملک الوهاب علی يد العبد الضعیف سید شریف یوم الثور الرابع من شہر رمضان سنہ ۸۳۹
وٹاشمین وثمانماتنی..... حر (ا) صاحبانہ عن الآلات

The scribe of the book has been identified by the Mughal courtiers as Saiyid Sharif Jurjani (740-816) the most reputed Arabic scholar who had written a شرح on Taftazani's *Mutawwal*. But this assumption is incorrect for Sharif Jurjani had died 23 years before the transcription of the Ms. under consideration. As this copy was transcribed in Herat in 839, it was thought proper to add here a few lines about it. The late Maulana Habibur Rahman Sherwani who had acquired the Ms published an article on the same included in *Maqalat-i-Sherwani*. Thereafter Prof. Mukhtarud-Din Ahmad introduced it in the, مجلہ علوم اسلامیہ vol.8 and reproduced four pages from the same. Both the scholars have refuted the attribution of its transcription to Mir Sharif Jurjani.

این فقیر مستقیم..... الفقیہ محمد (دارالشکوہ) قادری

These specimens of Darashikoh's writing are perfectly similar to that published in the O.O.M. May 1934 p.114.

The notes on fly-leaf of this Ms have been reproduced in the '*Arshi Presentation volume* (1965) by Dr. Bedar p.394.

Another Ms of

Nafahatul-Uns:

This Ms of the *Nafahat* which is preserved in the Habibganj collection M.A. Library, Muslim University, Aligarh under Ms No 22/45 is the transcription of a scribe named Mir Mah. His father was a nephew of Mir Kalanki. This Ms. is written in good Nastaliq within gold ruled borders and is dated 1006. The colophon runs as follows:

بخط سیراہ ابن میر عرب برادرزادہ میر کلنکی کاتب است غفر اللہ لہم فی اواخر شمر ذی الحجہ بتاریخ ۱۰۰۶ فی قریۃ
للاسلام علیہ

As Mir Kalanki was one of the seven outstanding pupils of Mir Ali al-Herawi, a brief introduction of a Ms of his grandson would not be out of place.

Baharistan-i-Jami

An important Ms. of Baharistan dated 895 A.H. is available in the M.A. Library, Aligarh under Ms No A.S.981/81. The colophon runs as under:

تمت کتابہ حدوہ النسخ الشریعۃ فی تاریخ شہر ذی الحجہ سنہ خمس و تسعین و ثمان مائۃ

The script is good Nastaliq. As this Ms was written within the life time of the author and within three years of the completion of the work, its importance cannot be minimised.

Faslul-Khutab:

This is an old and valuable copy of *Faslul Khutab* the wellknown encyclopaedia of sufistic lore, based on the works and sayings of eminent mystics and holy men by Khwaja Muhammad Parsa (d.822). This copy of the Bankipur Library (Ms No 1371) dated Friday 25 Dulhijja A.H. 845, was transcribed only 23 years after the author's death. It is written in learned Naskh with occasional marginal notes, emendations and additions in the same hand as the text itself.

Tuhfa-i-Murshidi and Tuhfatul Faqir il Haqir Ila Hadrat il Amir il Kabir.

These two small biographical treatises in prose were written by

بهترین طار باقال مبارک بال که طیران کند الخ

6. Fatawa-i-Shaibani:

This voluminous volume of foll. 294 was written in compliance with the order of Abul-Fath Muhammad Shaibani Khan (906-12) by Ali b. Muhammad Ali Khwarazmi consisting of legal decisions on various religious matters. The present Ms preserved in the Raza Library, Rampur (under Ms No 615) is written in a Naskh hand by Usman b. Ghaibi Shaikh-Turbati in Ramadan 912. The colophon reads as follows:

قد تم تسوید هذه النسخ الشریفة الموسوم بفتاوی شیبانی بید اضعف الطلاب وافتقر الفقرا الراغبی الی رحمہ اللہ
الہادی عثمان بن غیبی شیخ تربتی غفر اللہ لہ ولوالدیہ و احسن الیہما والیہ فی او اخر شهر رمضان المبارک سنہ
اشاعرہ تسعمائة

The Ms begins with these words:

حمدنی حدی کہ زبان کلام و قلم زبان قصاص و بلغا عرب و نجم از تقریر و ورقم آن عاجز آید

It is divided into various chapters called Kitab and some Kitabs again sub-divided in *Fasls*. Some of the chapters are:

کتاب الطہارة، کتاب الصلوة، کتاب الزکوۃ، کتاب الایمان، کتاب الاعتکاف، کتاب الحج، کتاب النکاح، کتاب
الطلاق، کتاب الصلح، کتاب الودیعی، کتاب العاریہ، کتاب الاجارۃ، کتاب الکالہ، کتاب الجنایات، کتاب
الشکر، کتاب المدد و غیر آنہا۔

Nafhatul-Uns:

A valuable Ms of Jami's Nafahat is available in the Raza Library, Rampur which was for some time in the possession of prince Darashikoh who added some notes on the fly-leaf. Darashikoh was much devoted to Jami and expresses to his indebtedness in the *Safinatul-Aulia* thus:

این فقیر ہمیشہ تصانیف نظم و نثر ایشان را مطالعہ می نماید و از برکت آن کلام حقیقت انتظام فایده ہائی رہاید
و این کتاب (سغنیۃ الاولیاء) را کہ می نویسد بر از تجنیع و شاگردی ایشانست۔

These are the notes on the Ms in the hand of Darashikoh:

این نفحات کہ بسیار صحیح است و ما خود درس خواندہ بہ تصحیح رسانیدہ ایم بتاریخ بہت و بہتم شہر رمضان
المبارک کہ سنہ ۱۰۳۸ ہجری داخل کتبخانہ این نیازمند در گاہ شد حررہ داراشکوہ
بتاریخ بہت و بہتم ماہ ذی قعدہ ۱۰۳۸ ہجری در مقام نوشہرہ توفیق اتمام یافت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ کہ از اجراء اتان بہتر تبہ ثانی بشرف مطالعہ این کتاب مستطاب کہ از جملہ تصانیف تمام قایدہ ... دل

واقعه ملال الدین محمد بن محمد البانی

The Ms had been thoroughly revised, and emendations and notes are occasionally found on the margin. It is written in beautiful and very minute Naskh within gold and coloured borders with decorated *Umwans*.

3. Kanzul-Ibad fi Sharh-i-Aurad

The commentator Ali b. Ahmad al-Gauri a resident of Karah, one of the servants . . . (خدم) of Maulana Ruknud-Din wrote the present commentary on the sayings of Shaikh Bahaud-Din. The Ms was copied at Herat, Madrasa-i-Shah Rukh in 895 A.H. in foll. 352 by Nizam b. Husain. Its languages is a mixture of Arabic and Persian. It is preserved in the Farangi Mahal Collection under 398/106 M.A. Library, Aligarh. The colophon runs as follows:

قد اتفق الفراغ من كتابه هذا الكتاب وقت القهر ليوم الثلاثاء السابع عشر من ربيع الثاني سنة خمس وتسعين وثمان مائة في المدرسة الميمونة الشاهرخية ببلدة هرات صاحبها الله عن الآفات على يد العبد الفقير المذنب الراجي إلى رحمة ربه المحيىب نظام بن حسين بن نجيب عفى الله له ولوالديه ولجميع المؤمنين والمؤمنات

4. Risala dar Hai'it:

It is a treatise on astrology which was written for Shaikh Diaud- Din Muhammad who was born about 888 A.H. and was alive in 923 A.H. The name of the author is not mentioned. The Ms was transcribed in Samarqand apparently from the draft of the author after completion of the work. Its scribe was Muhammad Yusuf b. Shamsud-Din Muhammad and it was finished on 10 Jumada II, 923 A.H. The Ms is preserved in the Asiatic Society, Calcutta under Ms No 574.

5. Risala-i-Saidiya:

It is a treatise consisting of 12 Fasl regarding the problems of angling, hunting of animals and birds, and taming of dogs, hawk and falcon etc. and exposition of the legality or otherwise of game. It was dedicated to Sultan Badiuz-Zaman Bahadur Khan b. Sultan Husain Mirza (912-20), perhaps at a time when he was only a prince, for he has been mentioned as:

مخيت السلطنة ومعين الخلافة مريد كامگار سلطان بدیع الزمان بهادر خان

Thus it may have been completed before 911 A.H. Its Ms is preserved in the Raza Library under Ms No 614 which was copied by Hafiz Ibrahim b. Hafiz Abdul Karim Sanbhali in 1192 A.H. The Ms begins:

Fourth Majlis Rabi I, 867.

Fifth Majlis No date assigned.

Sixth Majlis Rabi I, 867.

Seventh Majlis 23 Rabi 867 in the Qubbatul Islam, Herat.

Eighth Majlis No date assigned.

Ninth Majlis Rabi II, 867.

Tenth Majlis, 867.

Eleventh Majlis No date assigned.

Twelfth Majlis gives the completion of the transcription thus:

و قد تمت بحمد الله وحسن توفيقه بسعي العبد المحتاج الى رحمة الله المتعین محسن المسكين ختم الله عمره بالخير.

7. The date of transcription is given at various places:

Beginning of the 8th Majlis;

Beginning of the 11 Majlis

و قد تم فی شهر ذی القعدة سنة تسع وثمانين وثمان مائة هجرية نبوية

At the close of the Ms fol.388a:

و قد تم فی اواخر ذی الحجة سنة تسع وثمانين وثمان مائة الخ

Fol.388b.

تمت الكتاب الروح الدور فی شهر ذی الحجة سنة تسع وثمانين وثمان مائة

The flyleaf bears the seals of Amanat Khan and Lutfullah Khan Khanazad-i-Shah Alamgir.

2. *Mawahibul-Aliyyah*, a correct, valuable and very interesting copy of Husain Waiz Kashifi's well known commentary on the Quran. The Ms (No 1126 Bankipur Library, a most beautifully written one, is dated A.H. 941. It was bequeathed by Jalalud-Din Muhammad b. Muhammad al-Jami to the sacred tomb of his grandfather (ancestor) Ahmad-i-Jam surnamed Zandapil (d. 536 A.H) from where it was stolen and somehow found its way to the Bankipur Library, Patna.

This valuable Ms contains two seals, one small and the other large throughout the copy but all the impressions have been tampered with. The smaller seal seems to read thus:

وقف روضه زنده قبل احمد جام

The large one has the following Rubai:

توفیق جو یافتم ز فضل علام این درج لالی که پذیرفت نظام
از دل گردم وقف اخلاص تمام بر روضه جگ خویشتن احمد جام

In the centre of the seal is found the following inscription:

8. Origin and development of art of writing.

9. Notices on the calligraphers under fifth Bab which consists of three Fasl, sub-divided into two **فصل**, the first of which treats of the ancient calligraphers. The second **فصل** and the entire portion of this *bab* are missing. The artists dealt with are:

ابن مقلد علی بن حلال یاقوت مستعصمی خواجہ ارغون خواجہ عبداللہ صیرفی عبداللہ ہرودی عبدالحق سبزواری
عمر بن سلطان شاہ ہرودی سیف اللہ کرمانی محی الدین حسن عبداللہ مردارید محمود سمرقندی تاج سلمانی
میر عبدالحی مولانا عبداللہ میر علی تبریزی مولانا جعفر مولانا ناظم سلطان علی مشہدی

A similar treatise by Abdullah Sairafi with a different beginning is noticed in J.A.S.B. New Series XIV, 1918 No 8.

The present Ms is in an ordinary Nastaliq transcribed by Muhammad Fadil s/o Shaikh Abdullah s/o Shaikh Ayyub on Ramadan 20, 1120.

An abridgement of the above *Risala* is noticed in the Bankipur Cat. Supp. ii p. 102 under Ms No 2132.

D. Important historical Mss.

1. **Durjud-Durar**: A unique Ms of this history of the Prophet by Amir Saiyid Asilud-Din Abdullah b. Abdur-Rahman al-Husaini al-Shirazi (d. 883 A.H.) is preserved in the Farangi Mahal Collection, No. 99/44 M.A. Library; Muslim University, Aligarh. This Ms was transcribed by Maulana Muinud-Din Herawi known as Muin-i-Miskin (d. 907) in 889 A.H. only 22 years after the completion of the book and 7 years after the death of the author. Maulana Muin was an important writer of the history of the Prophet and his work *Maarij-un-Nubuwwah* is a very popular work on the subject which was finished after 891, though the work was started much earlier. The present Ms of the *Durjud-Durar* is very significant in view of the following:

1. It is the oldest Ms.
2. Its scribe is an outstanding scholar who had specialised in the same field.
3. The scribe in each of the twelve parts of the Ms has given the date and the place of composition at the beginning in a very clear and fine Naskh hand.
4. The Ms itself is written in a clear Nastaliq hand.

The note of the scribe gives the dates of the various parts of the book as follows:

First Majlis towards the end of Safar 863 in the Qubbatul Islam, Herat.

Second Majlis Rabi I, 863.

Third Majlis 26 Rabi I, 863.

in 911 upon the death of his father, Majnun hastened to add a few lines as are available in the British Museum Ms.

2. Bankipur Library Ms No 2277. This Ms of 38 foll. is defective at the beginning and opens abruptly with the following verse:

لک با پشت خم زاندم که بودست به پیش بارگاهش در بکود است

It is written in ordinary Nastaliq and is dated Saturday, 3 Rabi II, 1141. The cataloguer while describing the Ms has committed two errors:

1. He has attributed it to Mir Ali al-Katib whom he calls Majnun.
2. He has calculated the date 940 from رسم الخط , though, the date is contained in the words ... رسم خط which give 909 rather than 940.
3. Another copy is preserved in the As.Soc. Library No 1623 (i). The Ms is in a Majmua comprising the following treatises on calligraphy:

1. خطوط سواد. by Majnun, only five babs (ff. 1-28)
2. رسم الخط by Majnun (foll 28-55)

The author has been confounded with Mir Ali and the date of composition is calculated as 940.

3. المختصر المفيد (foll. 57-62), the name of the compiler missing.
4. مختصر الخط , a short treatise based on Sairafi's (foll 65-72)
5. رساله در خط (foll.73-86) by Baba Shah.
6. Another copy of No 4 (foll. 89-94)
7. Several Fragments of Calligraphy (foll. 94-102)

2. Risala-i-Khushnawisi:

The author was Abdullah as-Sairafi but he should not be confounded with his name-sake Khwaja Abdullah Sairafi for both were different personalities. Khwaja Abdullah Sairafi who is also mentioned in the *Risala-i-Khushnawisan*, had lived during the regime of Sultan Abu Said Khan (716-736) and Amir Chaupan (d.728), while the author of the present treatise belonged to the period of Akbar (965-1014) whom he praises on fol 19a. The main subjects treated in this treatise of 35 foll. a copy of which is preserved in the Bankipur Library Ms No 1076, are as follows:

1. The excellence and origin of penmanship.
2. Preparation of ordinary ink
3. Various kinds of pens
4. Six characters viz Muhaqqaq, Thulth, Tauqi, Riqqa, Raihan, Naskh.
5. Instruction relating to paper.
6. Preparation of special kinds of ink.
7. Nibbing the pen and holding it.

4. A small treatise on calligraphy in the metre of Mathnawi *Laila-wa-Majnun* dedicated to Sam Mirza, the author of *Tuhfa-i-Sami*.

The treatise. رسم خط. is not published and a few copies of it are available in Indian collections such as:

1. Raza Library Rampur Ms No 2449. It contains 24 pages in a modern hand. It was transcribed in Lucknow on Safar 1240 by Muhammad Muhsin and revised by Muhammad b. Ghulam Husian on Jumada 3, the same year. The Ms begins:

بیا ای غلام افشانی رقم کن بنام کاتب لوح و قلم کن
رقم سازی بره اشیا کا می پدیدر سفیدی و سیاهی

About his father who was probably his teacher he writes:

خط و شعر مسلم بیشتر بود که این فاضل زمیراث پدر بود
حوالوش بمجربود اصفی که نالی شد به محمود ارفقی
گهی چون عارفی در نکتہ دلفی گهی چون صحنی در نکتہ دلفی
مرا ز اول درین دیرینه کتب ہم استو است و ہم پیراست و ہم اب
دعالم خط بمی تعلیم چون سخ بطاظر بود ز استو گهر سخ
گهر پرداز دریای معانی بحسن خط شده یاقوت ثانی
نموده نامہ یاقوت را ملی بنام صحنی لا به از دی

The title and date of the composition of the treatise, and the patron to whom he dedicated it have been mentioned in these lines:

چه از رسم خوش تارخ دا دم از آتش نام رسم خط نہدام
تماش ساختم برنام شہای کہ قدرش راست گردون بارگاہی
موید بر سر پلاشہای موید ہم بتامید الہی
زہر برکت تابان و انور سپہر سلطنت سلطان مقفر
برای نسخ شہان کاتب غیب نوشتش چون الف بی نقطہ حبیب
نہال کازہ از بلخ جوانی گلی از گلین چنگیز خلای
زہستان کرم آلودہ سردی ز گذار ارم رحما سردوی
بیا بجنون در انصاف بگشای زحد خویشتن بیرون منہ پای
خداوندا بذات بی مشائ بحق حرمت جاہ و عیالات
کہ دانش بر فراز تخت شہای کہ گیرد از سفیدی تا سیاهی

These lines suggest that the treatise had been composed before the prince set on the throne. But when the prince Muzaffer was crowned as king

The subsequent note runs as follows:

این مرقع بعد استخار از سلاطین خراسان و هرات در کتخانه شهبان هندوستان رسید چنانچه دستخط
نورالدین جهانگیر بادشاه ازان نشان می دهد..... ماه خوال ۱۱۵۲ -

Of the important seals and notes the seal of Inayat Khan Shahjahani and the signature of Abdullah Chelpi deserve special notice. Some of the *Ard-didas* are dated: 24th Zil Hijja, 1060; 25th Muharram 1069; 26th Rajab 1069.

On fol. 1b the Diwan begins with a poem of seven lines in praise of God. The first and the last lines are as follows:

ای حبیبک دین کیلیب حمد ینک ولاصی ثنا
اول جو عاجز بولسه وصف ینک کم قیلا الغای باما
لطف اتیب عشاق ارا یارب نوا قیغیل تعیب
تاچمین ینک مقای بولسای بودار فنا

The page is profusely decorated and illuminated. The lines in blue ink are transcribed in an elegant Nastaliq calligraphy. The size of the folio measures 15"x 12". The Ms had occupied the place of the 1st order in the library.

(C) Rare biographical works on calligraphy:

1. Risala-i-Rasmul-Khat

The author of this small versified treatise on calligraphy was Majnun son of Kamalud-Din Mahmud Rafiqi of Herat. It contains more than 400 verses composed in a month's time in the year 909²¹, the date of composition to be calculated from words رسم خط

Majnun has been confounded²² with Mir Ali al-Herawi, though the fact is that both are separate personalities.

Majnun is the author of some other treatise such as:

1. رساله خط و سواد a small treatise in prose on calligraphy which has been published in Oriental College Magazine, Lahore Vol. XI by Yasin Niyazi.

2. رساله وضع نسخ و تعلیق a small treatise²³ in verse on the same subject is noticed in Rieu 11 p. 532 No. 111 and Ethe, Bodl. Lib. Cat. No. 1370.

3. رساله راز و نیاز a small treatise in prose containing imaginary love letters from lovers to beloved and vice versa. Like the رساله رسم الخط it is also dedicated to Prince Muzaffar Mirza son of Sultan Husain Ghazi.

of which **ح** and **هـ** are quite distinct. As it is known that the author had died before 841, we must infer that the middle number was three (ثلاثین in words). Hence Kashi's date of death should possibly be fixed at 831.

Babur's autograph:

Babur, the founder of the Mughal dynasty in India, hailed from Ferghana and he spent the early part of his life in that region. His family was very devotionally attached to Khwaja 'Ubaidullah Ahrar and as a homage to the memory of the saint Babur attempted to translate the Khwaja's treatise: **رسالہ والدیہ ترجمہ** into Turki under the title **رسالہ والدیہ ترجمہ**. This Turki version appears at the beginning of the Rampur Ms. of his Diwan. It contains Babur's own handwriting in the occasional marginal corrections and in the fragment of a Rubai written at the last page. This writing has been attested by an authority of the status of Emperor Shah Jahan:

این رباعی ترکی واسم مبارک **تحقیق خط اعلیٰ حضرت فردوس مکانی** بابر بادشاه غازی انار الله برپا
است **مرده شاه جهان بن جهانگیر بادشاه بن اکبر بادشاه بن همايون بادشاه بن بابر بادشاه**

A facsimile of the Ms was published by Sir Denison Rose in the Journal and Proceedings of Asiatic Society of Bengal, 1910. The page bearing Babur's handwriting has been reproduced by Dr. Abid Raza Bedar in the *'Arshi Presentation* volume 1965. The treatise, **رسالہ والدیہ ترجمہ** has been edited and published by Dr.A.Ayyubi, Muslim University, Aligarh in 1968.

Jahangir's autograph:

Emperor Jahangir's autographs have not been discussed separately. But one detached leaf from a Turki Diwan of some poet bearing a note on fol. 1b in the hand of Jahangir regarding its inclusion in the imperial library is available in M.A. Library, A.M.U., Aligarh. Another note subsequently added, indicates that the lost Ms which belonged to the library of the Timurid Sultans of Khurasan and Herat, somehow found its way into Jahangir's Library. The Emperor's note bears exactly the same date as one appearing on Azhar's calligraphy. It is as follows:

الله اکبر
خاصہ اول پنجم آذر سنہ اداخل کتبخانہ این نیازمند در گاہ الی شد۔ **مرده نور الدین جهانگیر ۱۰۱۳** بن اکبر بادشاه

On the fly-leaf there appear various important notes one of which seems to be in the hand of Ulugh Beg himself which runs as follows:

توفی المولی المحدث الامام اعظم طبیب اللہ مشہود و هو صاحب (حب) الزیچ فی صباح یوم الاربعاء من رمضان سنہ احدی و ثلاثین و ثمان مائتہ بموضع رضا.....

The other note below the seal of one **بن** المتوکل علی اللہ الملک الصمد قطب الدین بن محمد reads as follows:

انقل الی حذو النسخہ بیچ صحیح شرعی ربیع الاول سنہ ۱۹۸۲ ہجری

This Ms seems to have been revised by Ulugh Beg who adds the following note on fol. 152:

حاشیہ لحضرة السلطان الفخیر بیک گورکان
مولانا ای اعظم اکرم حکیم محقق و جبرید قیاسی کمال علوم المتقدمین استاد المتأخرین آنکہ بمدت شش خواند
در شکبای تو عاجز روان بطلیوس ز حکمای تو قاصر زبان بموشر
قدس اللہ روحہ و روح دہم
بعدین الکوکبین درین فصل بانواع ایراد کرده است و بی آنکہ عرض کرد مساوی باشد علی حدہ طریقی
نیاد کرده است هر چند کہ مضمون فصل شامل آن نیز بہست اما موقوف خیلی عمل است بنا بر سہولت موہرہ
دیگر برین عمل گفتہ شد گوئیم جیب تمام عرض را در جیب تمام نصف مابین التوقعین منخط ضرب کنیم و حاصل
را در جدول جیب معکوس کنیم بعدین الکوکبین باشد۔
اگر ہر دو بہت متفق باشد در نصف مابین التوقعین منخط ضرب کنیم و اگر دو بہت مختلف باشد۔
و نیز ہمین موہرہ مسافت میان دو بلد معلوم شود اگر بجای تقویم کوکب طول بند گیریم و بجای عرض کوکب
عرض بلد۔

On fol. 25 there is a note which suggests that the writer viz, Ulugh Beg was the author of a treatise called رسالہ جیب و وتر :

"ماضیہ طاب ثراہ مستقدمان طریقہ نیافتہ اند کہ مطلقاً جیب ثلث قوس معلوم الجیب استخراج توان کرد و
ما طریقہ استنباط کردیم و در شرح آن رسالہ علی حدہ نوشتیم و آن رسالہ موسوم است بر سالہ جیب و وتر و در آن
جیب یک درجہ بطریق جبر و مقابلہ بغیر از مسائل ستہ مشہور بیرون آوردیم۔
ثمان مائہ احدی الف و ثلاثین رسالہ والدیہ رسالہ والدیہ ترجمہ سی
استخرجناھا بالقوة الالہامیۃ عن الحضرة الصمدیۃ۔

One important point that has to be taken into account is that C.A. Storey in his *Persian Literature* refers to the above Ms. and keeping the date 843 in his mind supposes it an autograph copy¹⁹. But this is misunderstanding. The Ms is not the transcription of the author, for according to Storey himself²⁰ Jamshid Kashi had died after 830 and much before 841. Hence the question of his transcribing the book in 843 does not arise.

Regarding the date of Kashi's death, the note on the fly-leaf is significant. The word "ثمان مائہ" is quite legible; the first number seems to be

This is followed by another note which tells us that the author of the *Fusus* had died in Damascus in 638 A.H.

The cataloguer considers the concluding words to be from the pen of the scribe and not the writer. But as the handwriting is fairly different from the other two Mss. attributed to Jami and as there is nothing to show that the concluding words are from the pen of the scribe and not the writer, it would not be quite fair to hold the Ms as an autograph copy.

Ulugh Beg and Jamshid Kashi's autographs: (Autograph Mss of Zij-i-Khaqani and Zij-i-Jadid-i-Sultani).

Zij-i-Khaqani dar Takmil-i-Zij-i-Ilkhani was the original edition completed in 816 under Ulugh Beg's supervision by Ghiyathud-Din Jamshid b. Masud Kashi and divided into six *Maqalas*. *Zij-i-Jadid-i-Sultani* or *Zij-i-Ulugh Beg* is a collection of astronomical tables composed on the basis of the observations of Ulugh Beg and his collaborators namely Qadizada-i-Rumi, Ghiyath-ud-Din Jamshid and Ali Qushchi after the death of the 1st two collaborators and divided into four *Maqalas*.

In the Salar Jang Museum, Hyderabad is included a copy of *Zij-i-Jadid-i-Sultani* covering foll.202 written in excellent calligraphic Naskh and Rika. The colophon may indicate that perhaps it is an autograph copy:

کتبہ در قمر الخ بیگ بن شاه رخ بن تیمور بن گورکان فی سنہ ۸۱۶

It appears that its scribe and the author is Ulugh Beg himself who transcribed it in 848, the date to be calculated from the letters **ح** and **م** **ض**. Its excellent *Urwan*, gold ruled borders and illuminated frontispiece may lend support to its being an autograph Ms. Even the, following note on Fol. 1 may suggest that its scribe was the prince¹⁸ himself:

کتاب زیج میرزا الخ بیگ بخط الخ بیگ من کتب خانہ.....

But the following points tend to create suspicion about the genuineness of the transcription:

1. The word **بن** appearing after Timur seems to be used redundantly.
2. Ulugh Beg has not been claimed to be a calligrapher.
3. Some autographic notes in the hand of Ulugh Beg appear in the margin of Jamshid Kashi's *Zij* which was transcribed in 843. At least at one place the note appears under the head: **حاشیہ حضرت سلطان الخ بیگ گورکان**
This hand is quite different from that of the Ms attributed to him.

Under such circumstances the claim of its being an autograph copy becomes doubtful.

In the Asaffiya Library, now called the Hyderabad State Library, is preserved a Ms of *Zij-i-Khaqani* by Ghiyathud-Din Jamshid Kashi. This Ms of 172 foll. is an old copy dated 843:

تم الکتاب بعون ملک الوهاب فی شہور سنہ ثلث واربعمین وثمانماتہ

(B) AUTOGRAPHS

Now I pass on to the consideration of autograph Mss of some important authors of the Timurid period.

The following three Mss claimed to be in the hand of Maulana Abdur Rahman Jami are preserved in the Bankipur Library.

1) No 185: *Silsilatuz-Zahab* (1st Daftar) and *Diwan*:

This Ms is supposed to be in the author's own handwriting because of the following note appearing on fol. 1a which gives the date of the birth of his own son *Diya-ud-Din* on Shawwal 9,882:

ولادت فرزند ارجمند ضياء الدين يوسف انبت الله تعالى نباتا حسنا في النصف الاخير من ليلة الاربعاء التاسع من شهر شوال سنة اثنى عشر وثمانين وثمانمائة والكتب ابو الفقيه عبد الرحمن بن احمد الجاهلي معني عنه -

Then follow three versified Qitas expressing the date of the birth of the same son. The cataloguer supposes these chronograms to be in the hand of Jami but to me it seems a different hand.

It must however, be noted that the page on which all these writings appear is the last page of some other work whose concluding lines still exist on this page. This fact has not mentioned by the cataloguer.

2.No 1376: *Anis ut-Talibin*:

This exceedingly valuable copy of an abridgement of the *Anis-ut-Talibin*, a collection of discourses and sayings of Khwaja Bahaud- Din Naqshband (d.791) collected by his disciple Salah b-Mubarak Bukhari, seems to have been transcribed by the celebrated Jami. The present abridgment was most probably made by the learned scribe himself. It is written in Naskh hand with marginal notes and emendations and is dated Jamada II,856. The name of the scribe appears thus:

تم بعون الله تعالى شهر جمادى الاول سنة ست وخمسين وثمانمائة على يد الفقير عبد الرحمن جامي تائب الله عليه -

It is to be noticed that its handwriting agrees with that of the foregoing copy which is supposed to be an autograph.

3. Arabic Ms No 879: *Sharh-i-Fusus-ul-Hikam*:

Jami wrote a commentary on the *Fusus-ul-Hikam* and the present Ms. is stated to be an autograph copy on the basis of a note appearing at the end of the Ms.

لقد وفق الفراغ من تلك ختام هذه الفصوص وكشف ومحام هذه النصوص العبد التذلل بالخصوص بين يدي عموم بل بالخصوص عبد الرحمن ابن احمد الجاهلي..... في سلک شهر سنة ست وخمسين وثمانمائة -

page has been attributed to Emperor Shah Jahan. One of two seals reads:

محمد خان خانہ زاد شاہ جهان بادشاہ

The earliest date appearing on the fly-leaf is 996 A.H. This Ms has been introduced by Prof. K.A. Nizami in مجلہ فکر و نظر July, 1961 with three reproductions.

Diwan-i-Hafiz: A unique copy of the poetical works of Hafiz is preserved in the Asafiya Library, Hyderabad in a *Majmu'a* comprising the following poems:

- i) *Kalila-wa-Dimna* (Text foll 1-462)
- ii) *Mantiquit-Tair* (Margin foll 1-272)
- ii) *Diwan-i-Hafiz* (Margin foll 273-462)

The whole *Majmu'a* is from the pen of a single scribe who has neither mentioned his name nor the place of transcription. But the date is quoted on fol-462 at the end of the first poem thus:

و فرغ من کتابتہ یوم الثلثاء ثانی عشر شهر ربیع الاول سنہ ثمان عشر و ثمان مائتہ و الحمد لولی الحمد۔

In the margin of the same page at the end of the *Diwan-i-Hafiz* the following note appears:

تمام شد دیوان مولانا شمس الدین محمد حافظ شیرازی محمد اللہ و حسن توفیقہ

Similarly the following concluding note at the end of the *Mantiquit Tair* on fol-272 margin does not contain the date of transcription:

تمت الکتاب بحون اللہ، و حسن توفیقہ و الصلوٰۃ والسلام علی محمد وآلہ و صحبہ

The Ms is written in the old Nastaliq hand with gold-ruled borders and floral decoration. It is one of the few rarest Mss of Hafiz's *Diwan*.

The portion covering the *Diwan* and the last part of the *Kalila-wa-Dimna* (foll 273-462) had been printed in Facsimile in Hyderabad (a very limited copies) as early as 1946 without any introduction and even the date of transcription is wrongly printed as 918 instead of 818 A.H. The writer has introduced this Ms in the مجلہ علوم اسلامیہ Dec. 1960.

Diwan-i-Hafiz: Another unique copy of the *Diwan* of Hafiz is preserved in the private collection of Sabzposh family at Gorakhpur. It is also in a *Majmu'a* which comprises of *Diwan-i-Hafiz* in the text and *Bustan-i-Sadi* in the margin. The Ms is dated 824 A.H. and the name of the Katib is Muhammad b. Masud b. Abdul (the name obliterated). It is also in a clear old Nastaliq hand transcribed four years earlier than the popular Khaikhalī Ms.

iii) National Museum Ms No 56.512 transcribed in Rabi 1, 865. It is an illustrated Ms written in very fine Nastaliq.

iv) Bankipur Ms No 38 transcribed on Rajab 3, 883 in fine clear Nastaliq with 17 illustrations in Persian style. A note indicates that it was in the library of Qutbshah. It bears seals of Inayatullah Shah Jahani and Abdur Rashid Daylami.

v) M.A. Library, Aligarh Ms No 44/5 transcribed in Rabi, 963 in fine Nastaliq with seven illustrations all in the *Haft-Paika*.

Mss. of Shahnama-i-Firdausi.

1) National Museum Ms No 54-60 transcribed by Mahmud b. Muhammad for Khwaja Nurud-Din Muhammad in elegant Nastaliq in 834 with 90 paintings in Persian style.

2) Raza Library, Rampur Ms No 3909 transcribed by Mahmud b. Muhammad al-Tastatri in fine Nastaliq in Abarquh on 6th Ramdan 840 with illustrations.

3) Bankipur Ms No 1 transcribed by Murshid al-Katibash-Shirazi in fine clear Nastaliq with 23 illustrations on 17th Ramdan 942 A.H. The Ms was presented to Shah Jahan by Ali Mardan Khan. The same scribe transcribed a copy of the *Mukhtar-Nama* (Bankipur Ms No 504) in a beautiful Nastaliq in Shaban 6, 946 A.H.

Asi's Mathnawis (Rampur Mss.)

Asi is the author of three Mathnawis called *Mantiq-ur-Riyahin*, composed in 830, *Arif-wa-Maruf* composed the same year and *Nazir-wa-Manzur* composed in 833. Raza Library, Rampur has a copy of each under Mss. No. 4133, 34 and 35 transcribed in beautiful Nastaliq by the one and the same scribe. One of these is dated 830 which may be doubtful. All the three copies are illustrated in Persian style.

Diwan-i-Hafiz. (Abdur Rahman al-Katib's Calligraphy)

Abdur Rahman was an adept in Nastaliq hand. But we do not know his place of residence and the school of Calligraphy he belonged to. However, a Ms of *Diwan-i-Hafiz* transcribed by him in 971 A.H. is preserved in the M.A. Library, Aligarh (No. 1/124). It is written in good Nastaliq hand within gold-ruled borders with illuminated frontis-piece. It has three illustrations in Persian style. The Ms was in possession of Mughal royalty as is evident from the various notes giving the names of Munim Khan, Muhammad Salih and Khwaja Inayatullah. The words *بند شاه جهان* appearing on the same

Majalisul-Ushshaq: (Bankipur Ms No 663)

This is a valuable copy of *Majalisul-Ushshaq* by Sultan Husain b. Sultan Mansur b. Baiqara b. Umar Shaikh b. Timur Gurgan. It is written in elegant Nastaliq within gold and coloured borders with a profusely illuminated double page *Unwan* at the beginning. The Ms contains 32 illustrations in the finest Persian style. There are several seals and *Ard-didas* on the title page but all are illegible. A note on the same page reads thus:

۹ رجب سنه ۱۱۳۰ از وجه عنایت الله تعالی محمد امین شد۔

The Ms is not dated, but the scribe is Ahmad al-Hafiz al- Shirazi.

A few Mss of artistic value transcribed in the Timurid age but the place of their transcription is either unknown or does not come within the jurisdiction of Timurid empire, are noted below:

1. *Kulliyat-i-Sadi* (M.A. Library, Aligarh, Habib Ganj 9/48). The complete work of Sadi written in a good early Nastaliq hand in 814 A.H. by Jamal Kafi Katib

علی یزید العبد الضعیف اصغر الفقیر الحقیر جمال کافی کاتب فی تاریخ اربع عشر محرم الحرام سنه ۸۱۴

2. Ms. of *Khamasa-i-khusrau*.

i) An old and splendid copy in Diwan Sahib, Madras transcribed perhaps at the end of 8th or the beginning of the 9th century by Samarrah b. Ali. The splendid Ms was in the library of Abraham Adil Shah whose seal along with the seals of Ali Adil Shah and some other nobles are stamped on the fly-leaf. It has 11 fine illustrations. The seal of Ibrahim Adil Shah reads:

ومن یرغب عن ملکا یرایم وانہ لمن الصالحین

The colophon runs as follows:

تمت الکتاب الموسوم بہشت بہشت بعون الله الملك الغنی
حرره العبد الضعیف سمره بن علی وصلى الله على النبي الرحمان

This note appears on the fly-leaf:

کتاب خمسہ خسرو من کتاب خانہ نواب اشرف الدس ابراہیم عادل شاہ

ii) A beautifully written Ms of *Khamasa-i-Khusrau* dated 855 is preserved in Rampur Ms No 4101. It has nine illustrations.

3. Mss of Khamasa-i-Nizami

i) Bankipur Ms No 37 transcribed by Muhammad b. Ali on Safar 20, 835 in fine Nastaliq hand.

ii) M.A. Library, Aligarh Ms No 891. 5514/51 transcribed by Husain Abdullah in Shiraz in Zil Hijja 863. It is in good Nastaliq with 17 illustrations in Persian style.

حضرت عرش آشیانی انارالله برهان تاسال بیست و دوم در عهد دولت شاه بابا تصنیف شده مرده
شاه جهان بادشاه بن جهانگیر بادشاه بن اکبر بادشاه۔

The Ms illustrated by many of the court painters of Akbar containing 112 miniatures is remarkable for the splendour of its illuminations, all of that delicate and highly finished style that was practiced by the foremost artists under the patronage of Emperor Akbar.

Unfortunately the names of most of the artists given at the bottom of each picture have been cut off in binding; the catalogue of the library has succeeded in deciphering 51 names.

The Ms has many *Ard-didas* and official seals of the nobles of the Mughal Court such as محمد باقر عبدالغفور خواجہ بلال خواجہ سہیل

نور محمد and محمد اللہ چلی

It is written in beautiful bold Nastaliq within coloured and gold-ruled borders.

Strictly speaking this Ms does not come within the scope of Timurid Mss; but its inclusion was desirable due to the following facts:

- 1) More than two-thirds of the book covers the history of Timur and his successors in Iran.
- 2) It contains interesting illustrations pertaining to Timur and his successor's adventures perhaps not available anywhere else.
- 3) Though the illustrations are not from contemporary artists, the latter carried forward the tradition of the Iranian school introduced in India by the well-skilled Persian artists who had accompanied Babur to this country.

Some of these illustrations have been published. One coloured picture was reproduced in 1961 calender, published by the Imperial Tobacco Company of India Limited. The same company published two coloured pictures from this Ms in the Calender of 1967.

Diwan-i-Kamal of Khujand (Ms No 193 Bankipur):

A beautiful copy of the Diwan of Kamal of Khujand (d. about 792 A.H.) preserved in the Bankipur Patna Library is dated 886 A.H. It is written in very clear Nastaliq with gold-ruled borders with a double page *Umwan*. One remarkable feature of the Ms is that each Ghazal, Qita, Rubai and Fard has an introductory line written in gold, a line of Amir Shah's (d. 857 A.H.) poems.

خوبی خواجہ لسان الغیب فرستاده شود و جمع آن تغلات نیز رقم کرده شود بمنه و توفیق شب و دو شنبه ذی الحجه سنه ۹۶۲ در شهر دین پناه تحریر یافت۔

Below the note Jahangir has added :

16

در تعمیر بر سر رانارفته بودم در شمار تعویذ الماس تراشیده از سرمن اقتاد شگون این را خوب ندانسته
تغاول بدیوان خواجہ نمودم این غزل برآمد و روز دیگر تعویذ پیدا شد حرره نورالدین جهانگیر ابن اکبر
بادشاه غازی فی محرم سنه ۱۰۲۳

This page has been reproduced at the end of the third volume of the catalogue of the library. One of the notes (fol.115a) in the hand of Jahangir runs as follows:

وقتی که از الماس باس بقصد ملازمت حضرت والد بزرگوار خواہشمند اگرہ بودم در اثناء راہ بخاطر رسیدن تغال
بدیوان حافظ باید نمودم این غزل برآمد ہم سعادت خدمت و رضا جوئی و حاضر بودن در واقعہ ناگزیر دست
داد ہم دولت موردی روزی گشت کہ بعضیہ مضمون این غزل بود در حمید الشانی کشودہ شد راقہ نورالدین
جهانگیر ابن اکبر بادشاه غازی۔

Jahangir's grandson, prince Darashikoh in his *Safinatul Auliya* p.317 alludes to this augury taken by the Emperor on the above mentioned occasion and quotes the entire gazal with the radif " ". He further states that he had seen the note in the hand-writing of the Emperor on the margin of the Diwan-i- Hafiz. It is obvious that the Ms referred to by the prince is the present copy.

As the catalogur has noted down important writings and fully explained the circumstances in which they were written, in the first Volume pp.236-252, 258-59, I need not repeat them here.

The Ms is written in a beautiful perfect Nastaliq by some distinguished calligrapher apparently in the 9th century.

Tarikh-i-Khandan Timuriya (Ms No 551).

It is an excellent and richly illustrated copy of history of Timur and his successors in Iran and of Babur, Humayun and Akbar down to the 22nd year of the latter's reign. The fly-leaf contains the following note in the hand of Shah Jahan:

بسم الله الرحمن الرحيم
این تاریخ کہ مشتملت بر محل احوال حضرت صاحبقران گیتی شان و اولاد اجداد آن حضرت و سوانح ایام

تاج محمد از سنه ۱۱۳۰ هجری قمری کتبه اعلی حضرت علی الله نور الله بن جهانگیر بادشاه بن اکبر بادشاه شد مرده
بنده خرم بن جهانگیر بادشاه۔

Mr. J.H. Blockmann has added the following notes:

"This beautiful collection of choice poems contains on the second leaf the signature of prince Khurram (emperor Shah Jahan)".

"The signature resembles Shah Jahan's signature in J.A.S.B. 1870 pt. 1 plate xii in every detail. Prince Khurram was 14 years old when he wrote this

Sd/- J.H. Blockmann"

The seal of Inayat Khan Shahjehani is found on fol.2a with this note:

بنا بر تاریخ ۲۵ محمادی الاول سنه ۱۰۲۱ عرض دیده شد۔

The Ms is written in very beautiful minute Nastaliq on thick gold shrinkled paper with a beautifully illuminated double page *Umwan*.

Diwan-i-Hafiz (Bankipur Library Ms. No. 151):

This extremely rare Ms is the most valuable possession of the Bankipur Library. It contains ten marginal notes in the hand writing of Emperor Humayun and Jahangir respecting auguries from the Diwan. There is an autographic note on a fly-leaf at the end by Sultan Husain Baiqara who has been claimed in the catalogue to be identical with the last Timurid ruler at Herat. But this attribution is not without suspicion because the name of sultan appearing thus

سلطان حسین بای قراة شیبان سنه ۱۰۸۰ تحویل پسند شد "خود یاشم"

suggests that Suhail was a noble of his court. While a noble of this name is mentioned as Tahwildar of books in the court of Mughal Emperors of India. Secondly this note appears very insignificantly at the bottom whereas being one of the oldest—rather the oldest—note it should have occupied a distinct place. However, this attribution alone has a just claim for the inclusion of the Ms in our discussion.

As stated earlier this valuable Ms is singularly noted for its autographs from the Mughal Emperors, Humayun and Jahangir. The earliest note from the pen of Humayun is as follows:

از لال مصحف که "بیک" برآمد از دیوان حافظ این شاه بیت آمد و چندین بار ابیات مناسب آمده که اگر شرح آن شود کتبانی شود انشاء الله تعالی چون فتح ولایات شرقی و مہارذان آن دیار بمر کردگار خود نذر

preserved in Raza Library, Rampur. The same library possesses two more valuable Mss of the Mir's transcription. They are *Asmaul-Husna* (with translation) dated 987 and *Tuhfatul Muluk* dated 1019.

18. Abdur Rahim Al-Harawi's Calligraphy.

Although Abdur Rahim does not come within the purview of our discussion, yet as he belonged to Herat and had flourished there and on his arrival in India carried forward the tradition of Herat school here it was deemed fit to mention a specimen of his calligraphy.

A fine illustrated Ms of the *Anwar-i-Suhaili* foll. (239) transcribed in a beautiful Nastaliq hand by Abdur Rahim Harawi in 1005 at Lahore, is preserved in the Bharat Kala Bhawan, Banaras Hindu University, Varanasi. It has 27 illustrations of Akbar School. The names of the artists are : Basawan, Jagannath, Farrukh Chela, Dharmadas, Mukund, Miskin, Mahesh, Sanwala, Manohar, Shankar, Lachhman, Madho, Beshandandas and Anand.

19. Shah Khalilullah Bakharzi's Calligraphy:

Shah Khalil according to Zuberi was the royal calligrapher at the court of Ibrahim Adil Shah II of Bijapur. He was subsequently employed to lead the ambassadorial mission to the court of Shah Abbas. As he was the native of Zara in Bakharz (Khurasan) and had imbibed the calligraphic tradition of Herat School, especially of Mir Ali al-Harawi, a brief description of the specimens of his calligraphy is inserted here.

Shah Khalil is stated to have prepared a copy of Ibrahim Adil Shah's book of songs entitled *Kitab-i-Nawras* in 1027 A.H. Eleven pages of the said book in the hand of Shah Khalil has recently been discovered in Hyderabad and now purchased by the National Museum, New Delhi. These pages which testify to the Shah's skill in the art of penmanship, have been reproduced in the *Zakir Presentation Volume*, 1968 by the writer.

A historical Bayad: Ms No 1091 (Bankipur)

This is an exceedingly valuable and beautifully written copy of a Persian anthology bearing an autograph-note by Prince Khurram (afterwards Shah Jahan) and containing choice poems of eminent poets and some Timurid princes such as Sultan Husain Mirza, Muhammad Husain Mirza, Munim Mirza, Gharib Mirza and Amir Ali Sher Nawai.

The following note by prince Khurram appears on p.2

سید

14. Kamal's Specimen of Calligraphy:

Dr. Mahdi Bayani has noticed¹⁴ an artist bearing the name Kamal who had flourished in the tenth century A.H.

وچندین قطعه از خطوط میر علی بروی را دیده‌ام که وی بریده و یا اگر اصل خط به سلیقه آب یازر نوشته شده بود آنرا عزیز کرده است.

As the artist has some association with Mir Ali al-Katib, he has been mentioned here.

In the Bankipur Library there is a Ms of *Subhatul Abrar* (No. 192) which was transcribed by the calligrapher named Kamal in A.H. 927. This Ms is written in a clear Nastaliq hand within coloured borders. He may be identical with his name-sake noticed by Bayani.

15. Khalil b. Durwish Jami's Transcription:

Khalil was a calligrapher of the tenth century of the Muslim era. But he has not been noticed by biographers and historians. Dr. Bayani has referred to three specimens of his calligraphy dated 966, 978 and 968. A Ms. of *Subhatul-Abrar* preserved in the Bankipur Library (Ms No 194) was transcribed by Khalil b. Durwish Muhammad al-Jami in 980. As the name of the scribe completely agrees with what appears in the above cited Mss and as the Ms too is also of quite contemporaneous nature, the scribe seems to be identical with that of above three Mss. The present Ms is written in fine clear Nastaliq within gold and coloured borders.

16. Muhammad al-Katib's Transcription:

Muhammad al-Katib who belonged to a town named Zarah in Bakharz, which has produced such calligraphers as Muhammad Husain, and his nephew Mir Khalil. Muhammad transcribed a splendid copy of Hatifi's *Timur-Nama* in 982 in the city of Balkh. This Ms which is preserved in the M.A. Library, Aligarh is written in a beautiful Nastaliq hand written in gold ruled borders with an illuminated frontispiece on gold sprinkled thick paper. Its illuminated colophon runs as follows:

باتمام رسید و بحسن اختتام انهامید این در لالی از منظومات مولانا عبد الله حاتفی موسوم به ترنانه فی تاریخ شهر رجب المرجب سنه ۹۸۲ کتب العبد المذنب محمد الکاتب رزاه من ولایت باغرز غفر ذنوبه و ستر صوبه بیلده لافره بن حضورت عزیز یافت.

17. Mir Imad's transcription of Jami's Mathnawi:

Mir Imad's calligraphic specimens have not been included in our discussion. But his transcription of Jami's *Subhatul Abrar* dated 973 is an example of superb Nastaliq hand. This exceedingly valuable Ms is

The following note shows that the copy was in possession of Nur-un-Nisa Begum, the wife of Jahangir:

بے ہر قیمت اسوالم نور نسا بیگم

On the flyleaf at the end one note reads thus:

تحويل جناب شیخ فیض از بابت تحويل میر محمد تقی بتاريخ ۲۲ شمر ذی الحجه سنه ۹۹۰ عری دیدہ شد۔

The seals of Shahjahan and Aurangzeb appear on the fly-leaf while several seals bear the dates 984, 987, 990, 992 etc. The flyleaves at the beginning and at the end have been reproduced in the third vol. of the catalogue of the Persian Mss at Bankipur.

2. *Munajat-i-Abdullah Ansari*, Foll 20 (Bankipur Ms No 2067). This exceedingly valuable copy was written in bold Nastaliq by Mahmud b. Ishaq Shihabi in 944 A.H.

3. *Nafhatul Uns* (Rampur, Ms No 2281). This beautiful copy of Jami's *Nafhat* was transcribed by Mahmud b. Ishaq Shihabi in the superb Nastaliq calligraphy.

4. *Khamisa-i-Khusrau* (Rampur Ms No 4102). This richly decorated and profusely coloured and illuminated Ms is the handwork of Mahmud b. Ishaq Shihabi. It contains ten illustrations in the best Persian style. The name of the scribe and the date of transcription A.H. 977 are mentioned in the colophon. The Ms is an excellent model of Persian Nastaliq calligraphy.

5. *Bustan* (Alwar Museum): This is an illustrated copy of Sadi's *Bustan* in a remarkable fine Nastaliq hand by Mahmud b. Ishaq Shihabi in 944 A.H. The Ms has ten illustrations perhaps of Mughal school.

13. Abdul Mumin al-Mazari's transcription:

Abdul Mumin according to Nawai¹³ was a man of piety and virtue. He was devotionally attached to the tomb of Maulana Abdur Rahman Jami and used to compose poems under the pen-name of Mazari. He was a good calligrapher and a copy of Jami's *Nafahtul-Uns* of his transcription is preserved in the Bankipur Library under Ms No 1780. It is written in minute Nastaliq within gold and coloured borders with an illuminated but faded *Unwan*. It is dated 932 and the name of the scribe appears as under:

کتب العبد المذنب المتواری عبد المومن للراوی سنه ۹۳۲

In the Bankipur Cat. Supp. Vol. 1, p. 42 the name of the scribe is wrongly deciphered as:

عبد المومن للراوی

Aubarin-Qalam. He is stated to have died in 1020. A good number of specimens of Muhammad Husain's calligraphy are preserved in Indian Collections some of which are noticed below:

1. **Diwan-i-Mir Hasan** Foll 300 (Bankipur Ms No 132). This Ms was transcribed for the library of Shaikh Farid Bukhari by Muhammad Husain Kashmiri in 1010 in a clear Nastaliq within gold borders.

2. **Khusrau-wa-Shirin** by Mirza Jafer Beg. Foll 63 (Bankipur Ms No 274). It was transcribed by Muhammad Husain Kashmiri in a beautiful clear Nastaliq within gold ruled and coloured borders. The Ms is undated.

3. Persian anthology (Ms No 1090 Bankipur). It is an elegant and beautifully written copy containing choice pieces taken from the prose and poetical works of eminent writers. It is remarkable for a fine specimen of calligraphy due to the penmanship of Muhammad Husain. His autograph is repeatedly found throughout the copy. The Ms is dated at several places at A.H. 1000. Two miniatures of Farrukh and Sankar and two more illustrations are found in it. It is in bold Nastaliq within gold floral borders. One page of this Ms was reproduced in colour by the Imperial Tobacco Company of India Limited in its calendar, Dec. 1967.

12. Muhmud b. Ishaq Shihabi's Calligraphic specimens:

This artist was the most outstanding of all the pupils of Mir Ali al-Katib. Specimens of his calligraphy which are available to me are as follows:

1. **Diwan-i-Kamran** (Foll 34 Ms No 237 Bankipur). This is an exceedingly valuable and unique copy of the Diwan of Mirza Kamran, brother of Emperor Humayun, bearing the autographs of Emperors Jahangir and Shahjahan, and others. The calligrapher wrote it during the life time of the author. The Diwan consists of Ghazals, Qitas, Fards, Rubais and Mathnawis in Persian and Turki arranged in alphabetical order. The Persian portion has been selected, edited and published by the late Professor Mahfuzul Hasan of Calcutta in 1929. The colophon reads thus:

تمت دیوان حضرت الاعلی حفظہ اللہ تعالیٰ عن الآفات والبلایا علی ید العبد الضعیف محمود بن اسحاق الشہابی
المروی علی طریق الاستعمال

on fol. 1a the autograph of Emperor Jahangir runs as follows:

دیوان مرزا کامران کہ عم پدر بزرگوار منست بخط محمود اسحاق شہابی حررہ نور الدین محمد جہانگیر شاہ (ابن) اکبر
سنہ ۲۰ جلوس موافق سنہ ۱۰۳۵ ہجری

On the same page is the following note by the Emperor Shahjahan:

الحمد للہ الذی انزل علی عبدہ والکتاب حررہ شاہجہان ابن جہانگیر شاہ ابن اکبر شاہ

where he is stated to be an expert in Nastaliq writing. It is interesting to note that Bayani himself has referred to Abdi's inclusion in the *Majalis*⁹

The copy of the Diwan of Qasim-i-Anwar preserved in the Bankipur Library (foll 132 Ms No 170) is in the hand of Abdi Nishapuri and is dated 933 A.H. This Ms is written in a fine clear Nastaliq within gold borders with a small illuminated heading at the beginning. The colophon gives the date of transcription as the end of Rajab 933 and the name of the scribe as Abdi al-Nishapuri.

10. Mir Muhammad Baqir Herawi's calligraphy:

Baqir was the illustrious son of Mir Ali al-Katib who had migrated to India and was attached to the court of Emperor Akbar. Having established his reputation as a master of Nastaliq writing, Baqir has a fair deal at the hands of historian like Abul Fadl.¹⁰ As a pupil¹¹ of his father he had developed such a resemblance with his father's writing that it was difficult to distinguish between the two hands. One instance of such similarity is provided by the Ms No 93 Bankipur Library (*Shish Risala-i-Sa'di*). The colophon indicates that it was transcribed by Mir Ali al-Katib in 944 A.H. But it has been tampered with. It was the transcription of Mir Baqir which is proved by the following autograph of Shah Jahan :

الحمد لله الذي انزل على عبده الكتاب حرره شهاب الدين محمد صاحب قران ثانی شامان خط باقر پسر طایست
نام اورا تراشیده نام پدر نوشته اند۔

In addition to the above, this valuable Ms contains the following autograph of Abdur Rahim dated 1019. He may be identical with Khan-i-Khanan son of Bairam Khan. الذاکبر

12

در شب یک شنبه ۱۰۱۹ بکته خانه نوردیده..... متعلق ساخت حرره عبدالرحیم.....

There are two seals bearing Muhammad Rahim b. Muhammad Bairam and Abul Muzaffar Muhyiud-Din Alamgir Padshah. The Ms is written in a beautiful and clear Nastaliq within gold and coloured borders with a small decorated heading at the beginning. An *ard dida* on the flyleaf reads as:

تاریخ شهر جمید الثانی ۹۸۶ در مقام ادی پور عرض (دیده) شد

11. Muhammad Husain Kashmiri's specimens:

Muhammad Husain Kashmiri was a pupil of Mir Ali al-Katib (see *Miratul-Alam*, Oriental College Magazine, August 34 p.52, *Manaqib Hunarwanan* Bayani p. 505). At first he was attached to the court of Akbar who bestowed on him the title of *Zarrin-Qalam*. On his death the artist entered into the service of Jahangir who conferred on him the title of

7. Dauri's calligraphic specimen.

Dauri whose full name was Sultan Bayazid b. Mir Nizam was a native of Herat and a pupil of Mir Ali al-Katib. Subsequently he migrated to India and lived at the court of Emperor Akbar who bestowed on him the title of Katibul-Mulk. He is stated to have died in 986 A.H. Of his transcriptions is Khusran's *Mathnawi "Dewal Rani Khizr Khan"* now preserved in the National Museum, New Delhi. The Ms has two illustrations of the Mughal school. The colophon runs as:

الفقيه الفخير المذنب سلطان بايزيد ابن مير نظام مشهور به دورى. تبارك بحشر محرم الحرام سنة ٩٨٦

One of the illustrations have been reproduced in "Descriptive Catalogue." Mss from Indian Collections, National Museum, New Delhi 1964. The colophon was published in *Oriental College Magazine*, August 1934. The Ms had a chequered history. It was for some time in the library of Salima Sultan Begum⁴, one of the wives of Emperor Akbar, thereafter in the library of Emperor Shahjahan and lastly in the Kapurthala Library and now in the New Delhi Museum.⁵ It bears number of seals of the nobles of Jahangir's reign.

8. Sultan Husain b. Jamshid's transcription:

Sultan Husain a native of Herat was stated to be one of the pupil's of Muhammad Shadishah, the latter being a pupil of Sultan Muhammad Khandan (*Tarikh-i-Rashidi*, *Oriental College Magazine* May 1934 p.165). As Shadishah is stated to have survived after 950, Sultan Husain may have lived beyond this date. The specimens of his writing are rare and the author of *Raihan-i-Nastaliq* (compiled in 989) mentions one copy of *Subhatul-Abrar* transcribed by Sultan Husain. A copy of Jami's *Yusuf Zulaikha* is preserved in the M.A. Library, Muslim University, Aligarh 2/88 University Collection, which is transcribed by Sultan Husain b. Jamshid of Herat in 963. The Ms is a good piece of Nastaliq hand. The colophon runs as under:

وقع الفراغ من كتابتي في اواخر شهر ربيع الاول سنة ثلاث وستين تسع مائة بدار الفارغة بخارا رحمت من البلايا
يد الفقيه الفريب المهور سلطان حسين ابن جمشيد المروى غفر ذنوبهما.

9. 'Abdi Nishapuri's transcription:

Abdi whose proper name was Abdullah b. Hasan was a native of Nishapur and a pupil of Mir Ali. He excelled in the art of Nastaliq calligraphy and is stated to have died about 955⁶ (*Tuhfa-i-Sami*)⁷. But Mahdi Bayani claims that he had lived beyond 996 on the basis of a Qita of the same date. But this observation is incorrect. Bayani⁸ fixes his age in 996 A.H. at 90 years. Thus his date of birth would be 906. This is untenable because Abdi is included in the *Majalisun-Nafais* (p.148) written in 896

within gold ruled and illuminated borders. The illuminated colophon runs as follows:

تمت الكتاب بعناية الملك الوهاب في شهر ربيع الثاني سنة احدى وثلاثين وتسعمائة كتبها العبد المذنب محمد نور
غفر ذنوبه وستر محبه

5. Shah Muhammad's Specimens:

A scribe of the same name has been stated to belong to Mashhad. But we have no direct evidence to show that the present artist is identical with him. But Shah Muhammad al-Katib seems to belong to the same region. Two specimens of his calligraphy which are preserved in the Bankipur collection provide ample proof to his best skill in the art of Nastaliq calligraphy. These are:

1. **Haft Aurang** foll 284, (Bankipur Ms No 182) It is an excellent copy of Jami's seven Mathnawis transcribed on the 1st Ramadan 908 in a beautiful Nastaliq hand in four columns, within gold and coloured borders. The first two pages at the beginning of each book are abundantly adorned. The headings are written on floral gold grounds. The colophon reads:

تمت الكتاب بقرآن في ربيع الثاني سنة ٩٠٨ شاه محمد الكاتب

on foll 167b and 191 appear two illustrations in good Persian style.

2. **Shah Nama** foll 538 (Bankipur Ms No 2) It is a beautiful copy of the *Shah Nama* with the preface of Mirza Baysungor written in a perfect Nastaliq in four columns adorned with two richly coloured and beautifully designed full-page decoration and preserved in the original binding. It is transcribed by Shah Muhammad al-Katib and has 27 fine Persian illustrations within light gold forest scenes and ornamented borders. The scribe's name appears at the end.

6. Mahmud b. Hasan al-Herwai's transcription:

Mahmud belonged to Herat but details of his career are not available. He was no doubt a master calligraphist which is fully borne out by the single specimen of his Nastaliq calligraphy available in the form of *Haft Aurang-i-Jami* (Bankipur Ms No 183). It is written in a clear Nastaliq in four columns, within gold-ruled borders with an illuminated Unwan at the beginning and a decorated heading at the beginning of each book. According to the colophon the Ms was written in the Madrasa-i-Jalaliya at Herat at the end of Ramadan 928 A.H.

the last folio, indicate its possession by Nurjahan,

قیمت پانصد روپیہ از بابت نور جهان بیگم

The page bearing the autographical note by Shahjahan has been reproduced in colour in the Calender Nov.1967 by Imperial Tobacco Company of India Limited.

XII. *Subhatul Abrar* (Ms Diwan Sahib Madras). It is a splendid Ms of Jami's *Subhatul Abrar* which was transcribed in a beautiful Nastaliq hand by Mir Ali al-Kitab whose name appears in the colophon. The Ms has two illustrations on fol. 62b and 65a.

4. Sultan Muhammad b. Nurullah's specimens of calligraphy:

Sultan Muhammad who is also called Sultan Muhammad-i-Nur or Sultan Muhammad Nur, was one of the most reputed pupils of Sultan Ali Mashhadi. He had been in the service of Mir Ali Sher Nawai and stated to have died about 940. Some specimens of his calligraphy are as follows:

(i) *Subhatul-Abrar* (Bankipur Ms No 191):

This valuable copy of the *Subhatul-Abrar*, the 4th Mathnawi of Jami is due to the penmanship of Sultan Muhammad Nur. It is written in a fine minute Nastaliq within gold and coloured borders with a fine illuminated *Unwan* of which foll. 14b, 15a, 29a, and 97a contain beautiful illustrations in the Persian style. The scribe gives the date of transcription, 15th Ziqa'dah 913 in the following line:

این کتابت کہ نسخہ اہیت بدیع عاقبت محمود
ہندہ سلطان محمد بن نور درچہ ماہ وچہ سال ثبت نمود
پانزدہ روز رفتہ از ذی قعد سال ہجرت کتابت من بود

(ii) *Kalila wa-Dimna* (Rampur Ms No 2982)

A valuable copy of Nasrullah Bahramshahi's *Kalila wa Dimna* transcribed by Sultan Muhammad Nur is available in the Raza Library, Rampur. It is written in a beautiful Nastaliq calligraphy within illuminated and richly decorated borders with gilded *Unwans* and head-pieces. It has several illustrations in the Persian style. The Ms is not dated but its illustrations are old and genuine.

(iii) *Diwan-i-Hafiz*: (Rampur Ms No 3272).

It is a valuable Ms due to the penmanship of Sultan Muhammad Nur who accomplished it in 931. The Ms is transcribed in a perfect Nastaliq hand

این چند سخن که خواجہ میرالدین انصاری صلی اللہ علیہ وسلم وقت خود گفته است اگر بزرگواران دشت با هم که تفریق
توانم کرد گوش را در میان دول را بجا خبر میداد اگر توفیق رفیق گردد هر دو جہان آفرید حضرت شیخ خواجہ
میرالدین چشتی قدس سرہ۔

The names of some other nobles of the Mughal court such as Mulla Salih and Inayat appear on the fly-leaf.

IX. Rasafi Abdullah Ansari: (Rampur No 756). These treatises are bound in a Majmua with the Ms *Sad Pand-i-Luqman* mentioned above. The Ms is dated 945 and is a specimen of superb art of calligraphy. The Ms is profusely decorated and is written within illuminated borders with coloured and gilded *Unwan*.

X. *Sad Pand-i-Luqman*: (Bankipur No 2024). It is an exceedingly valuable and illuminated copy of the moral precepts of Luqman to his son, due to the pen-manship of Ali al-Katib. It is written in bold and perfect Nastaliq within gold lines and illuminated margins. The Ms consists of nine sheets fastened together so as to form a continuous strip. It was transcribed at Bukhara and is dated 949. The colophon runs as follows:

تتمت هذه الرسالة ببلده لاخره بخارا سنة تسع واربعين وثمانمائة كتبها العبد الذنب علي ابي اسحاق۔

XI. Persian anthology: (Bankipur No 1089). It is an exceedingly valuable and most beautifully written copy bearing an autograph-note by Shah Jahan, with many seals and signatures of nobles and distinguished persons of the Mughal Court beg:

ای ذات تو از صفات ما پاک که تو بدون زهد اوراک

The Ms consists of selections mostly from the poetical works of Sadi, Nizami, Khusrāu, Jami and a few others. It was transcribed by Ali al-Katib whose name appears as Ali al-Husaini on fol 14a and 68a and as Ali al-Katib on fol. 44a.

In the autograph-note Emperor Shahjahan says that this valuable Ms was deposited in his library on the auspicious day of his accession viz. the 8th Jumada II, 1037.

بسم الله الرحمن الرحيم
این مجموعہ مندرجہ تحت و بہتم ماہ بہمن موافق ششم شہر جمادی الثانیہ سنہ ۱۰۳۷ کہ روز جلوس مبارک
است داخل شد خانہ نیازمند در گاہ شد حررہ شہاب الدین محمد شاہ جہان بادشاہ ابن جہانگیر بادشاہ بن
اکبر بادشاہ غازی ۲۵ فر دلو سنہ ۲ جلوس تحریر یافت۔

It is written in beautiful Nastaliq with sumptuously decorated *Unwan*. There are two miniatures at the beginning by Riza and two at the end without the painter's name. The seals and other writings have mostly been obliterated. However, the following words found at the bottom of

Khan-i-Khanan in 998 A.H. could not be transcribed by Mir Ali in 937 (sixty one years before).

VII. Matla ul-Anwar: A beautiful copy of Khusrau's Matla-ul-Anwar transcribed by Mir Ali in Bukhara in Shaban 947 for Sultan Abdul Aziz of Bukhara (939-946) is preserved in Bankipur Patna (No 129). Its colophon runs as follows:

تمت علی یہ اضعف الکاتبین والکل العباد السلطانی میر علی الکاتب السلطان الاعلیٰ الاعظم الاکرم معز السلطنه
والدنیاء الدین ابو الغازی سلطان محمد العزیز بہادر خلد اللہ تعالیٰ ملکہ و سلطانہ والافض علی العالمین برہ و احسانہ
فی اواسط شعبان الاعظم سنہ سبع واربعین و تسعمائے ہزار الفارغہ بخارہ باہتمام سلطان میرک کتابدار۔

The Ms. is written in a bold nastaliq within richly illuminated and coloured borders. On foll 150b, 151a, 152b, 153a, appear full page illustrations in the Persian style.

VIII. Sad Pand-i-Luqman (Rampur No 756)

It is a richly decorated Ms of the precepts of Luqman effected by Mir Ali in 945 agreeing with the Bankipur Ms (No 2024) in all its details except this that the place of copying is not mentioned here. It is a very important Ms for it has been in the imperial library of Jahangir and Shah Jahan, and of Princess Jahanara. The following note in Jahangir's hand shows that the Ms was deposited in the 15th year: **الشد اکبر**

بتاریخ سیوم محرم سنہ ۱۵ داخل کتبخانہ این نیازمند در گاہ الہی شد حررہ جهانگیر ابن اکبر۔

Just below this the following note appears:

پند نامہ لقمان حکیم و سخنان عبداللہ انصاری کہ بخط ملا میر علی است از (کتبخانہ حکیم) بمقام است سنہ ۲۔

The Ms was deposited in the library of Emperor Shah Jahan in 1039 A.H.

بسم اللہ الرحمن الرحیم
ایں پند نامہ لقمان حکیم وغیرہ کہ بخط خوب امیر علمیت بتاریخ نیست و پنجم ماہ آبان الہی سنہ ۳ جلوس مطابق
سپتسمبر ربیع الاول سنہ ۱۰۳۹ ہجری در دار الخلافہ اکبر آباد داخل کتبخانہ این نیازمند در گاہ شد۔ حررہ شہاب
الدين محمد شاہ جهان بادشاہ ابن جهانگیر بادشاہ بن اکبر بادشاہ غازی قیمت ہزار روپیہ

The Ms was subsequently given to his daughter, Jahanara:

ایں پند نامہ را در ذی الحجہ ۱۰۴۰ ہجری موافق سنہ ۳ جلوس مبارکہ لفرزند ارجمند سعادت مند برنوردار
کاشکار جهان برابر ملکہ از جهان بہتر جهان آرا حکیم (حدیہ نمودم)

This Ms of the 1st order bears the following note in the hand of Princess Jahanara at the last page:

such copy is preserved in the Bankipur, Patna Library (Ms No 172 foll. 25). It is written on good thick paper in an elegant bold Nastaliq within coloured and gold ruled borders. With headings written in white on gilt and floral grounds.

IV. *Bustan*: This copy of Sadi's *Bustan* which is preserved in the Raza Library, Rampur (No 4070), was transcribed by Mir Ali in 927 at Herat. It is an illustrated Ms with illustrations of Herat School of miniature paintings. The Ms is written in elegant Nastaliq within coloured and gold borders.

V. *Yusuf-Zulaikha*: This excellent copy of Jami's *Mathnawi* was transcribed by Mir Ali and is dated Ramadan 930. It is written in a perfect minute Nastaliq within gold and illuminated borders on fine gilt-edged paper with many coloured and gold floral-designed margins and an adorned double page *Unwan*. Fol 2a and 3a contain two beautifully illuminated stars and foll 1b, 2a, 56b, 60a, 78b, 101b, 152a contain full-page and highly finished illustrations in Persian style. From the exquisite decoration of the Ms the cataloguer of the Bankipur Library (Ms 196) has pointed out that this is the same Ms to which the contemporary historian has referred in the *Maathir-i-Jahangiri* fol. 33a.

دوروز دوشنبه دوم محرم سنه هزار و نوزده دار الخلافه اکبر آباد بسایه بهر آسمان پایه آرایش پذیرفت... و دو
این روز یوسف زلیخای بخط ملا میر علی مصور و مذہب کہ هزار مهر قیمت داشت و سپہ سالار خان خانان بطریق
بیشکش ارسال داشته بود معروفی گردید۔

But the Ms itself has no external evidence to this effect which is quite unusual. The colophon reads as:

تمت الكتاب بعون ملك المستعان على يد العبد الضعيف مير علي قلی او اخر رمضان سنه ثلاثين و تسعمائة بهرینه
الهرات۔

VI. *Waqiat-i-Baburi*: This valuable Ms of the Persian translation of Babur's *Tuzak* was transcribed by Mir Ali in 937. It is written within gold ruled borders with richly decorated frontispiece. It has 18 illustrations by the artists of the Delhi school, their names being written in their respective pictures. It bears six seals, one of Humayun, two of Akbar, one of Jahangir and two of Shahjahan. The colophon reads as:

سنه سبع و ثلاثون و تسعمائة من الهجرة المفضله و حسن توفيقه بيد العبد الضعيف علی الکاتب خفر الله ذنوبه صديقت
اتمام و طریق اختتام یافت۔

This excellent Ms is preserved in the Govt. Museum Alwar (Rajasthan). But as the Ms could not be personally examined by me I could not solve the question that Persian translation of Babur's memoirs by Abdur-Rahman

The words **خامدرد لول** appearing on the top, perhaps in the hand of Shah Jahan, suggest the significance of the Ms.

3. Ali al-Katib's specimens of Calligraphy:

Mir Ali al-Katib of Herat who had lived with Sultan Husain Mirza till the latter's death in 911, was one of the best masters of the art of Nastaliq Calligraphy. He seems to have died in 951 A.H. and is buried in Bukhara. Specimens of his calligraphy are abundantly found in almost all the parts of the world. I shall introduce some of his best models available in Indian Collections:

I. *Diwan-i-Shahi* (Foll.45; No 174 Bankipur, Patna.) It was copied by Mir Ali in 915 A.H. in a clear and elegant Nastaliq within gold and coloured borders. The various coloured margins are ornamented with floral designs and forest scenes. The name of the scribe appears as: **الفقير علی الکاتب**

II. *Hahnama-i-Arifi* or *Mathnawi Gay-u-Changan*:

It is preserved in the Habibganj Collection, M.A. Library, Muslim University, Aligarh. The Ms is a specimen of superb calligraphy which was transcribed at Herat in 926 A.H. It was obtained by Emperor Aurangzeb in Golconda on the occasion of its conquest in 1098 A.H. The colophon reads as

”کتاب العبد الفقير المذنب علی الحسینی الکاتب غفر الله ذنوبه و سر محمود فی اواخر شهر ربيع الاول سنة
و عشرين و تسع مائة بمدينه المهرات“

The flyleaf is adorned with numerous writings and seals of the Mughal nobles. One of them runs as follows:

کتاب گوی و چو گان بخدا نام کامل استاد الکاتب لاسیر علی بابت فتح کلنده غره ذی الحجه سن سی و یکم جلوس اقبال
تحويل سمیل نموده شد۔

Suhail was some important noble in charge of Mss Collections to whom were entrusted such valuable Mss as *Diwan-i-Hafiz* (Bankipur No.151), *Diwan-i-Kamran* (Bankipur No 237), *Tarikh-i-Khandan-i- Timuriya* (Bankipur No 551). One of the seals reads as:

قائل خان خانان زو بادشاه عالمگیر ۱۰۹۶

The Ms is adorned by two map-sketches one of the Khana-i-Kaba and the other of the Prophet's mosque at Madina. Professor Mukhtarud-Din has introduced this Ms. with specimens in *مجله علوم اسلامیہ*, Aligarh V. I No2, 1960.

III. *Hahnama-i-Arifi*: Mir Ali Herawi was specially interested in Arifi's² *Mathnawi Hahnama*. This is why he transcribed it so³ often. One

A number of notes by various personalities of the Mughal court which appear on the fly leaf and the last page enhance the value of the Ms. These names include Mulla Habibullah, Muhammad Hashim, Munim Beg, Murad Beg, Abdul Wahhab, Azam Beg, Mansur and Husamud-Din.

2. Sultan Ali Mashhadi's transcription:

Sultan Ali Mashhadi, the most outstanding master of Nastaliq hand spent his life at the court of Sultan Husain Mirza (873-911) and his Vazir, Amir Ali Sher Nawai (844-906). He seems to have died in 926 though even earlier dates have been assigned to him. Specimens of his calligraphy in Indian collections are rare. I have come across two books supposed to be transcribed by him.

(i) *Diwan-i-Hafiz* (No 817/54) Abdus-Salam Collection, M.A. Library, Aligarh. It is a good specimen of Nastaliq Calligraphy but the Ms is defective at the beginning in so much as the 1st four folios are in a later hand. It is undated. The colophon reads:

کتبہ المذنب الی اللہ الغنی سلطان علی الشہدی

(ii) *Munajat-i-Khwaja* Abdullah Ansari. This Ms is preserved in the Raza Library, Rampur (No 755) and is a specimen of superb piece of Nastaliq calligraphy. It is dated 921.

It is very important Ms for it bears the autographs of Jahangir, Shah Jahan and Abdur-Rahim S/o Bairam Khan as detailed below:

رسالہ خواجہ عبداللہ انصاری خط ملا سلطان علی از پیش کش خان خانان بتاریخ ۲۳ جمادی الاول سنہ ۱۰۲۲
حررہ جهانگیر ابن اکبر بادشاہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم
بتاریخ بیست و پنجم ماہ بہمن الہی موافق بیستم شہر جمادی الثانیہ سنہ ۱۰۳۷ ہجری کہ روز جلوس مبارکت
داخل کتابخانہ این نیازمند در گاہ شد حررہ شہاب الدین محمد شاہ جہان ابن جهانگیر شاہ ابن اکبر شاہ۔
در تاریخ سنہ ۱۰۳۷ الہی موافق سنہ ۹۹۸ ہجری این کتاب داخل شد دوست بندگان و خاک پای
ایشان عبدالرحیم ابن محمد یرم عفی عنہ

The seals of Shah Jahan and Aurangzeb read as

شہاب الدین محمد شاہ جہان بادشاہ غازی صاحب قرآن ثانی بندہ ابوالمظفر محی الدین محمد عالم گیر بادشاہ غازی

These are some of the important notes appearing on the fly leaf:

بتاریخ بیست و پنجم اردی بہشت ماہ الہی سنہ ۱۱۸۹ ہجری داخل کتابخانہ اتقرا العباد میر کرم الدین خان شد۔

اللہ اکبر بتاریخ ہشتم ویماء الہی سنہ ۴ عرض دیدہ شد

اللہ اکبر بتاریخ ہشتم ماہ اردی بہشت سنہ احد عرض دیدہ شد

- (a) Artistic Mss.
- (b) Autograph Mss
- (c) Rare works on calligraphy.
- (d) Mss having historical value.

A: Artistic Mss

Under this head I have examined very briefly those Timurid Mss which have artistic and graphic value. I have included in our list a few rare compositions and transcriptions of some of the significant calligraphers of the 10th and 11th centuries A.H. who had flourished in Central Asia and Khurasan but subsequently migrated to India.

1. Azher's Calligraphy:

Azher is stated to belong to Tabriz wherefrom he migrated to Herat and lived in the court of Timurid princes Bisunqur Mirza, Sultan Ibrahim Mirza, Sultan Ulugh Beg, Sultan Abu Said b. Muhammad b. Miranshah besides Pir Budaq Qara Qyunulu. He seems to have died after 880 A.H. The famous Sultan Ali Mashhadi was one of his pupils. His present transcription consists of a small Persian album (Jawahir Museum M.A. Library, Aligarh) of 25 folios containing three Tarji-bands of Iraqi and one Tarji each of Auhadi, Khwaju of Kirman and Amir Naimi. The script is in small Nastaliq within gold and coloured ruled borders and illuminated head-piece: The Ms besides being a fine specimen of Persian calligraphy is historically very important for it was included in the imperial Collection of Jahangir as a note in the Emperor's hand appearing on the 1st page of the text clearly indicates: الله اكبر

بمجم آذر سنه اداخل كتهخانه اين نيازمند درگاه الهی در دار الخلافه آگره حرره نورالدین جهانگیر سنه ۱۰۱۴هـ
اکبر بادشاه

The colophon shows that the Ms was transcribed in 880 at Herat:

الحمد لله على الاتمام والنفوذ بحسن الاختتام... في شهر محرم الحرام المستقيم في سلكه شهور عام ثمانين وثمانمائة من الهجرة النبوية.

محمد الله که این فرخنده نامه ز نوک خامه من یافت تسوید
بجستم سال اوقامش ز دل گفت کتابهای ما تاریخ گردید بخشش قلم
باختر سید و ش خامه مشکین شیم در تسوید کتابت ابیات الحجاز آیات این بیاض و بانجام کشید بخشش قلم
شکسته رقم در تحریر اوقام اشعار سحر آثار این مجموعه فیض....
ذخظ او سواد دیده پر نور بیاض صفحه اش نور علی نور
علی ید العبد المذنب الراجی بر حرمه الواحب اعظم الکاتب غفر ذنوبه و ستر محبوبه فی بلدة حراء خفت بالزهواة.

Timurid Mss. of Artistic and historical value in Indian Collections. *

*By Prof. Nazir Ahmad
Aligarh*

India like any other country has a large number of libraries some of which are important centres of Persian Mss. But unfortunately most of these Mss remain uncatalogued and therefore not easily accessible. Besides the known centres there are still more private collections scattered all over the country about which we have little information. It is hoped efforts would be made to collect the scattered Persian Mss at one place and to establish a big and fully equipped central library of Mss.

India had had very close cultural and political contact with Central Asia for many centuries before the advent of the Mughals in this subcontinent. With the establishment of the Mughal rule ties of contact with Central Asia strengthened. Zahirud-Din Muhammad Babur, the founder of the dynasty who was a direct descendant of Timur, had spent the most part of his life in that region. Babur's successors had not severed their relation with the land of their ancestors most of whom were equally adept both in Persian and Turki.

Babur was a man of very refined taste. It was his keen interest in Persian art that brought a number of well skilled artists in India from Iran and Central Asia. His successors too were equally interested in the development of the various branches of fine arts. The art of book illustration reached the peak of its glory in India during the regime of Akbar the Great. Persian artists at his court trained the best Indian talent and this led to the development of Mughal school which combined the elements from Persian painting with Indian traditions.

The Mughal emperors took keen interest in establishing libraries which were rich store for learning. Although they were fully Indianised they had great love for the country of their ancestors and this accounts for the availability of a considerable number of Persian Mss which have great bearing on the civilization of Central Asia. In the present paper an attempt is being made to introduce some of the important Mss available in Indian collections. But these form a negligible part of what remains to be discovered in private collections which are generally not accessible.

I have attempted to classify the material at our disposal under these heads:

* The paper was presented in the "International Symposium on the Art of Central Asia during the Timurid Period", held in Samarkand (Uzbekistan, USSR) - 23 - 27 December 1969.

predecessors like Sir Syed Ahmad Khan, Niyaz Fatehpuri and Josh Malihabadi rendered sterling services in explaining the harmful nature of irrational and unscientific ideas, progressive writers have not done much in this respect. Rational thinking has to be brought to the people. They have to be taught to develop a scientific outlook if they are to be rescued from the clutches of the obscurantists.

NEEDED ENCYCLOPAEDISTS

Maulvi Abdul Haq used to say that Urdu needed most today was its own Encyclopaedists. This historic task can be performed only by progressive writers because the bourgeoisie that welcomed French Encyclopaedists in the 18th century are now morally afraid of radical ideas and are trying hard to put the clock back. The Third World today is passing through a crucial stage of national democratic revolution. Its success very much depends on the development of social consciousness among the people. Think of the victory of the French Revolution without its Voltaire, Rousseau, Montesquieu, Diderot and Holbach, or of the American Revolution without Thomas Jefferson, Benjamin Franklin and Thomas Paine or of the Russian Revolution without Herzen, Chernyshevsky, Belinsky Plekhanov and Lenin or look into the powerful literature that the Latin American radicals are producing these days and you will realise how important it is for us to take our battle of ideas a little more seriously.

NO SURRENDER

Challenges faced by the people of Pakistan have no parallel. Attempts have been made to brainwash us, to corrupt us with favours, to break our spirit, to force us away from the path of truth, to brutalise our senses, to erase from our memory all that is good and beautiful in life, to deprive us of all that is rational and scientific in the treasure house of Knowledge, in short, to dehumanise us and arouse the savage in us. But all these attempts have failed because they were against the laws of nature and the logic of the development of human society. Also because people refused to surrender. They faced every ordeal - lashes, imprisonment, torture and the gallows with courage and conviction. They defied the forces of darkness and death. They might have lost a thousand battles but they shall ultimately win the war because people are immortal and invincible. We who are on the side of the people, shall no doubt emerge victorious in our holy war in defence of reason and enlightenment.

assembly were held the pro-centre Government of the Muslim League was swept off the board. And the Central Government had to concede national status to the Bengali Language also. Previously, the people in Bengal used to have great regard for Urdu. They considered it close to the language of the Quran. The same people now started hating it as the language of the oppressors.

SIND DISTURBANCES

Almost a similar situation arose in Sind in 1972-73 when Sindhi was made compulsory, alongwith Urdu, for boys and girls in primary and secondary schools. It is not within the scope of this survey to discuss the economic, social and ethnic causes of tension between the old and new Sindhis. However, ethnic disturbances in Urban Sind and the language riots in Karachi must be ascribed to the strained relations between the two. What needs to be emphasised is the unfortunate fact that Urdu chauvinists and Urdu newspapers repeated their East Bengal performance. Their provocative behaviour convinced the old Sindhis that the Urdu speaking inhabitants of Sindh were opposed to the development of the Sindhi language and culture.

Relations between the old and new Sindhis have considerably improved in recent years because both are now realising that their salvation lies in unity and joint struggle against the common foe. But the political crisis in Pakistan cannot be resolved unless the right of federating units to complete autonomy is granted unreservedly and Punjabi, Sindhi, Pushto and Baluch are accepted as full fledged national languages side by side with Urdu.

PRIMARY CONCERN

The people in Pakistan these days are primarily concerned with the immediate withdrawal of Martial Law and the restoration of human rights and democratic institution. However, if the past is any guides, there is no guarantee that the cult of the irrational would wither away under a civil government. It will prevail as long as the socio-economic system of the country itself is irrational and unscientific. Yet it should be borne in mind every struggle against the reactionary thought system is also a struggle against the socio-economic system that breeds it.

Progressive writers can play a decisive role in this field as they have done in the field of fiction, poetry and literary criticism. They have stood with the suffering humanity and have been protesting against the exploitation of man by man for half a century. But they have still to liberate the minds of the people from superstitious beliefs. Although their

Pakistan, regarding the rights and status of the nationalities - the Punjabis, the Sindhis, the Pathans and the Baluch. These people have been living in this region for thousands of years and practise their own lifestyle. Although there is a loss that is common among them, including religious beliefs, they have their distinct languages, literatures and cultures.

ALLERGIC TO ASPIRATIONS

Unfortunately, the ruling class in Pakistan has been from the very beginning allergic to the national aspirations of the people. It would not even recognise them. Its official policy is based on the theory of one nation, one religion, one language and one culture. People belonging to various national regions have never been treated equally nor has the economic development been uniform everywhere. It was precisely for these reasons that the Eastern Wing felt deprived of its due share and finally seceded from Pakistan. Still the ruling classes refuse to see the writings on the wall. They insist on a strong centralised form of government and would like to keep the federating units completely under their thumb. This position is no more acceptable to the units. They demand complete provincial autonomy and full national status to Punjabi, Sindhi, Pushto, and Baluch languages side by side with Urdu which has been declared the sole national language of Pakistan. Those whose mother tongue is not Urdu are opposed to granting Urdu this special privilege. They consider Urdu a child of the centre and thus an instrument of oppression. Urdu chauvinists have instead of removing this misconception, actually strengthened it by their provocations.

URDU CHAUVINISM

The genesis of Urdu chauvinism may be traced to pre-partition days when any real or imaginary encroachment on the use of Urdu was considered by the Muslim League agitators a threat to Islam and Muslim culture. So much so that the campaign for Pakistan was linked with Urdu. The recognition of Urdu as the national language of Pakistan was, therefore, a logical corollary of the Pakistan Movement.

But trouble started in East Bengal soon after independence. Being the majority province with its highly developed language and literature its people refused to accept Urdu as their national language. But the bureaucracy, which was dominated by officers from the Western Wing, were adamant. When language riots started in Dhaka and Chittagong, the Urdu speaking settlers cooperated with the bureaucracy. Only progressive writers among them supported the demands of the Bengali people. The agitation was ruthlessly suppressed but next year, when elections for the provincial

result of their philosophy of literature according to which writers should not involve themselves in mundane matters as they are a separate entity, should be accountable only to their inner self and express nothing except their personal feelings or experiences. They found in the Existentialist and Freudian doctrines an ideological rationale for their aloofness.

SELF-DECEPTION

But this aloofness has been a myth, a self-deception, because no individual can survive in isolation. "No man is an island, entire of itself", said John Donne long ago. It is true that creative work is generally done alone and one thinks and feels by himself, but many outside influences contribute to his creative effort. The fact that these subjective writers adopt the Existentialist or Freudian attitude or lament at their loneliness clearly show how much they are "a piece of the continent, a part of the main". They suffer from extreme alienation but fail to realise that their self-alienation is a part of the general alienation which is the main characteristic of the capitalist order; that the only way to overcome self-alienation is to identify with those who are likewise alienated and are struggling against the pernicious social system that breeds alienation.

But rebels, too, we have in abundance. They even claim to have superseded the Progressives and call themselves modernists ('Jadidiy'). But that is a misnomer because the modernists have always represented the spirit of their age, the rising forces of society, while the revolt of our so-called modernists is confined to form only, not substance. They are least concerned with revolutionary concepts. They have no doubt developed new techniques and styles, introduced new idioms and images and have coined new symbols, similes and metaphors. Their refusal to stick to the traditional forms and their experiments with new linguistic expressions should be welcomed.

Our young experimentalists, however, seem to be quite oblivious of the forces that have society in their stranglehold. Some of them are so fond of abstract symbols and ambiguous expressions that it has become almost impossible to understand them. They perhaps want to overawe their readers with the incomprehensible and test their knowledge. It was perhaps such intellectuals whom Bacon had advised that they should not behave like spiders that weave cobwebs out of their saliva to catch their victims but follow the example of honeybees that extract nectar from flowers and produce honey and wax.

But the ideological differences among men of letters pale into insignificance before the controversies that are agitating the intelligentsia of

long ago pushed them back into purdah and behind the four walls of their homes. Writers like Hajra Masroor, Kishwar Naheed, Saeeda Gazdar, Zahida Hina, Mrs. Razia Fasih Ahmed and a host of others have not only been participating in women's democratic movements but have exposed in their poems, short stories and essays the various misdeeds of the Mullahs and their designs on human liberty.

A number of our writers, who do not agree with the aims and objectives of the PWA have fallen victim to the existentialist philosophy of Sartre that claims that man is a meaningless absurdity and death the only reality. "Existence has neither cause nor reason nor necessity".

Some are followers of the teachings of Freud according to which the motive force behind human thought and behaviour is the unconscious in man. Freud's over-emphasis on sexual impulses is also very appealing to some of our writers.

ANTIDOTE

These two tendencies became quite popular in the past Second World War period when the victories of socialist revolutions and the phenomenal upsurge in the anti-imperialist liberation movements in the Third World threatened not only the economic and political hegemony of the neo-colonialists but their ideological pretensions also. Third World intelligentsia, especially the youth, was no longer in a mood to accept the traditional bourgeois thought system on its face value. Neo-colonialists had, therefore, to float into the market some new ideological weapons to fight the rising anti-imperialist tide. This antidote against revolutionary thinking was provided by the Existentialists and the Freudians. One factor was common to both. The conceptualised man as a solitary individual, totally isolated from society.

Our writers (not all of them) had close links with the neo-colonialists and were attracted towards the Existentialist and Freudian interpretation of man's task and destiny. Why? Because they were genuinely unhappy and much dissatisfied with life around them. The jockeying for power and the rat race for personal gains, a general decay in the social and moral values, an alarming fall in the standard of education, lack of opportunities for the development of creative talent and growing unemployment in the educated urban youth were some of the factors that directly affected our intellectuals. They felt cheated but not enough to register their protest or to participate in the struggle to change the situation. They looked at the phenomenon purely from their personal angle and did not see that the malady was social and had to be dealt with on a social level. This subjective approach was the direct

are based on a certain understanding of the conditions of existence. They reflect an attitude and a way of looking at things and absorbing them in one's emotional experiences. This is a natural process and can never be stopped by law.

SETBACK

There is no doubt, however, that the movement suffered a severe set-back when the PWA was banned. Writers lost the opportunity to work unitedly. This affected their unity of thought also. Moreover, it must not be overlooked that the development of the Progressive Writers' Movement, in the earlier days, was an integral part of the development of social consciousness and democratic movement in the country. Formerly we used to live under foreign rulers whose physical presence had become part of our daily experience and we reacted against it accordingly. Today, we live in an independent republic governed by our own countrymen. Therefore, our emotional reaction to the native rulers will naturally be different. And unless we are very alert, we might also miss the invisible machinations of a certain foreign power. Besides, the process of democratising society was deliberately reversed and democratic forces were never given a chance to grow. Social relations, too, have become more complex and ideological conflicts, with their strong pulls, have grown in both substance and numbers.

Thus it will be seen that progressive writers in Pakistan have to function under exceptionally difficult conditions. Since their organisation is banned, there is no way to find out whether their number has grown or declined. But their strength can be gauged from their popularity among the people and their impact on the main current of literature. Protest literature has always been a distinctive feature of our movement. Its growth in recent years shows how deeply writers have been influenced by the trends set by progressive writers. It is a fact that in mushairas and other literary gatherings, only poems of protest are welcomed. It does not matter whether anyone calls himself a progressive writer or not, but so long as he adheres to the laws of reason and enlightenment, so long as his approach is realistic, historical, and human, and so long as his art attempts to discover some hidden aspect of life, he will be considered progressive.

WOMEN WRITERS

The emergence of women writers and journalists as frontline fighters for civil rights is a recent phenomenon. They have been provoked into this position by the priestly class that is bent upon depriving them of their freedom. But for the heroic struggle of our women, reactionaries would have

theology has been introduced in our educational institutions including the medical colleges. Women are their special target whom they would like to confine to the four walls of their homes. In short, they justify the status-quo and resist every effort to bring changes in the economic, political or social set-up that might give some relief to the underprivileged classes.

It were these fundamentalists, represented by the Jamaat-i-Islami, that first concocted the slogan 'ideology of Pakistan'. This slogan has now been appropriated by the ruling class alike. Although no one has so far explained what precisely this ideology is the slogan is constantly used as a stick to beat the opponents. But Justice Mohammad Munir, former Chief Justice of Pakistan, has shown in his book 'From Jinnah to Zia' that this slogan was first coined by the Jamaat-i-Islami in 1953, in order to divert people's attention from its strong anti-Pakistan and anti-Jinnah stand in the past.

ACCESS TO MEDIA

Fundamentalist writers have full access to official media. Their plays, short stories, features and poems are regularly broadcast and telecast. Thus they enjoy all possible facilities to show their literary talents. But so far they have failed to produce any piece of art worth the name. This was admitted even by Salim Ahmed their pontiff. Writing in his literary column in the daily 'Jasarat', he bemoaned that the contribution of his 'Islam-pasand' writers was almost nil as compared to the progressive writers. The reason is not far to seek: they look at social realities with the eyes of vested interests. Their historical novels and plays in which they highlight the achievements of Muslim rulers and warriors are caricatures rather than realistic representations of the medieval era.

It is gratifying to note that an overwhelming majority of writers in Pakistan does not subscribe to the fundamentalist view of life. They may differ among themselves on aesthetic issues but their approach towards literature and its function is secular. They also do not participate in the brainwashing campaign of the Government. On the contrary most of them feel quite dissatisfied with what is happening in the country these days and eagerly look forward to some change for the better. Even those, who have to work in Government offices, often get frustrated and express their anger in their writings. Then they are sacked as happened to Ahmed Faraz, Masood Ashar and several others recently.

Some Critics think that the Progressive Writer's Movement is already dead or is dying fast. That may be their wish. Perhaps they believe that when an organisation is banned, the movement that it represents, also withers away. But this is not true. Movements, whether literary, political or social,

FAIZ

Faiz Ahmed Faiz also wrote some very powerful poetry during his incarceration under Ayub Khan's regime. But he is in a class by himself and cannot be treated casually in a brief survey. His literature of protest was highly refined and had unsurpassable charm and dignity. Suffice it to say that no one since Iqbal has influenced our writers so much and raised the political consciousness of the people more than Faiz Ahmad Faiz. It does not matter if the official media in Pakistan has still put a ban on him because he lives in the hearts of his country-men and of people all over the world.

IDEOLOGICAL TRENDS

Ideological trends in the present day Pakistan should be examined in the context of the socio-political conditions obtaining in the country. It must be realized that the intelligentsia of Pakistan has been living under great physical and mental strain for the last eight years. The 1973 Constitution which was unanimously approved by the elected members of the National Assembly and thus represented the unanimous will of the people, has been abrogated. People have been deprived of their civil liberties and all political parties have been banned.

Moreover, it is for the first time that the coercive powers of the State and its financial resources are openly being used to brainwash the people. An all-out ideological warfare is being waged against the forces of reason and enlightenment. Since all means of communication are fully controlled, no one can challenge their obscurantist views.

The spearhead of this unholy war are the fundamentalists who are supported by Americans all over the Muslim world. In Pakistan they enjoy the fullest freedom of organisation, speech and the press. Their publications are to be found everywhere. Besides daily newspapers like 'The Pakistan Times', 'Jang', 'Nawai Waqt', 'Mashriq' and 'Imroze' which publish their views prominently, they have their own organs like the 'Jasarat'. 'Takbeer', 'Asia', 'Zindigi', 'Urdu Digest', 'Sayyara Digest', 'Misaq', 'Islami Jamhuriyat' and 'Tarjumanul Islam'.

OPPOSED TO REFORM

They strangely believe in the sanctity of private property and are, therefore, opposed to land reforms and people's control over capitalist enterprises. They favour in the words of Maulana Maududi, "theo-democracy" instead of Parliamentary democracy. They would prefer a strong Centre denying autonomy to the provinces and national status to their languages. It was at their instance that compulsory teaching of Arabic and

THE WRITERS' GUILD

But no government in Pakistan, prior to the military dictatorship of Ayub Khan, cared to take into account the role that writers and journalists play in moulding public opinion because no civil government had ever found itself so isolated from the people as the Martial Law regime of 1958. It made full use of its power and resources to win over intellectuals. A senior civil servant, having literary pretensions, was entrusted with the task of organising the so-called Writers' Guild. Since the organisers did not want to discriminate against writers on ideological grounds - that would have defeated their main purpose - and since prominent progressive writers, including Faiz Ahmed Faiz, were in jail, the organisers succeeded in enrolling most of the writers and journalists into the Guild. A large amount of money was put at its disposal and was freely distributed among members on one pretext or the other, thus polluting the literary atmosphere in the country.

TWO DOUGHTY SOLDIERS

Tribute must, however, be paid to two most courageous intellectuals who openly and fearlessly defied the Martial Law regime. They were the late Mr.M.R.Kiyani, the then Chief Justice of West Pakistan, and Habib Jalib, the People's poet par excellence. Habib Jalib's political commitments were fairly well-known, but Justice Kiyani's public addresses were a bolt from the blue and the authorities as well as the people were taken by surprise. He was a very mild and soft speaking person. But his bold criticism of Martial Law, his sarcastic remarks ridiculing the administration and his jibes at the high-ups thrilled the public. He overnight became a hero and his popularity in both the wings knew no bounds. His addresses, both in English and Urdu, were privately printed and circulated throughout Pakistan.

While Habib Jalib was beaten by the hired goondas for his straight-forward condemnation of the Ayub regime and then put behind the bars, the Government did not dare shut the mouth of its own Chief Justice who was highly respected for the judicial integrity. Unfortunately, he died suddenly in far off Chittagong under mysterious circumstances. Although more than two decades have passed since his death, we have yet to produce a writer of such sterling qualities as Justice Kiyani. Nothing sustained the morale of the people in the early days of General Ayub's regime more than the writings of Justice Kiyani and Habib Jalib.

and Andre Gide were his other heroes. Quoting Gide's "I Count Only on the Deserter" approvingly he wrote "I subscribe to this dictum whole-heartedly. If I dream of only brilliant future for myself, then it is not as a loyalist but as a deserter" (ibid, p.304). True to his words, he remained a deserter till the end of his life. While slipping he touched the lowest depth when he joined ranks of the most reactionary dogmatists and denounced the entire Western Knowledge and thought from Plato and Aristotle to Einstein and Freud in his posthumous pamphlet 'Jadidiat' (Modernism) an outline of Western deceptions from Plato to the 20th Century).

FIRST PWA CONFERENCE

The campaign against Progressive writers continued unabated. When the first PWA conference was held at Lahore in 1949, Shorish Kashmiri and his followers attacked the venue with weapons turning the battle of ideas into a battle of stones and sticks. But the assailants were beaten back.

When in the early 50's, Pakistan was dragged into the orbit of American imperialism with serious consequences to its nascent economy and political future, literature could not escape its baneful effect. The PWA was consequently banned in 1954 under American pressure although a few months earlier its second annual conference in Karachi was presided-over by no less a person than Maulvi Abdul Haq, the Grand Old Man of Urdu.

Serious efforts were also made by the Americans to lure writers away from radical movements. The market was flooded with anti-socialist literature. Information centres and libraries were established at Karachi, Hyderabad, Lahore, Rawalpindi, Peshawar, Dacca, and Chittagong. Branches of a CIA-backed publishing house, called Franklin Publications, were opened at Karachi, Lahore and Dacca. Franklin Publications employed Pakistani writers on handsome salaries and paid others lavishly for translating American books. Manuscripts would then be distributed among publishers and booksellers free and the cost of their publication too would be borne by the Franklin Publications. A branch of the notorious Congress for Culture Freedom headed by Mr.A.K.Brohi, was opened in Karachi. Visits by Pakistani Writers to the United States were organised on a large scale under the so-called Readers Programme. It is another matter that most of those who had earned money or had enjoyed the hospitality of American State, later on became staunch critics of their benefactors.

There is, however, no doubt that a section of our writers has been influenced by American propaganda and has found solace for their anti-progressive learnings in the writings of Ezra Pound and T.S. Eliot.

Opposition to progressive writers was led by chauvinists like Dr.M.D.Taseer, Mohammad Hasan Askari, Agha Shorish Kashmiri, editor of the weekly 'Chattan' and Mumtaz Shirin. They severely criticised the progressives for their non-partisan stand on communalism as well as for their disagreement with the anti-democratic policies of the Government. They were called enemies of Pakistan and dubbed agents of Hindu India.

Writing to Ms.Mumtaz Shirin in July 1948 from Lahore, Mr.Hasan Askari the chief mentor of anti-progressives, felt sorry that "our writers, only to please others or at the instance of others, are spreading hatred or at least suspicion against Pakistan and the Muslims. They are bent on destroying Pakistan and not for their own benefit but to get the medal of impartiality, free thinking and progressivism".

(Naya Daur, p.290, March 1985, Karachi. The Main target of his attack were, of course, the progressive writers who, in his opinion, were not even Pakistanis. "Let me know what the literary atmosphere of Karachi is. How many (writers) are Pakistanis and how many are progressives?" he asks the lady.

THE PWA & THE HALQA

When Pakistan came into being, Two literary groups, the PWA and the Halqa, were already functioning at Lahore, Karachi and some other places. But a chauvinist like Hasan Askari would not join hands either with the progressives, whom he considered traitors, or the Halqa. He wanted to form "a new organisation of writers who are loyal to Pakistan". So he felt "very happy" when some youngsters started it. "I also persuaded Taseer Saheb to join it. But when these young men went to see Mr.Qayyum Nazir (leader of the Halqa) they were told that Taseer and Askari were looking for some job and that they wanted to form the organisation for their personal propaganda" (ibid, p.290). Thus Hasan Askari's attempt to form a united front of anti-progressive writers failed. A few months later, the Taseer-Askari axis also broke down and we find Askari abusing Taseer in unquotable words in his letter to Ghulam Abbas in October, 1948 (ibid, p.311).

The late Prof.Hasan Askari, the prophet of anti-Progressivism, went on changing his views since his notorious short-story 'Phislan' (Slipperiness). When he migrated to Pakistan, he aligned himself with Dr.Taseer and, like Senators Bilbao and MaCarthy's witch-hunting campaign in the United States, began to question the loyalty of writers in Pakistan. He also became a great admirer of French writers. "I cannot liberate myself from bourgeois Europe", he admits unashamedly. "My Gods are Joyce and Proust. But now I have started liking Sartre, Kafka and Lautreamont. Paul Valery, Mellaime

a partisan or sectarian attitude towards it. On the contrary, they accused Hindu, Muslim and Sikh communalists, without discrimination, of exciting the people in their own selfish interest.

EARLY DISMAY

Progressive writers in Pakistan had also reasons to be dismayed at the capture of power by feudalists and die-hard bureaucrats, who till recently were serving their foreign masters most loyally. They showed no inclination to share power with the people or satisfy their hopes for a happy and prosperous future, progressives were, therefore, convinced that the days of the sovereignty of the people as desired by Allama Iqbal were still far off and the masses would have to struggle to achieve it. These sentiments were aptly expressed by Faiz Ahmed Faiz in his famous poem:

*This stained light, this night bitten
This is not the dawn we yearned for dawn
This is not the dawn
For which we set out so eagerly
Convinced that in the sky's sprawling wilderness
We would one day discover
The Ultimate harbour of the stars
They say that darkness
Has been once and for all severed from light
They say that
The long-dreamt-of goal has finally been achieved
But who has poisoned the bubbling fountain.
Of our tragic joy?
Why does mendacity thrive and why is percipience crushed?
No one knows from where
The morning breeze came
And where it went
The night is as oppressive as ever
The time for the emancipation
Of enslaved hearts and minds
Has not come as yet
Continue your epic journey
This is not your destination
This is not the dawn
(Translated by Daud Kamal)*

Jahan and Mahmooduz Zafar, was published. Dr. Rashid Jahan received threatening letters and was warned that unless she publicly recanted, she would be kidnapped and her nose cut. The Mullahs and their associates also launched a most slanderous campaign against progressive writers. They were accused of producing pornographic literature thus polluting the moral fabric of society. A couple of writers were even prosecuted for their alleged lascivious short stories but were finally acquitted.

The 'Statesman', an influential spokesman of British interests in India, took exception to the PWA on political grounds. It charged it with inciting the people against the Government, creating hatred between various classes and preaching violence and bloodshed. It, therefore, called upon the Government to ban the PWA.

Objections were also raised against the PWD by a section of writers on the ground that (1) the forming of an association of writers amounted to their regimentation thus encroached upon their freedom and forced them to write at order, (2) writers should not commit themselves to any particular thought system nor should they get involved with the social, political, economic or moral issues agitating the society, (3) writers should be accountable only to themselves and express only their inner thoughts and feelings and (4) the masses are just a rabble and therefore, not worth consideration. Only the elite creates culture, art and literature.

Some of the writers holding these views formed a literary organisation called the Halqai Arbab-i-Zauq in Lahore in 1939. Their main object was to counter the PWA and keep young writers occupied with new experiments in form only.

Victory of the liberation movement was a great historic event in the life of our people. It was celebrated with great fervour all over the country. Yet the holocaust in the wake of the declaration of independence became a nightmare. Never had the sub-continent undergone such a bloodbath on such a big scale, not even during the struggle for freedom in 1857. People then had the feeling that they were sacrificing their lives for a noble cause. The communal riots of 1946-47 on the other hand, looked so absurd, so meaningless. Thousands and thousands of innocent people were massacred, not by foreigners, but by their own countrymen. Women were raped, killed or abducted, houses burnt, properties destroyed and about six million families made homeless for no fault of theirs.

These tragic events left a deep impression on writers on both sides of the border. Stories, novels and poems of that period present a most moving picture of the victims and their sufferings. Writers, especially the progressive writers, deplored this mass frenzy unequivocally but did not take

social justice are great landmarks in the history of modern Urdu literature.

PROGRESSIVE WRITERS' MOVEMENT

The idea to form an organization of progressive writers was no doubt conceived on alien soil in 1935, but the process had started much earlier in India in the days of Ghalib and Sir Syed Ahmed Khan. The Progressive Writers' Movement was, therefore, not an imported commodity or an accidental phenomenon but proved to be the logical conclusion of the intellectual trends of the preceding decades. It can rightly claim to have deep roots in the humanism of our classical literature, in the rationalism of Ghalib and Sir Syed, in the reformist zeal of the Natural School, and the realistic and romantic consciousness of its immediate predecessors. That is why most of the senior writers like Tagore, Maulvi Abdul Haq, Maulana Hasrat Mohani, Maulana Niyaz Fatehpuri, Qazi Abdul Ghaffar, Majnun Gorakhpuri and Prof. Firaq Gorakhpuri did not find anything objectionable in the Progressive Writers' Movement and warmly welcomed it as a step forward.

FASCISM RAISES ITS HEAD

This was the heyday of cultural renaissance and political awakening in the country. But outside the country, wars of aggression by fascist Powers had already begun, Japan had annexed Manchuria. Italy had occupied Abyssinia and General Franco had invaded Republican Spain with the active support of Hitler and Mussolini, in Germany, Hitler had started a reign of terror against the progressives. Prominent scientists, philosophers, musicians, painters, poets and fiction writers had either fled or were arrested and later on liquidated. Danger to world peace was becoming more and more imminent every day. Since the appeasement policy of Britain, France and the United States had contributed much to the aggressive designs of the Axis Powers, writers everywhere realised that unless concerted efforts were made to arouse the people against the twin menace of imperialism and Fascism the future of literature and art was in great peril.

THE GENESIS

It was in this atmosphere of world tension that the Progressive Writers Association of India was formed in 1936 under the presidentship of Munshi Prem Chand. It was soon joined by an overwhelming majority of our young and not so young writers.

This mobilisation of enlightened intellectuals was strongly opposed by the reactionaries. Protest had been earlier made by the Mullahs when 'Angare', a collection of stories by Sajjad Zaheer, Ahmed Ali, Dr. Rashid

modernism, romanticism. The former was represented by Iqbal, Munshi Premchand, Pandit Brijnarain Chakbast, Mirza Mohammad Hadi Ruswa, etc., and the latter by Sajjad Haider Yaldrum, Hafiz Jallunduri of the earlier days, Josh Malihabadi of the earlier days, Patras Bukhari, Rashid Ahmed Siddiqui, Akhtar Shirani, Niyaz Fatehpuri, etc. These were also great aesthetes. Often the two trends overlapped and jointly criticised the obscurantists and anti-secular elements in society.

Magazines like 'Makhzan', 'Nairang-i-Khayal', 'Adabi Duniya' and 'Adab-i-Lateef' from Lahore, 'Nigar' from Lucknow, 'Zamana' from Kanpore, 'Paimana' and 'Shama' from Agra and 'Urdu' from Deccan played an important role in popularising both the realistic and the romantic kinds of literature. Although the orthodoxy was completely overshadowed by the realists and the romantics, its remnants found support from Maulana Sulaiman Nadvi, editor 'Maarif', Azamgarh and Maulana Abdul Majid Daryabadi, editor of 'Sidq'. These two were chosen by Allama Niyaz Fatehpuri as his special target. He was well-versed in Arabic and Islamic literature. Hence he could fight them on their own ground. He was an enlightened intellectual and possessed a very forceful pen. His crusade against the orthodoxy opened the eyes of many a young man of our generation to the bankruptcy of these ulema, whose ignorance of the true spirit of Islam and of modern knowledge was colossal. No single person radicalised the thought system of the readers of 'Nigar' as Allama Niyaz Fatehpuri. Eminent writers like Prof. Rashid Ahmed Siddiqui and Prof. Majnun Gorakhpuri also cooperated with him.

JOSH MALIHABADI

But his contemporary, Josh Malihabadi, popularly known as the poet of revolution ('Shair-i-Inqilab'), possessed a better scientific outlook. His appeal to reason also proved to be more effective. Although he started his literary career as a romanticist and social rebel, he soon developed into a great rationalist. His unswerving dedication to the forces of life in their struggle with the forces of death, his eulogy of the Ascent of Man and his hymns to man's creative genius, his faith in the unity of humankind and his denunciation of those who discriminate among men on grounds of religion, language and nationalities, his strong belief in the superiority of intellect to intuition and his total commitment to reason in preference to emotion, his condemnation of the priestly class for their obscurantist views and their hypocritical dealings, and his criticism of the moneyed people and the imperialist Powers that exploit and enslave the toiling masses, his affirmation of the freedom of mind and his call for liberty, democracy and

Khan's 'Zamindar' became most popular organs of the literature of protest and patriotism in Urdu.

THE EMERGENCE OF IQBAL

It was in this period of storm and stress that Iqbal emerged as the greatest Urdu poet of this century. His metaphysical learnings are no doubt open to strong criticism, but his realistic approach to economic and socio-political problems, his concept of the revolutionary process of nature, and of the Ascent of Man, who, in the opinion of Iqbal, is akin to God in his creative zeal, his biting criticism of the Mullahs and Pirs - whom he called a deadly disease -, his strong condemnation of the feudal order, his most damning characterization of capitalism and imperialism as the greatest menace to peace and human freedom and his tributes to Marx, Lenin and the Russian Revolution were harbingers of a totally new trend in Urdu.

He threw overboard all tall talk about 'art for art's sake' and stood boldly for art for the sake of life. Poetry in his hand became the most effective weapon to arouse the people to action and to change their destiny '*sultani-i-jamhoor ka aata hai zamana, Jo naqsh-i-kuhan tum ko nazar aye mita do*'. He added new dimensions to Urdu poetry, widened its horizon and raised its quality to great heights. But like Sir Syed, Iqbal, too did not escape the wrath of the orthodoxy, 'Fatwas' (edicts) were issued against him, calling him an infidel and an apostate. But times had changed. No one took any notice of these 'fatwas'. Meanwhile, Iqbal's stature steadily grew and the same Mullahs who used to abuse him now recited his poems from the pulpit, the radio and TV stations with gusto.

However, it would be a mistake to think that due to the efforts of Sir Syed, or the Natural School or Iqbal, the traditionalists ceased to exist or that they withdrew from the arena. No. They were very much there although they had lost much ground, thanks to the development of social and political consciousness among the people. Traditional Urdu 'ghazal' still remained a popular vehicle of literary expression. But there is a marked difference between the sensibility of Dagh and Amir Minaee of the old school and that of Maulana Hasrat Mohani, Riaz Khairabadi, Jigar, Asghar, Yaas, Yagana and Firaq Gorakhpuri.

REVOLUTIONARY EPOCH

The decades between 1905 are considered a most revolutionary period in human history. As pointed out earlier, it was a period of great political awakening in India. As far as Urdu literature is concerned, it was marked by the development of two parallel trends giving voice to patriotic realism and

natural phenomena and with various social and moral issues.

Mention must be made of the services rendered by Anjuman-i-Punjab which was founded in Lahore in 1864. Its moving spirit was Maulvi Mohammad Husain Azad, who later on initiated the movement for natural poetry in 1874. In order to popularise this movement, a mushaira was held every month where poems on natural phenomena and various social subjects were recited. Maulana Hali was also actively associated with this movement.

HALI'S INTRODUCTION

This realistic trend in Urdu literature was fully in accordance with the new awakening in the sub-continent and soon became widespread. The most important document of this period was Hali's 'Introduction to Poetry' (1893) which was probably inspired by Wordsworth's Introduction. Hali's 'Introduction' was an impassioned appeal to Urdu writers to take cognizance of the changing situation and recognise their social responsibilities. He was no doubt strongly criticised, even lampooned by the traditionalists, especially the Oudh Punch group, but the movement towards social reform had come to stay.

Hali's introduction must be considered the first manifesto of progressive Urdu literature. It is a pity that not much attention has been paid to the role that Azad, Hali and their associates played in popularising the realistic and reformist trend in our literature. On the contrary, the so-called modernists of today, who had never participated in the liberation struggle in any form and now pose as anti-British when the British are no more there, are calling Sir Syed and Hali stooges of the British and trying to belittle their services to Urdu.

The 20th Century ushered in a revolutionary epoch not only in Urdu literature but in society as a whole. The defeat of Czarist Russia at the hands of an Asian Power was hailed by all the subject peoples of the East and gave a new impetus to nationalist movements everywhere.

The invasion of Tripoli by Italy that was immortalised by Iqbal in his poems *'Tarabius kay shahidon ka hai lohu jis mein'* and *'Fatima tu a'bru-i-ummat-i-marhoom hai'*, the Swedish Movement and the Balkan War, the First Great War, the Russian Revolution (which was hailed by Iqbal, Rabindranath Tagore, Maulana Hasrat Mohani, Qazi Nazrul Islam and others), the Khilafat and the non-cooperation movements that shook the foundations of British rule in India were historic events that closely followed each other in succession and stirred the imagination of our writers. Maulana Hasrat Mohani's 'Urdu-i-Moalla', Maulana Abul Kalam Azad's 'Al-Hilal', Maulana Mohammad Ali Jauhar's 'Hamdard' and Maulana Zafar Ali

appeared on the scene and shook the very foundation of the mode of thought and belief of the Muslim people just as Raja Ram Mohan Roy had done half a century earlier.

THE ALIGARH MOVEMENT

The Aligarh Movement, whose most outstanding spokesman was Sir Syed Ahmad Khan, was based on the sovereignty of reason and science in every sphere of life. It sought to alter both the thinking and living habits of the Muslim people. The literature it produced was, therefore, considered the greatest threat to the revivalist cause and the traditional system of thought and feeling. It not only angered the orthodoxy but a number of well-known Urdu writers like Akbar Allahabadi, Munshi Sajjad Hussain and the entire lot of Oudh Punch penpushers took up cudgels against Sir Syed.

Even some of his friends abandoned him. The great novelist, Nazir Ahmad, in his novel called 'Ibunl Waqt' (time-server) satirised him most bitterly. Maulana Shibli Nomani, a colleague at Aligarh, left him and started his 'Nudwatul Ulema' in Lucknow to counteract the growing influence of the Aligarh School. Sir Syed was denounced as a heretic, an apostate and a 'Naturee'. Fatwas were issued against him, calling him an infidel. He once narrowly escaped assassination at the hands of a hired fanatic.

Sir Syed persisted in his crusade against obscurantism and superstition with great courage. Never was the battle of ideas fought so bitterly, at least in Urdu. He called upon the people to use their power of reason and acquire Western knowledge and adopt the Western way of life without which they would not be able to compete with the other civilised nations. His magazine 'Tahzibul Akhlaq' became the rallying point for like-minded people. He received active support from Maulana Hali, Maulvi Chiragh Ali and Mohsinul Mulk. Sir Syed himself was a prolific writer. He modelled his essays after Addison and Steele. In simple and straightforward language, he wrote on scientific, historical, political and social subjects and showed that Urdu was capable of successfully expressing all modern ideas.

As regards Urdu poetry, Maulana Hali, while referring to the contribution made by 'Tahzibul Akhlaq' remarked that 'Urdu poetry, too, in which only one type of ideas has been constantly repeated, took a new turn thanks to this journal. Poets started treading new and fresh fields. Instead of exaggerations and lies, descriptions of fact and reality were attempted and poetry which was considered only a thing of entertainment became a useful discipline' ('Hayat-i-Javed', p.425, Lahore, 1957).

A new trend in poetry had started. Instead of looking inside and expressing their subjective feelings, poets tried to look around and deal with

who was still in the service of the Company, requested Ghalib to write a foreward to his newly edited version of the 16th Century 'Ain-i-Akbari' of Abul Fazal, he sent him a long poem in which he expressed his dismay that such a 'wise man as Syed Ahmad Khan' should have thought of dressing the 'obsolete' (kohna) in a new garb. "The revision of 'Ain-i-Akbari' is a matter of shame for such a courageous person. Since I am opposed to the 'constitution' of hypocrisy I cannot praise him for his venture because I search for new creations", he wrote.

WHAT IMPRESSED GHALIB

Ghalib was not enamoured of Western culinary or sartorial habits nor even by the English language. What impressed him most was the Scientific techniques and innovations of the West - the steam engine, the wireless telegraph, the match sticks, the huge seafaring liners that "have made both wind and water powerless", the use of gas for illumination, the development of various skills and the "constitutional system of Government" in comparison to which 'Ain-i-Akbari' looks like an old almanac. Worship of the past is not a useful pastime", he advised Syed Ahmad Khan. The latter was so annoyed with this poem that he did not include it in his book.

Ghalib is never tired of denouncing the decadent past. He returns to it again and again.

"I have come to remove the obsolete from the scene of life and introduce a new system in this world of colour and smell. The ecstasy of the worshippers is bereft of the passion for the observation of reality. Therefore, I over-throw the sovereignty of Anahita with my hymns".

He is not satisfied with the rule of Heaven either "Come, let us remove the rule of Heaven".

Ghalib hit at the very core of the crisis of our civilisation when he criticised the obsolete mode for our life and thought. It was his considered opinion that the crisis could only be resolved if we adopted Western science and technique, gave up looking back towards the past and introduced a modern system of administration.

Ghalib got away with these revolutionary ideas because in the East have always enjoyed the fullest liberty of expression even under tyrants and dictators. Secondly, his appeal was confined to a very small audience. However, he was quite often ridiculed by his contemporaries for his language which they found difficult to understand, perhaps because they could not comprehend his ideas.

His remained a lone voice till Syed Ahmad Khan (1819-1898)

conflict was aptly described by Ghalib thus:

*Iman mujhe rokay heh to khenche heh mujhe kufir
Kaaba merey pichhay heh, kalisa merey aagay.*

(Faith is pulling me, while no faith is pushing me, Kaaba is behind me and the Church is in front of me).

Credit for revolutionising the form and content of Urdu literature in the 19th century is usually given to Sir Syed Ahmed Khan and his associates, but it was Ghalib (1797-1869) who first lit the torch and showed the way to enlightenment. He was the last of the great classicists and first among the modernists. A humanist, a free-thinker, a sceptic and non-conformist, his poetry is replete with rationalist thought. He calls himself a sufi yet unlike traditional sufis, he eulogises reason in preference to emotion and ecstasy. For him the antithesis of reason is not emotion as the metaphysicists say, but ignorance which Ghalib abhors (c.f. his Persian Masnavi 'Abr-i-Guharbar').

GHALIB IN CALCUTTA

Ghalib became acquainted with Western thought and life style in the course of his friendship with Mr. Edminton and Mr. Faraser in Delhi. Later, he visited Calcutta in order to plead his case for the restoration of his landed property with the Company. He stayed there from 1827 to 1829 and witnessed the day-to-day working of a highly West-oriented society. Calcutta those days was not only the capital of British India, it was also the biggest centre of British-controlled commerce and industry. It may be recalled that this was the time when Raja Ram Mohan Roy was campaigning for Western knowledge and education in his Persian weekly which Ghalib must have read. Being an acute observer, he was highly impressed by the prosperity of Calcutta which presented a total contrast to poverty-stricken Delhi. Describing the affluence of Calcutta to his friend, Ali Bakhsh Ranjoor, he writes:

"Calcutta is a most colourful and wealthy city. Except for the remedy of death, there are available skilled men of every profession and you can buy in the market everything except fate. Sitting on the dust in Calcutta is better than sitting on a throne elsewhere. By God, if I were not worried by family considerations, I would have long ago gone there, leaving everything behind".

These observations were not the sentimental outbursts of a hedonist but represented the mature opinion of a mighty intellect that could see far ahead of his time (*mein andalib-i-gulshan-i-na-afreeda hoon*). As time passed Ghalib became firmer and firmer in his view. When Sir Syed Ahmad Khan,

Meanwhile, the struggle between the Orientalists and the Anglicists in the service of the Company continued. It was finally resolved in favour of the Anglicists in 1835 under Lord Macaulay when it was decided "to impart the native population a knowledge of English literature and science through the medium of English language".

DELHI COLLEGE

In this connection, the services rendered by the Delhi College, now no longer in existence, cannot be overemphasised. This institution was a traditional madrasah when it started but was changed into a college under orders of the East India Company in 1825. Later, the teaching of the English language and literature was also introduced and a department for the translation of English books into Urdu was opened.

Referring to the contribution of the Delhi College, Dr. Maulvi Abdul Haq once wrote: "This was the first teaching institution where the East met the West, laying the foundation of a new civilization and a new epoch. It brought miraculous changes in people's ideas, added much to their knowledge and reformed their taste. It also produced a group of nature, enlightened and far-sighted writers to whom our language and society will remain indebted" (Marhoom Delhi College, p.17, Urdu, Karachi, 1962).

Maulvi Zakaullah Khan, Maulvi Imam Bakhsh Sahbai, Master Piare Lal, Master Ram Chand, Maulvi Nazir Ahmed, Maulvi Mohammad Hussain Azad, Mir Nasir Ali and several other Urdu writers were the product of the Delhi College which fell victim to the 1857 disturbances.

Elsewhere, social reformers like Nawab Abdul Latif Khan of Calcutta and Maulvi Karamat Ali of Jaunpore were also trying to persuade the Muslims to learn English and acquire Western knowledge because Islam strongly favours such pursuits.

A NEW EPOCH

Whatever the attitude of the orthodoxy, and it was very hostile to Western knowledge and education, there is no denying the fact that the Indian society in the first half of the 19th century had entered a new historical epoch, causing radical changes in the economic, political, cultural and intellectual life of the country. Henceforth, the battle of ideas would be fought on a different plane. The age-old controversy between the humanists and the dogmatists would lose its social significance and be no longer relevant. From now on, the adversaries should be the rationalists and the revivalists, the West-oriented and the opponents of Western knowledge and civilisation. This new mental

1803, similar mission schools came into existence there and at Bareilly. Muslim boys unfortunately boycotted these schools on account of fatwas (edicts) issued by some very influential ulema who ruled that India was a 'darul harab' (country at war).

RAJA RAM MOHAN ROY

It was Raja Ram Mohan Roy (1772-1833) and his associates who first realised the worthlessness of the obsolete oriental system of education. They were men of foresight who were convinced that the salvation of the country lay in the acquisition of Western knowledge through the medium of English. Therefore, when in 1823 the Company decided to open a Sanskrit college in Calcutta, a spirited protest was made by Ram Mohan Roy. He submitted a petition to Lord Amherst, the Governor-General. Referring to the proposed college, he said:

"The pupils will here acquire what was known two thousand years ago, with the addition of vain and empty subtleties. The Sanskrit system of education should be the best calculated to keep this country in darkness if such has been the policy of the British Legislature. But as the improvement of the native population is the object of the Government, it will consequently promote a more liberal and enlightened system of instruction, embracing mathematics, natural philosophy, chemistry and anatomy with other useful sciences and providing a college furnished with the necessary books, instruments and other apparatus"(Quoted by R.C.Majumdar, etc. in "An advanced History of India" p.817, London, 1961).

'MIRATUL AKHBAR'

Undeterred by the rejection of his petition, Ram Mohan Roy continued his campaign through articles in his Persian Weekly, 'Miratul Akhbar' (Mirror of News). He also opened several English schools in cooperation with the missionaries and formed a School Board Society for selling English texts.

But the Muslim intelligentsia, by and large, remained hostile to the Western system of education so much so that in 1835 when the Muslims of Calcutta learnt that the British Government wanted to introduce English education throughout India, they sent a petition to the Government signed by 8000 ulema and nobility strongly opposing this scheme (Maulana Hali: 'Hayat-i-Javed', p.447, Lahore 1957).

It was, therefore, not the Hindu intriguers, as our historian would have us believe, who manoeuvred to keep the Muslims backward. On the contrary, it were the ulema who used to issue fatwa and submit petitions

Mohtasib (censor), both because of their intolerant orthodox views and also because they were the chief instruments of oppression and tyranny in the middle ages. Most of the rulers also followed, for political reasons, the code of life prescribed for them by the sufis and saints. Hence their patronage of Indian music, dances, devotional songs, 'dohas' and 'ghazals'. The ill-advised rulers who succumbed to the pressure of the orthodoxy failed miserably as rulers and did great harm to the development of our culture.

MODERNISTS VS TRADITIONALISTS

As the impact of Western knowledge and education grew, following the rise of British rule in India, the conflict between the modernists and the traditionalists became more and more acute. British rulers, in the beginning, did not interfere with our cultural traditions or the system of education practised in the madrasahs and pathshalas. As a matter of fact, some of them were genuinely interested in Oriental studies. Warren Hastings, the first Governor-General of British possessions in India, encouraged the revival of Oriental learning. He founded the Calcutta Madrasah in 1781. Sir William Jones, the great linguist, founded the Asiatic Society of Bengal in 1784. He also translated several Persian and Sanskrit classics into English. A Sanskrit college was established at Benares in 1794. Sir Charles Wilkins, another admirer of the East, produced, with great ingenuity, Urdu, Hindi and Bengali types. (Early Urdu books that were prepared at the Fort William College, Calcutta, were printed in the Nastaliq type).

It was only in 1813 that the British Parliament, while renewing the East India Company's Charter, directed that "efforts should be made for the introduction and promotion of knowledge of the sciences among the inhabitants of British territories in India". But the authorities in Calcutta did not take much notice of these directives. The administrative policy of the Company was still controlled by the Orientalists.

OPPOSITION

However, British missionaries and editors of English newspapers in Calcutta were strongly opposed to the Company's Orientalist policy which, in their opinion, was hampering the progress of their "civilizing mission". They were clamouring for the adoption of English as court language and called upon the Company to open English schools in their territory. Disregarding the Company's policy, the missionaries had already opened their own English schools in Calcutta and at other places in Bengal, Bombay and Madras. In these schools, students were taught natural and social sciences besides English literature. When Agra and Delhi were conquered in

THE BATTLE OF IDEAS IN MODERN URDU LITERATURE

— *By S. Sibte Hasan*

"Why, this dispute about reality is a sort of Battle of Gods and Giants. One side drags everything down to earth, literally laying hands on rocks and trees, arguing that only what can be felt and touched is real, defining reality as body, and if anyone says that something without body is real, they treat him with contempt and will not listen to another word . . . Yes, they are clever fellows : I've met a lot of them . . . So their opponents in the heights of the unseen defend their position with great skill, maintaining forcibly that true existence consists in certain intelligible, incorporated forms, describing the so-called truth of becoming, not reality at all, and smashing their so-called bodies to pieces. On this issue there is a terrific battle always going on". (Plato: Sophist)

The Battle of ideas did not begin or end with the great Athenian. It still goes on because clash of ideas is inevitable in class-ridden societies. Ideas that represent interests of the ruling classes or tend to perpetuate the status quo find favour with them and their supporters. They finally become the ruling ideas of the society. Dissenters from these ideas are considered a threat to the established order and are called heretics, traitors, and disruptionists. However, when new forces appear challenging and finally overthrowing the old social system, as happened in Europe after the French Revolution, a new set of ideas comes into prominence.

PRE-BRITISH INDIA

The battle of ideas, in pre-British India, was fought mainly between the humanists and the dogmatists. The humanists, both Hindu and Muslim, believed in the Unity of Existence (Wahdatul Wajood) and Emanation of God (Ishraqi). They denied all differences of caste, creed, language and colour and stood for Brotherhood of Man. In their religion, even the lowest of the low was worthy of respect and love. Urdu poets, since the days of Kabir and Amir Khusrau, have always been most vocal spokesmen of humanists values of life. They have consistently condemned and ridiculed the Mullah, the Shaikh, the Zahid, the Qazi, the Mufti, the Faqih and the

14. Abdul Baki, *ibid.*, p.473.
 15. Mehmed Onder, *Mevlana Siir Antolojisi*, Ajanstürk, p.42.
 16. Esrar Dede, *Tezkire-i Shurayi Mevleviye*, Suleyaniye Library No.109 (Halet Ef.) Istanbul.
 17. Mehmed Onder, *ibid.*, p.46.
 18. Suleyman Nahifi, Bulak Press, Egypt 1268 H.
 19. Iskender Sefikoglu, *Mevlana in the Works of Turkish poets living in Yugoslavlia*, I.International Magazine of Suljuk University, 1987 p.258.
 20. Dr.Ahmed Alkan, *Mevlevilik ve Mevlana Kullesinin Konya Schirsel Gelismeleri*, I.International Magazine of S.U. p.208.
 21. Prof.Dr.Mehmedcavusoglu, *Yenisehirli Avni Bey*, *ibid.*, p.132.
-

In the end I will like to recite the verse of another Turkish poet Avni Bey²¹ who uttered the following lines for Rumi's shrine :

*Sahasında rusena kendiller mi berk uran,
Ya nucum-i anıman-i alem-i mana midir?
Ses cihetden rız u seb kerrubiyân eyler tavaf.
Mescid-i Akşa midir ya Kabe-i ulya midir?
(Are there the candles shining at his shrine?
Or they are the stars of the spiritual skies?
Day and night great angels visit the place from six sides,
Is it mescid-i Akşa or the glorious Kabbe itself?)*

Bibliography

1. Prof.Dr.Osman Turan, "Selcuklular ve Islamiyet", Nakislar Yayınevi, Istanbul 1980, p.39.
2. Prof.Dr.Huseyin Yurdaydin, "Islam Tarihi Dersleri", Ankara Universitesi Ilahiyat Fak., Yayin 1982, p.62.
3. Prof.Dr.Fuad Koprulu, "Turk Edebiyatında İlk Mutusavvıflar", Ankara 1976, p.169.
4. From the turkish word "Aqi" = "generous" or from Arabic "Akhi" = my brother, Prof.Dr.Neshet Chaghatay, "Ahilik", Seljuk University Press, Konya p.52.
5. Neshet, ibid., p.IV.
6. Dr.Mikail Bayram, "Anadolu Bacileri, Belleten 180 Turk Tarih Kurumu, Ankara.
7. Abdulbaki Golpinarli, "Mevlana'dan Sonra Mevlilik" Inkilap, Istanbul, p.260.
8. The word "edeb" has no direct English equivalent. Nicholson gives as "selfcontrol" but it actually means respect + modesty + fine manners.
9. Dr.Erkan Turkmen, "Turki key Sab se Pehle Sofi Shair Yunus Emre", Journal Khuda Bakhsh Library, Patna No.64, pp.327-333.
10. Yunus Emre, Risalat al-Nushiye, Eskisehir Turizm, 1965 s.XIV and p.176.
11. Nihat Sami, Turk Edebiyat Tarihi, MEB, Ankara p.380.
12. Prof.Dr.Fuad Koprulu, ibid., 339 and Prof.Gibb, A History of Ottoman poetry, London 1958, p.176 Sqq.
13. No reference has been given by the author (editor).

Turkish of Turkey. The following proverbs will be enough to prove it :

- I - "Bicak kemige dayanmak" = "knife came to the bone" i.e. "to come at the peak of patience or it cannot be endured any more"

باز مارا این نفس پسید کاروش تا استخوان مارسید

- II - "Vakitsiz oten horozun basi kesilir" - "A cock that crows untimely is slaughtered" said for a thing that is done before its proper time.

لاجرم هر مرغ بی هشگام را سر بریدن داجیت اسلام را

- III - "Gonulden gonule yol vardır" = "there is way from heart to heart" that is if you love someone he will love you, too.

از دل من تا دل تو روزن است

- IV - "Bir pire için yorgan yakmak" = "to burn a quilt for just a flea"

هر کیکی نو لیمی بوغن = "to burn a new rug for a flea" = to spoil a precious thing for a valueless thing".

Rumi's influence on the Turkish poets of the eastern Europe is also great.¹⁹

In the year 1926 all the Mevlevi tekkes, alongwith many others were banned, but Rumi's tomb remained open as museum. It is a museum for those who love physical forms and dergah for those who love the spiritual existence of Rumi. However, it is interesting to know that the people of Konya began to settle around the dergah which was once out of the main city, with the hope of getting some morsels of spiritual food and "lucky is the man who has a garden in Meram and a house in front of the shrine" became a proverb among them.²⁰ The old custom of visiting the tomb before setting out for the pilgrimage to Mecca is still in vogue. Today, more than 3000 people visit the place everyday and a few become perfect, as Molla Jami said :

کعبه عشاق باشد این مقام هر که ناقص آمد اینجا شد تمام

"This is the Kabbe of lovers and he who comes here as negative changes into positive".

VI - Kececiade Izzet Molla (1758-1829):

He was born at Istanbul and died at Sivas. He was a good friend of Sultan Murad the II. His feelings for Rumi are as follows :

*Gam basima dushmanur Ya Hazret-i Mevlana,
Gayret sana dushmanur Ya Hazret-i Mevlana,
Olduk gunaba taib, cik bendelere sahip,
Zilletde koma haib, Ya Hazret-i Mevlana,
Biz bendeleri yad et, Izzet kulunu sad-et,
Viraneyim abad et, Ya Hazret-i Mevlana.*

(I have fallen in grief, O' honourable Mevlana,
It is up to you now to help me, O' honourable Mevlana,
I am penitent for my sins, take care of your slave,
Don't leave me disappointed under any disgrace, O' honourable Mevlana,

Remember your slave and please your servant (Izzet),
Populate my deserted heart, O' honourable Mevlana).

VII - Yahya Kemal Beyatli (1884-1958):

One of the most famous Turkish poets of the latest era is Yahya Kemal. He worked as a teacher, ambassador and as a governor of Grand Assembly. He died in Istanbul.

*Mesnevi sevkini eflaka cikarmis nayiz,
Hasr dek hem nefes-i Hazret-i Mevlana 'yiz,
Seb-i lahutda manzum-i ecram gibi,
Lafz-i "Bisnev" le dogan debdebe-i manayiz.*

(We are the reed-flute (Ney) that has lifted the love of Mesnavi, upto the sky,

We are friend with honourable Rumi, until the last day,
Like the lined up stars of the Divinely nights,
We are awe of essence, born of the word heararken (Bishnav)

There are also some poets like Nahifi (1640-1739) who translated the Mesnevi into Turkish in verse.¹⁸

It is noticeable that there is some linguistic influence of Masnevi on the

*Alemi mana ki hursid-i cihan-ara gibl,
Devreder girmis sema'a anda ruh-i Mevlevi.¹⁵*
(Mesnevi's each verse gives world-wide knowledge,
one little mote of it is like the whole light of the sun,
The world of its meaning is like the world-illuminating sun,
The soul of Rumi keeps on whirling in his Masnevi).

V- Neshati (died in 1674) :

He was Sheykh of Edirne Mevlevkhana who takes place among the famous Ottoman poets. He is called "Ustad-i Ustadan-i Rum" = "The master of masters of Anatolia in the tezkiye of Esrar Dede :¹⁶

*Ask ehli odur ki bakmayip dunyaya,
Efzun ola sevk-i alem-i manaya,
Sevda-yi vatanla durmayip bir yerde,
Cun katre-i ebr, azm eyler deryaya.*
(The true lover is he who without looking at this world,
Has a greater desires for the other world,
He does not stay at a spot, though he loves his country,
Like a rain drop he struggles in order to reach the Sea).

VI- Sheykh Ghalib (1757-1798) :

He was born at Istanbul and is famous Ottoman poet. He was once a sheykh of Galata Mevlevikhana. Here are some lines that he wrote on Rumi :

*Mazhar-i ask-i Huda Hazrat-i Mevlana'dir,
Menba-yi sidk-u safa Hazret-i Mevlana'dir,
Seref-i zatiyla masuk-i gunah-i ervaḥ,
Gevher-i bahr-i vefa Hazret-i Mevlana'dir,
Evlya sirrina mirasiyle maliktir ol,
Mazhar ul'ulema Hazret-i Mevlana'dir.¹⁷*
(Greatly bestowed with Divine Love is Mevlana,
The source of piety and righteousness is Mevlana,
with his honourable being, he a beloved of sinful souls,
The pearl of the sea of loyalty is Mevlana,
By birth he knows the secrets known by prophets,
Beloved of all the learned men is respectable Mevlana).

Turkish poets, yet it will not be out of interest to give some poet's name and a brief introduction chronologically alongwith at least one verse as an example :

I - Ashik Pasha (1272-1333) :

He belonged to a Turkish family of Khorasan that came to Qirshehir where the poet received his education.¹¹ He wrote a masnevi like that of Rumi's called "Gharib Nama" (around 12,000 verses) :¹²

*Isbu mulk-i ask icun duzdi Calab,
Yir u gok olmakliga askdur sebab,
Yirde gokte zerre zerre ask kodi,
Anin icun doldi alem ask odi.*

(God created this world for sake of love,
He made the earth and the sky for His Love,
He placed then, mote by mote on earth His love,
That is why the whole world is filled with the fire of Love).¹³

II - Divane Mehmed Chelebi :

16th century Mevlevi poet. He belongs to Sultan Veled's daughter's family. At his time Mevleviye had spread upto Egypt and Algeria.

*Dedi bir dervise ol bir padsah,
Nedurur hirka vu hem basta kulah?
Dedi dervis ty seh-i ali tebar,
Hirka kabrimdir kulah seng-i mezar.*¹⁴

(A certain king asked a dervish,
Why do you wear a robe and a hat?
The dervish said, "O' the most noble king,
My robe is my shroud and my hat the tomb-stone).

III - Nef'i (1575-1635) :

He was born in Hasan Qale, a little town in the neighbourhood of Erzerum. He came to Istanbul and wrote qasidas for Sultan Ahmad and Sultan Murad IV. He was a great satirist. Following is a glimpse of his verses upon Rumi's Masnavi :

*Mesnevi amma ki her beyti cihan-i marifet,
Zerrestyle aftarinin beraber pertevi,*

"I wail and lament because wailings are pleasant to Him. He wants wailing and grief from the two worlds" (M I, 1774)

The tears of repentance will wash the glasses of our windows that open to the eternal Light of God.

VII - Try to be with God as much as possible :

.. مگر با هر ای چو بی همه ای در پی برای چون با منی با همه ای

"If you are with everyone, without me, you are with none,

If you are with me and with nobody, you are with everybody". (M III, 1613)

Once you attain the vicinity of God, you can never remain passive and dull. Because the Koran says: *کل يوم هو فی شأن* = "Everyday God shines with a new splendour (invention)".

It were these teachings of Rumi that became deeply rooted in the hearts of the Anatolian people, who later established a large Ottoman empire based on brotherhood and tolerance. Ottoman Turks and many of their kings remained attached to the Mevlevikhanas the Sheykhs of which gave spiritual energy to them.

In order to enliven the spirits of the Anatolian people, more than 200 Turkish poets and several musicians took part in spreading the essence of the masnevi, directly or indirectly. The first one is Rumi's contemporary great sufi poet Yunus Emre⁹ who feels proud to win his favour as he says :

Mevlana Hudavendgar bize nazar kilali,

Anun gorkli nazari gonlumuz aynasidir.

(Ever since Mevlana, our master, has shown his favour to us,
His magnificent eyes have been the mirror of our heart).

Bir kez gomul yikdunisa bu kildugun namaz degil,

*Yitmisiki millet dahi elin yuzin yumaz degil.*¹⁰

(In case you have broken someone's heart once,
Your prayers are not true prayers, not even like the 72 nations are then your hands and face neat).

It is beyond the scope of this paper to throw light upon the Mevlevi

"The wind of anger, the wind of lust and the wind of greed will take over those who do not offer their prayers to God" (M I, 3796)

- III - Sleep less in order to serve God and His mankind. Speak less in order to receive more messages from the Divine World, leaving your greedy partial intellect aside. Eat less to control your ego :

هون بخت بیدار بود جهان ما . هست بیداری چو در بندان ما

"When our soul is not awake to God, our wakefulness is like being in the prison" (M I, 410)

نان گشت دگشت کمتر خور این تا نمائی بچو گل اندر زمین

"Bread and meat are originally clay, eat little out of them, so that you may not stay under earth like clay" (M I, 2872)

- IV- Avoid the company of those who are not matured enough and have a negative character :

در نیاید حال پخته هیچ خام پس سخن کوتاه باید دالسلام

"Since an unmatured man is unable to perceive the state of a ripe man it is better to cut a long story short and say him "farewell" (M I, 18)

- V- In case you cannot control your ego and greedy selfhood, then go and find a perfect man or a lover of God to train you :

عقل تو همچون شتر بان تو شتر می کشاند هر طرف در محکم مر
عقل عقلت ادلیسا و عقلها بر مثال اشتران تا انتها

"You are like a camel and your sensual intellect is like a camel- driver which drives you to every direction with bitter words. The saints are intellect of intellect and upto the end they have control over other's intellects like camel-drivers". (M I, 2497-98)

- VI - Cry to God for His mercy and love :

تالم ایراناها خوشا آیدش از دد عالم ناله دغم بایدش

"O son, break away all the ties and be free, for how long will you be captive of gold and silver?" (M I, 19)

Rumi does not invite us to passiveness and poverty, he wants us to work for God and His beloved people. It is the intention that counts as Muhammad says "All deeds depend on intention", and we should avoid greed and try to be happy with what God has given to us.

Why did the "Mevleviye" succeed in the teeth of opposition of other sufi paths? is a question that should be replied here briefly. Mevleviye was formalised by Rumi's son Sultan Veled and his grandson Ulu Arif Chelebi. Since teachings of Rumi based on the Koran and Hadis, the Turkish people welcomed the path whole heartedly. It spread all over the Ottaman Empire leaving hardly any city or town out of its scope. The centres were called "Tekke" and the tomb of Rumi "Dergah", and the sub-branches were named as "Zaviye". The central Sheykh was called "Chelebi" who was supposed to represent Rumi and the followers were called "Mevlevi", in general sense "dervish". Rumi would never have desired any such establishments, for he invites all mankind around the love of God without any show. But as the mevleviye grew, centres were required to render spiritual service under a system. From the royalties down to a simple soldier all trusted the sheykhs and their spiritual hands. In some cases, pomp and show went to its peak and the Sheykhs lost their spiritual reverence.⁷

Here are some major points that covered the teachings of mevleviye which won the hearts of the Anatolian people :

- I - Respect and politeness "Edeb"⁸: First one should respect oneself (called by M.Iqbal as Khudi) and then the Creator and all his creatures. In order not to break anybody's heart, we should have fine and modest manners :

از خدا جویم توین ادب بی ادب عروم شد از لطف رب

"From God we should seek for His grace, so that He may give us fine manners because ill-mannered is deprived of God's mercy" (M I, 79)

For this, one needs to soften his heart in the crucible of Divine Love.

- II - Zikr and prayers should be practised repeatedly in order to lessen your lusty desires :

یادشم و باد شهوت باد آرز بردا دراکر نمود اهل نماز

piece of land ready to receive the mystic seeds of Islam that Rumi tried to sow in the light of the Koran. Study of pre-Islamic Turkish religious poetry shows that Turks had, always, their eyes in the sky and not on shapes or luxury of the earth. Rumi's teachings, too, invite us beyond the world of shapes and time. As he says :

گر صورت بگذرید ای دوستان. جنت دگستان در گستان

"If you, my friends, pass beyond forms, there is a paradise and rose-gardens within rose-gardens" (M III, 577)

صورت سرکش گدازان کن برنج. تا بسینی زیراد و دعت چو گنج

"By means of grief melt the obstinate forms, so that you may see the Unity that lies under it, like treasures" (M I, 683)

This idea brought Rumi face to face with other two strong muslim groups of Anatolia

a) The fanatic muslim group

b) The Muslim Brother Group called "Ahi"⁴. The fanatic group refused anything beyond the surfacial meanings of the Koran and Hadis. They disapproved of music and the dervish dance "Sema" and even poetry which Rumi and his followers practised. Referring to these people Rumi says :

آتش این باغ نی دنیست باد. هر که این آتش ندارد نیست باد

"The sound of reed-flute is fire and not a simple blow of wind and he who has no such fire should stop to exist" (M I, 9)

In this group was also his friend Sheykh Sadrettin-i Konevi who loved Rumi but refused to join his group.

The Ahi establishment was based on the moral teachings called "futuvvet" + business and art. It was introduced by the great economist Ahi Evren Sheykh Nasrettin Ebu'l Mahmud bin Ahmed al-Khoyi (1171-1261)⁵ a distinguished disciple of Avha ud-Din-i Kermani (A.D.1238). Ahi Evren's wife Fatma Baji (Fatma Sister) established a group for women⁶, too. This group gave importance to the Turkish handicraft, business and art, while Rumi's group laid emphasis on the art of loving God.

بند بگل باشن آزاد ای پسر. چند باشی بند سیم د بند زر

INFLUENCE OF RUMI'S THOUGHT ON THE RELIGIOUS, SOCIAL AND LITERARY LIFE OF THE TURKS OF TURKEY

By Dr.Erkan Turkmen

Two centuries before the arrival of Rumi's father to the capital of the Seljukian Empire of Anatolia, the dispersed Islamic states were not yet properly organised. These were the Anatolian Seljuks who reorganised the smaller Islamic states under one flag. Oghuz Turks, the ancestors of Seljuks and Turcomans (muslim Turks) had found Islam closer to their previous religion "Shamanism". For example, in Shamanism, as jihad in Islam, fighting and dying for God was thought to be rewarded by a better life after death. Moreover, the Turks also believed in one God.¹ Dance in the company of music was considered to be the part of worshipping God. It is, probably, due to this reason that there remained a custom among the Seljuk Sultans to have the military drums played five times a day and only three times for the minor rulers.²

When Rumi's father was at Balkh, three great Turkish empires were fighting and challenging each other in the Central Asia. In the west were the Great Seljuks; in the middle were Khuwarezmshahs and in the east were Ghaznavids. The Turko-Iranian elements got mixed up. Nevertheless, Turcomans kept some old pre-Islamic customs alive. Being free minded nomadic people, they obeyed their "babas" or "atas" and later they began to respect mevlevi "Chelebis" or "Dedes" in the same way. To them, Mevlevis were like old "Ozans" or "Bakhshies"³ who gave them spiritual support alongwith music reminding them of their old religion.

When Rumi came to Anatolia, he found two strong groups - Mu'tizile (the rationalist muslims) and Jebriye (the fatalist muslims), side by side. It is due to this reason that we find Rumi criticising the rationalists and the fatalists throughout the Mesnavi. Rumi obtained support of the educated Turkish community as well as of royalities. They turned to be a productive

— 4 —

1
2
3
4
5
6
7
8

3

 $\frac{1}{2}$

100

— 10 —

Islamic Libraries

The Library of Islamic College,
Peshawar

Prof.Mohsin Ehsan 209

Hand List of Manuscripts

Handlist of Manuscripts

Library of Poona 218

Reviews

Libraries of King of Audh

Dr. Wahajuddin Alavi 235

Tazkirah Bazme-Shimal – A Review

Dr. M.Kamaluddin 237

Ramayan Number of Nairang-i-Khayal

Abu Saadat Jalili 243

Urdu/Hindi/Hindustani

Sajjad Zahir and Urdu, Hindi,
Hindustani

Dr.A.Qayyum Abdali 2

Urdu Poetry

Equivocation

Dr.Manzar Azmi 3

Kamal Hamidi - Life and Selection
from his Poetry

Abdul Majid Khan
Kamal Hamidi 4

Nasim Amrohvi and his Elegies

S.Mahmood Hasan
Qaisar Amrohvi 5

Ghalib

Anjum Sheikhpurvi - A Desciple of
Ghalib

Dr.M.Rizwan Ahmad
Khan 8

Iqbal

Research of Iqbal and Azad on the
Theory of Evolution
Metaphors of Iqbal

Dr.Samiul Haq 9
Dr.Mansur Alam 10

Urdu Novel

Rashidatun-Nisa – The First
Lady Novelist

Adeeb Suhail 12

Urdu Journalism

Khwaja Ahmad Abbas – An Intellectual
Journalist

Dr.Nasim Akhtar 14

Femininism in Urdu Journalism: Few
Rare Folios of the 19th Century

Dr.Ofaira Hamid 15

Ionion Medicine (Tibb)

Problems relating to the History of
Medicine and Principles of Research

Prof.Hakim S.
Zillur Rahman 16

History of Hyderabad (Deccan)

Historical Existence of Bhagmati

Narendra Luthar 18

Manuscriptology

Muntakhabut-Tazkirah – An Assessment
Masnavi Qissah-i-Sudama

Dr.Rais Anwar 19
Prof.Talha Rizvi Barq 20

CONTENTS

Journal 106

English Section

Persian Literature

- Influence of Rumi's Thought on the
Religious, Social and Literary Life
of the Turks of Turkey Dr.Erkan Turkmen 1

Urdu Literature

- The Battle of Ideas in Modern
Urdu Literature S.Sibte Hasan 12

Manuscriptology

- Timurid Manuscripts of Artistic and
Historical Value in Indian Collections Prof.Nazir Ahmad 36

History - Bihar

- Contemporary Indian Critique of the
Company's Early Revenue
Arrangements in Bihar, 1765 - 1784 Zahiruddin Malik 77

Sikhism

- Martyrdom of Guru Tegh Bahadur Dr. Ved Parakash 96

Urdu/Persian Section

- Foreword H.R. Chighani

Indic Religions

- A Great Memorial of 19th Century:
Swami Shagun Chandra and his
Session on Relegions - Life and Works Asim Jamali 1

Intellectual Thinking in Urdu

- Intellectual Thinking of Dr. Abid Husain
in building up a National Culture Dr.M.Kamaluddin 19

Reg. No. 33424/77
Vol. No. 106
Quarterly Journal

Price Per Issue Rs.75/-
Annual Subscription: Rs.300/-
Asian \$ 60, Other Countries \$ 120

1996

KHUDA BAKHSH LIBRARY JOURNAL

106

Editor
H. R. Chighani

***KHUDA BAKHSH ORIENTAL PUBLIC LIBRARY
PATNA***

